آخری گناہ کی مہلت

طارق اسماعیل ساگر

Scanned & PDF By: Qamar Abbas
Email:qamarabbas277@gmail.com

آخری گناہ کی مہلت

نیاز علی سے زیادہ نیاز مند اور سیدھا سادا بندہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ عمر تو اس کی پچاس سے اوپر ہی ہو گی۔ مگر صحت ایسی کہ جوان دیکھ کر شرماتے تھے۔ اُسے اس گاؤں میں آئے پانچ چھ سال ہی گزرے تھے لیکن اپنے اخلاق اور خدا ترس طبیعت کے سبب گاؤں کے بچے بڑے سب ہی نیاز علی کے گرویدہ تھے۔ اپنے گھر ہی کے ایک کونے میں اُس نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ ہفتے میں ایک دن وہ شہر جاتا اور دکان کے لیے سامان لے آتا۔

اس کی ایمان داری تھی یا پھر ملنسار طبیعت کہ دیکھتے ہی دیکھتے نزدیک و دُور کے دیہاتوں میں اس کی دکان نے خاصی شہرت پالی تھی۔ لوگ قریبی دیہاتوں سے "نیاز دی ہٹی" پر سامان لینے آیا کرتے نیاز نے منافع ہی اتنا کم رکھا تھا کہ کوئی اور اتنے کم منافع پر دکان چلا ہی نہ سکتا۔

شاید اس کا سبب اس کا اکیلا ہونا رہا ہو!

نیاز کا کوئی خاندان، گھر بار، مائی باپ، بیوی بچے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کسی نے کبھی جاننے کی کوشش کی تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ لوگ اس کے متعلق خود ہی اندازہ قائم کر لیتے۔ کوئی کہتا اس کی منگیتر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کی بے وفائی کا اثر نیاز نے اتنی شدت سے قبول کیا کہ دوبارہ کبھی عورت کے نزدیک نہ پھٹکا۔ کوئی اس کی بیوی کے مر جانے کی کہانی سُناتا۔ حقیقت کیا تھی؟ اس کا علم

نیاز علی کو تھا یا پھر خدا کی ذات کو۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے اس کی ذات میں دل چسپی لینا ہی چھوڑ دی۔ اس مرتبہ جب وہ شہر گیا تو پانچ چھ روز کے بعد واپس لوٹا۔ گاؤں بھر میں پھر چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن نیاز نے اپنے گاہکوں کو بتایا کہ وہ دراصل دمڑی شاہ کے عرس پر چلا گیا تھا۔ اُس نے کوئی منت مان رکھی تھی جسے پوری کرنا چاہتا تھا۔

شہر سے واپس لوٹے اُسے دوسرا دن تھا۔ جب لوگوں نے پہلی مرتبہ پولیس کا ایک ٹرک اور ایک جیپ اس طرف آتے دیکھی۔ اس سے پہلے گاؤں میں اوّل تو پولیس آتی ہی نہیں تھی۔ اگر تھانے دلوں کو کوئی شخص مطلوب ہوتا تو نمبردار کو اطلاع بھیج دی جاتی اور پولیس کے دو تین سپاہی اس کے ڈیرے پر آکر متعلقہ شخص کو تھانے لے جاتے۔

اتنی تعداد میں پولیس کو دیکھ کر گاؤں والے دہشت زدہ ہو گئے۔ نمبردار جو کسی کام سے کچہری جا رہا تھا۔ سہم کر رُک گیا۔ جیپ اس کے مکان کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جب کہ ٹرک سے اُترنے والے پولیس کے جوانوں نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" نمبردار نے ہمت کر کے انسپکٹر سے دریافت کیا۔

"نبی خان مجھے افسوس ہے آج اس گاؤں کی پرانی ریت ٹوٹ رہی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ ہمیں ایک خطرناک مفرور قاتل کو گرفتار کرنا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"نیاز علی" انسپکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟" نمبردار کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہاں!" انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن ایک بات خیال رکھنا کہ پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش پر میرا دماغ خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

کسی اور موقعے پر اگر تھانیدار اس لہجے میں بات کرتا تو نبی خان اس کی تسلی کروا کر ہی واپس لوٹتا تا وہ کوئی ایسا گرا پڑا نمبردار نہیں تھا۔ سو ڈیڑھ سو مربع زمین کا مالک تھا اور نمبرداری بھی پشت در پشت اُن کے خاندان کو منتقل ہوتی آ رہی تھی۔ لیکن پولیس کی تعداد اور انسپکٹر کے رویے نے اسے خاموش رہنے ہی کو مصلحت جاننے پر مجبور کر دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" غصّے سے کھولتے ہوئے نمبردار نے انسپکٹر سے کہا۔

دونوں پانچ مسلح سپاہیوں کے ساتھ نیاز علی کی دکان پر پہنچے۔ نیاز علی نے پولیس کو اس طرف آتے دیکھ کر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ سب لوگ دکان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"اتنا جلوس ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی تھانیدار!" نیاز علی نے کہا۔ "مَیں آج شام تک خود ہی پیش ہو جاتا۔ کیونکہ میرا کام اب ختم ہو گیا ہے۔ پولیس کبھی میری گرد کو بھی نہ چھو سکتی۔ تم جانتے ہو میں پولیس کے اس جلوس سے ڈرنے والا نہیں لیکن میں اب خون خرابہ نہیں چاہتا۔"

نیاز علی کے سامنے انسپکٹر یوں سر جھکائے کھڑا تھا۔ جیسے وہ خود مجرم ہو۔

"نمبردار صاحب! اس گاؤں میں پولیس آنے کا مجھے افسوس ہے لیکن سب لوگ جانتے ہیں۔ مَیں نے یہاں کیسی زندگی گزاری ہے۔ مَیں اس کھیل کو آج شام کو ختم کر دیتا۔ لیکن یہ لوگ کارگزاری دکھانے کے شوق میں صبح ہی کو چلے آئے۔ بہرحال مجھے افسوس ہے اور مَیں آپ سے اور سارے گاؤں سے معافی چاہتا ہوں۔" اس نے نمبردار نبی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نیاز علی تم..." نمبردار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا

"نہیں نمبردار صاحب! یہ میرا آخری بہروپ تھا۔ میرا نام بہاول خان ہے۔ باقی سب کچھ آپ کو پولیس والے بتا دیں گے۔"

اتنے میں گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ نیاز علی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میاں جی میرا مکان اور دکان آپ کی ملکیت ہے۔ اگر زندہ رہا تو شاید واپس آجاؤں۔"

"ہم تلاشی لیں گے۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شوق سے" نیاز علی بولا۔

مولوی صاحب اور نمبردار ایک ٹک اُس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر کے اشارے پر پولیس کے ایک جوان نے نیاز علی کو ہتھکڑی پہنادی اور باقی لوگ اس کے مکان اور دکان کی تلاشی لینے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ خالی ہاتھ باہر آگئے۔ وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی جو پولیس کے لیے باعثِ دلچسپی ہوتی۔

گاؤں کے لوگ اب وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ نیاز علی دراصل مفرور بہاول خان ہے۔ وہ لوگ اسے اب بھی بے گناہ اور وہی سیدھا سادا دکاندار ہی جان رہے تھے۔

"بہاول خان میں تمہیں پیر چنن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد نیاز علی پولیس کی معیت میں گاؤں سے چلا گیا۔

میں اس واقعے کے اگلے روز گاؤں پہنچا۔

میں اس گاؤں کا رہنے والا تو نہیں تھا۔ لیکن یہاں ہماری کچھ زمین تھی جس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کبھی کبھی یہاں آجاتا۔ میری نیاز علی سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی اور اس کا سبب وہ لوک داستانیں تھیں جو وہ مجھے اکثر رات گئے تک سُنایا کرتا۔ نیاز علی نے مجھے ہمیشہ بیٹوں کی طرح جانا۔ ایک آدھ مرتبہ وہ ہمارے شہر والے گھر میں بھی آیا تھا۔ میرے والد صاحب جو اکثر بیمار رہتے تھے۔ اس سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ مجھے کئی دفعہ دوبارہ ملاقات کے لیے کہہ چکے تھے۔

گاؤں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ نیاز علی تو ایک مفرور قاتل تھا۔ جسے پولیس چنن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ہے تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ یہاں کوئی بھی اُسے قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔

میں جب بھی گاؤں آتا۔ دو تین روز گزار کر ہی جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے ایک رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ اگلے ہی روز میں مولوی صاحب کو مل کر رخصت ہو گیا۔ وقتِ رخصت مولوی صاحب نے پُرزور تقاضا کیا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو اُس سے ملاقات کر کے اصلیت جاننے کی کوشش کروں۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ سب نیاز علی کے لیے آخری حد تک قانون کی جنگ لڑیں گے۔

مولوی صاحب سے چونکہ اُس کی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے اِن کا یہ اصرار رہا کہ میں پولیس ریمانڈ کے دوران ہی اُس سے ملاقات کروں۔

میرے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے اور مولوی صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنے سابقہ اثر و رسوخ سے کام لے کر میری اور نیاز علی کی ملاقات کا اہتمام کروا دیں گے۔ وہ نہ بھی کہتے تو بھی میں نیاز علی سے ضرور ملتا۔

میں انہیں مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ اتنی جلدی گاؤں سے واپس لوٹنے پر والد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا تو میں نے انہیں تازہ واقعے سے آگاہ کر دیا۔

والد صاحب نے اپنے ذہن پر زور دے کر بتایا کہ بہاول خان نامی ایک شخص واقعی مفرور رہا ہے۔ اُس کا نام انہوں نے کسی تھانے میں سُنا تھا۔ لیکن اُس کی کوئی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُسے پہچانتے نہیں ہیں۔

میں نے کہا اوّل تو وہ کوئی اشتہاری نہیں۔ اگر ہے تو ضرور اس کا کوئی سبب ہو گا۔

میرے باپ نے

گاؤں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ نیاز علی تو ایک مفرور قاتل تھا۔ جسے پولیس چنن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ہے تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ یہاں کوئی بھی اُسے قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان لوگوں میں مَیں بھی شامل ہوں۔

مَیں جب بھی گاؤں آتا۔ دو تین روز گزار کر ہی جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے ایک رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ اگلے ہی روز مَیں مولوی صاحب کو مل کر رخصت ہو گیا۔ دمِ رخصت مولوی صاحب نے پُرزور تقاضا کیا کہ مَیں جتنی جلدی ممکن ہو اُس سے ملاقات کر کے اصلیت جاننے کی کوشش کروں۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ سب نیاز علی کے لیے آخری حد تک قانون کی جنگ لڑیں گے۔

مولوی صاحب سے چونکہ اُس کی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے ان کا یہ اصرار رہا کہ میں پولیس ریمانڈ کے دوران ہی اُس سے ملاقات کروں۔

میرے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے اور مولوی صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنے سابقہ اثر و رسوخ سے کام لے کر میری اور نیاز علی کی ملاقات کا اہتمام کروا دیں گے۔ وہ نہ بھی کہتے تو بھی مَیں نیاز علی سے ضرور ملتا۔

مَیں انہیں مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ اتنی جلدی گاؤں سے واپس لوٹنے پر والد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا تو مَیں نے انہیں تازہ واقعے سے آگاہ کر دیا۔

والد صاحب نے اپنے ذہن پر زور دے کر بتایا کہ بہادل خان نامی ایک شخص واقعی مفرور رہا ہے۔ اُس کا نام انہوں نے کسی تھانے میں سُنا تھا۔ لیکن اُس کی کوئی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُسے پہچانتے نہیں ہیں۔

میں نے کہا اوّل تو وہ کوئی اشتہاری نہیں۔ اگر ہے تو ضرور اس کا کوئی سبب ہو گا۔

جو مَیں ضرور جان کر رہوں گا۔

والد صاحب نے پولیس والوں کی طرح پہلے تو مجھے ایسے اشتہاری سے دُور رہنے کی نصیحت کی لیکن بالآخر میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ دوران ریمانڈ انہوں نے مجھے نیاز سے ملنے کی اجازت نہ دی۔ جب اس کا پولیس ریمانڈ ختم ہو گیا اور اسے جیل بھیج دیا گیا تو مَیں اس سے ملاقات کرنے چلا گیا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ والد صاحب کا کوئی دوست تھا۔ اُس نے مجھے خصوصی ملاقات کی اجازت دے دی۔ مَیں جب جیل کی کوٹھڑی میں اس سے ملنے پہنچا تو اچانک مجھے وہاں دیکھ کر نیاز علی حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم یہاں؟" — نیاز علی نے کہا۔ "بیٹا! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا یہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان آئیں۔"

"یہ نہ کہو چاچا نیاز علی: تم جہاں بھی ہوتے میں تمہیں وہاں ضرور ملنے آتا۔"

ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ واقعی وہی بہادل خان اشتہاری ہے جس کے کارناموں سے پولیس کے فائل بھرے پڑے ہیں۔

"ہاں بیٹا: مَیں ہوں تو وہی بہادل خان لیکن جو کچھ پولیس کی فائلوں میں میرے متعلق لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ شاید وہ اپنا کھویا ہوا ماضی تلاش کر رہا تھا۔ پھر اُس نے مجھے اپنی کہانی بھی سُنا دی جو میں اسی کی زبانی آپ کو سُنا دیتا ہوں۔

میرا نام بہادل خان ہے۔ ایک پسماندہ علاقے سے میرا تعلق ہے۔ میرا باپ اپنے زمانے کا نامانا ہٹوا ڈکیٹ تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے ہم بھارت کی طرف ایک سرحدی علاقے میں رہتے تھے اور پاکستان کے قیام پر اُدھر بھی سرحد پر ہی ایک اور گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ تب میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ لیکن شاید ہوش سنبھالنے پر ہی

میرے باپ نے مجھے اپنے فن میں تاک کرنا شروع کر دیا تھا۔

نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ میرا باپ بڑا اصول پرست ڈاکو تھا۔ اس نے انگریزوں کی قید کاٹی تھی۔ مجھے کہنے لگا بیٹا! اُدھر لوگ پہلے ہی لُٹ لُٹا کر آئے ہیں۔ ان بے چاروں کو اور کیا لوٹنا۔ اب اُدھر سے ہی مال لایا کریں گے۔ میں یہاں آپ کو بتا دوں کہ میرا باپ جانوروں کی چوری میں استاد مانا جاتا تھا۔ اس نے کبھی معمولی جانور کو ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس زمانے میں سینکڑوں روپے سے کم کی گھوڑی نہیں کھولتا تھا۔ میرے والد کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ کھوجی اُس کا "کھُرا" نہیں اٹھاتے تھے۔ اوّل تو وہ اپنا کھُرا انہیں چھوڑتا تھا اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کوئی کھوجی اپنے گاؤں کی حد سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ عموماً وہ لوگوں کو گمراہ کر کے "کھُرا" اُٹھاتے ہوئے پکے راستے تک آجاتے پھر کہہ دیتے کہ اس سے آگے نشان نہیں ملتا۔

ہم نے سرحد پار چوریاں شروع کیں اور جلد ہی میرے باپ کا نام اِدھر اُدھر دونوں طرف گونجنے لگا۔ ہم باپ بیٹا چاند کی ڈھلتی راتوں میں سرحد عبور کرتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا اُدھر لے آتے۔ ان دنوں گائے بھینسوں کی چوری عام تھی۔

پولیس والے متعدد مرتبہ میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے۔ لیکن اُس نے جیتے جی کبھی کوئی چوری نہیں دی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری عمر بمشکل پندرہ سولہ برس تھی۔ جب پہلی مرتبہ پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ میرے باپ نے مجھے کہا:

"بیٹا: تو پہلی تفتیش پر جا رہا ہے۔ مرد بن کر حالات کا مقابلہ کرنا۔ پولیس کو بتا دینا کہ تو بہرام خان کا بیٹا ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "چاچا! میرے جیتے جی تجھے کوئی طعنہ نہیں دے گا۔"

"میرا پندرہ دن کا ریمانڈ تھا۔ پہلا ریمانڈ، پہلی تفتیش۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی پولیس والے شکاری کتوں کی طرح مجھ پر پل پڑے، لیکن پہلی "پھینٹی" سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کا واسطہ کسی ایرے غیرے سے نہیں بہرام خان کے

بیٹے بہادل خان سے ہے۔ انہوں نے مجھے پندرہ دن سُولی پر لٹکائے رکھا۔ دن رات میں تین تین چار چار مرتبہ مجھے تفتیش کے لیے لے جایا جاتا۔ کوئی ایسا غیر انسانی حربہ نہیں تھا جو پولیس نے مجھ پہ نہ آزمایا ہو۔

جب ریمانڈ ختم ہوا تو تھانیدار نے میری پیٹھ پہ تھپکی دے کر کہا۔ "واقعی تو بہرام خان کا بیٹا ہے"۔

پولیس والوں نے ایک ریمانڈ کے خاتمے پر جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے دوسرا ریمانڈ مانگا تو مجسٹریٹ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور پولیس کو شرم دلانے کے انداز میں کہا: "پندرہ سال کی عمر کے اس بچے سے اگر تم لوگ پندرہ دن میں کچھ برآمد نہیں کر سکے۔ تو پندرہ سال میں بھی کچھ برآمد نہیں کر سکو گے"۔

اُس نے میرا مزید ریمانڈ دینے سے انکار کر دیا اور جوڈیشل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔ جیل والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے مَیں کوئی بہت بڑا لیڈر ہوں۔ اس جیل کے در و دیوار کی میرے باپ سے اچھی خاصی آشنائی تھی۔ عدالت کے باہر میرا باپ میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اُس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا: "بیٹا تو نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ساری برادری کو تجھ پر مان ہے"۔

جیل میں پہلے ہی روز اُس نے ایک وکیل کے ساتھ میری ملاقات کرائی اور اگلے روز میری ضمانت ہو گئی۔ کیونکہ پولیس مجھ سے کچھ برآمد نہیں کر سکی تھی۔ ایک رات مَیں نے جیل کے ہسپتال میں بھی گزاری۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔

اب میرا نام بھی میرے باپ کے نام کے ساتھ گُونجنے لگا تھا۔ ادھر سے زیادہ ہماری شہرت سرحد کے اُس طرف تھی۔ بھارت کے سرحدی علاقے میں جہاں ہمارا قیام تھا۔ دیہاتوں کا بچہ بچہ ہمیں جاننے لگا تھا۔

میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی۔ بس میں تھا یا باپ ہم نے اپنے گاؤں میں اچھی خاصی زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ پیداوار کوئی خاص نہیں ہوتی تھی یعنی نام کی ہی زمین تھی۔ لیکن بظاہر ہمارا یہی ذریعہ آمدن تھا جو سرکار کے کاغذات میں درج

تھا۔ زمین ہم بٹائی پر دیئے رکھتے۔ گھر میں دو تین ملازم رکھے ہوئے تھے۔ بس یہی ہماری کل کائنات تھی۔ ایک بات ضرور تھی کہ ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی بیوہ عورت نہیں تھی۔ جس کی میرا باپ مدد نہ کرتا ہو۔ اُس نے درجنوں لڑکیوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں کی تھیں۔

عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اُس کے اقتدار کا سورج بلند ہو رہا تھا۔ میں اب بیس بائیس سال کا گھبرو جوان تھا اور ہمارے علاقے کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور سرکاری افسران ہماری مٹھی میں تھے۔ الیکشن کے زمانے میں ہمارے گھر پر لمبی لمبی کاریں اور جیپیں آ کر کھڑی رہتی تھیں۔ ہمارے نزدیک دیہاتوں میں میرے والد کی مرضی کے بغیر کوئی ووٹ نہیں ڈالتا تھا۔ اس کا سبب اُس کا خوف نہیں بلکہ خدا ترسی تھی۔

وقت نے پلٹا کھایا اور میرے باپ کو موجودہ کام پہلے سے بہتر نظر آنے لگا ہم نے اپنے ملک میں چوری کبھی نہیں کی تھی۔ سرحد پار سے مال لایا کرتے تھے۔ باڈر پر سختی شروع ہو گئی۔ ہمارے تین چار مقابلے دو تین مہینوں میں ہو چکے تھے —— خطرات اب بہت بڑھ گئے تھے۔

شاید قدرت نے والد کو کسی ہندو کی گولی سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا تھا کہ اچانک الیکشن آ گئے۔ یہ الیکشن طویل مارشل لاء کے بعد آئے تھے۔ ہمارے علاقے کی ایک ممتاز شخصیت نے والد سے رابطہ کر کے درخواست کی کہ ہم اس کے لیے کام کریں۔ بطور پیشگی اُس نے نوٹوں کا بریف کیس ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں، کے مصداق ہمیں یہ کام زیادہ آسان لگا۔ ایک جیپ مل گئی تھی۔ مَیں اس جیپ پہ اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ نوابوں کی طرح گھومتا اور اپنے اُمیدوار کے لیے کنوینسنگ کرتا رہتا۔ دو تین روز کے وقفے سے نوٹوں کے بنڈل ہمارے پاس پہنچ جاتے۔

چنن شاہ سے میرا تعارف یہیں ہوا۔ وہ ہمارے ممبر کا خاص آدمی اور اپنے

علاقے کا مانا ہوا غنڈہ تھا۔ چنن شاہ جس قسم کے جرائم کرتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ وہ دس جماعت پاس تھا اور میں نے خدا جانے پانچویں تک بھی تعلیم کیسے حاصل کر لی تھی۔ چنن شاہ کو خاص طور سے ہمارے ساتھ کر دیا گیا۔ جس اُمیدوار کے حق میں ہم انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ وہ پہلی بار اسمبلی کا انتخاب لڑ رہا تھا۔ بندہ دولت مند تھا اور جس کے خلاف وہ لڑ رہا تھا وہ اس علاقے کا پرانا ممبر اسمبلی اور مانا ہوا غنڈہ تھا۔

انتخابات ہوئے۔ دونوں طرف سے دھاندلیاں کی گئیں۔ ہمارا پلڑہ بھاری رہا اور ہمارا امیدوار جیت گیا۔ مخالف اُمیدوار کی یہ پشتینی سیٹ تھی۔ اس کی ہار اس کے لیے ہی نہیں، بلکہ اس سارے علاقے کے لیے چونکا دینے والی تھی۔ ہمارے اُمیدوار نے جیت کی خوشی میں جلوس نکالا اور مخالف کے گھر کے سامنے فائرنگ کی گئی۔

ہارنے والے اُمیدوار نے فی الوقت خاموشی کو ہی مصلحت جانا لیکن وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ جس روز ہمارے ممبر اسمبلی نے حلف برداری کی تقریب میں جانا تھا۔ وہی دن مخالف نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے منتخب کر رکھا تھا فاتح ممبر اسمبلی، میرا والد اور دو باڈی گارڈ ایک جیپ میں تھے جبکہ دوسری کار میں اور لوگ بیٹھے تھے۔ جیسے ہی جیپ ان لوگوں کی گھات میں آئی۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرا باپ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ اسے ابھی ایک گولی ہی لگی تھی کہ اُس نے جیپ سے چھلانگ لگا دی اور دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ حملہ آوروں کو علم تھا کہ اگر بہرام خان زندہ بچ گیا تو ایک ایک کو چُن چُن کر مار ڈالے گا۔

مخالف کے للکارنے پر دو مسلح آدمیوں نے میرے والد کا تعاقب کیا اور جائے وقوعہ سے تقریباً ایک فرلانگ دُور میرے باپ کو گھیر لیا۔ نہتا اور زخمی ہونے کے باوجود میرے باپ نے بزدلی کی موت مرنے کے بجائے ان میں سے ایک پر

چھلانگ لگا دی۔ اُس کی گردن والد کے قابو میں آ گئی، لیکن دوسرے نے میرے باپ کے سر میں یکے بعد دیگرے پستول کی چھ گولیاں اتار کر اپنے ساتھی کو مرنے سے بچا لیا۔

اس حملے میں ممبر اسمبلی سمیت چار آدمی مارے گئے۔ باقی شدید زخمی ہوئے حملہ چونکہ طے شدہ منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا اور مخالف امیدوار دو روز پہلے ہی پولیس کی ملی بھگت سے ایک معمولی کیس میں جیل پہنچ چکا تھا۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ تین چار حملہ آوروں نے گرفتاری دے دی اور کیس چلنے لگا۔

میں نے اپنے باپ کی لاش قبر میں اتارتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ میں اُس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ میرے باپ نے مجھے تربیت دی تھی کہ چور ہمیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ میں نے اُس کی تربیت کا پہلا اُصول چنن شاہ پر اعتبار کر کے توڑا۔

چنن شاہ میرا دوست بن گیا۔ وہ بھی ہماری دنیا کا باشندہ تھا۔ لیکن کام ذرا الگ قسم کے کرتا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اُس کا بڑا دھندہ عورتوں کو ورغلا کر اغوا کرنا اور کسی دوسرے علاقے میں لے جا کر فروخت کر دینا تھا۔ لیکن اُس نے میری طبیعت کو جانتے ہوئے مجھے کبھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی اور یہی کہا کہ وہ سمگلنگ ہی کرتا ہے۔

جس شخص نے میرے باپ کو مارا تھا اُسے علم تھا کہ اس علاقے میں سوائے میرے کوئی اور اُس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے میری طرف دو تین مرتبہ صلح کا پیغام بھیجا اور منہ مانگی قیمت بھی اس صلح کی ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن میں نے اسے دھتکار دیا۔ کچھ عرصہ بعد الیکشن ہونے والے تھے اور مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔

چنن شاہ بڑا حرامی انسان تھا۔ وقت آنے پر وہ ہر روپ اپنانے کو تیار ہوتا میرے ساتھ وہ صرف اس لیے لگا تھا کہ میرے علاوہ اور کوئی اُسے مخالف کے انتقام سے

بچا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذریعے ہمیں نے جدید ہتھیار حاصل کیے تھے۔ چنن شاہ کی علاقہ غیر میں واقفیت تھی اور ہمارا پروگرام تھا کہ واردات کے بعد وہیں جا کر پناہ لیں گے۔

ایک روز وہ موقعہ آ ہی گیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ ضمنی انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ الیکشن مہم جاری تھی۔ ہمارا دشمن نزدیکی گاؤں میں جلسہ کر کے رات گئے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں اور چنن شاہ اس کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی شکار ہمارے جال میں پھنسا ہم نے اس پر جہنم کا دھانہ کھول دیا۔ اُس کے ساتھ باڈی گارڈز سے بھری ہوئی جیپ موجود تھی۔ لیکن میں نے ان لوگوں کے اوپر گرینیڈوں کی بارش کر دی تھی۔ یوں بھی کرائے کے گوریلے ایسے موقعے پر کہاں کام آتے ہیں۔ انہوں نے جان بچانے میں ہی عافیت جانی۔ امیدوار اور اس کے دو ساتھی مارے گئے۔ جب اُن کی موت کا یقین ہو گیا تو ہم نے راہِ فرار اختیار کی۔ بندوبست پہلے سے کیا ہُوا تھا۔ گھوڑیاں تیار تھیں۔ راستے کا انتخاب ہو چکا تھا۔ رقم اچھی خاصی میرے پاس تھی۔

دوسرے دن ہم محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہاں چنن شاہ کی واقفیت کام آئی اور ہم نے ڈیرے لگا لیے۔ تین ماہ تک ہم ان لوگوں کے مہمان رہے۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ بالآخر ہم نے اس علاقے کو خیرباد کہا اور اپنا روپ اور نام بدل کر دوسرے صوبے کی طرف نکل گئے۔

میرے باپ نے کم عمری میں ہی میرا رشتہ پھوپھی کے گھر طے کر دیا تھا جو ایک بڑے شہر میں رہتی تھی۔ ہم نے اُدھر کا رُخ کیا۔ ایک جگہ کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ پھر میں چنن شاہ کو بتائے بغیر ایک دن اپنی پھوپھی کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"پھوپھی گھبرانہ جانا۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میرے باپ کی شدید خواہش تھی کہ میری شادی صغراں سے ہو۔ میری پوزیشن تمہارے

سامنے ہے۔ اگر تم انکار کر دو گی تو بھی میں تمہارا فیصلہ قبول کروں گا۔ لیکن میں روزِ قیامت اپنے باپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔"

"تو میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے۔" پھوپھی نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہو یا بُرا۔ بیٹیوں کی قسمت کے فیصلے آسمانوں پر لکھے جاتے ہیں۔ صغراں تیری امانت ہے تو اُسے لے جا۔"

تیسرے روز ایک سادہ سی تقریب میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ چنن شاہ نے ہر کام میں سگے بھائیوں کی طرح بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ میری شادی ہوئی اور چنن شاہ کے مشورے پر ہم کراچی چلے آئے۔ کراچی لوگوں کا سمندر ہے۔ اس سمندر نے ہمیں بھی ہڑپ کر لیا۔ میں نے اپنا نام نیاز علی رکھ لیا تھا۔ اسی نام کا شناختی کارڈ بنا لیا تھا۔ یہیں ہم ایک مکان میں رہنے لگے۔ باہر والا کمرہ چنن شاہ کے پاس تھا۔ اندر دو کمرے ہمارے پاس تھے۔ زندگی گزرنے لگی۔

خزانوں کے تو کنوئیں بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ وہی ہُوا۔ دو تین مہینوں بعد پیسے ختم ہونے لگے۔ اس دوران صغراں مجھ پر مسلسل دباؤ ڈالتی رہی کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام کر لوں اور پرانی زندگی کو بھول جاؤں لیکن جو چسکا مجھے لگ گیا تھا۔ اُس نے مجھے کوئی "چھوٹا موٹا" کام نہ کرنے دیا۔ میں نے تو کبھی معمولی چوری نہیں کی تھی۔

چنن شاہ بڑا کائیاں آدمی تھا۔ وہ میرے حالات کا جائزہ لیتا رہا ایک روز کہنے لگا "بھائی صاحب کب تک زندگی یوں گزاریں گے۔ کوئی ہاتھ مارنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ میں تیار ہوں۔ لیکن شہر کے کام ہم لوگ نہیں جانتے ہم تو مردوں والے کام ہی کر سکتے ہیں۔ چنن شاہ نے کہا اچھا میں باہر نکلتا ہوں کوئی پرانی واقفیت نکل جائے پھر بات بنے گی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اُسے کہا۔

چنن شاہ چلا گیا۔ اُس کی واپسی تیسرے روز ہوئی۔ لیکن اکیلے نہیں ایک نوجوان لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

چنن شاہ نے مجھے آنکھ سے بیہودہ سا اشارہ کیا۔ مجھے طیش آگیا۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اُٹھ جائے وہ مجھے اشارہ کرتا باہر نکل گیا۔

"بہاول خان!" چنن شاہ نے کہا۔ "یہ تمہارا گاؤں نہیں۔ کراچی شہر ہے۔ ہم دونوں مفرور قاتل ہیں۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور میری بات غور سے سنو۔ زیادہ ہوشیاری دکھائی تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔"

مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو اتنا بے بس اور مجبور محسوس کیا تھا۔ خدا جانے صغراں سے شادی کے بعد میں کچھ بزدل سا کیوں ہو گیا تھا۔ مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور واپس آگیا۔ دوسرے دن چنن شاہ اس لڑکی کو لے گیا اور اگلے ہی روز واپس لوٹ آیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ اُس نے لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔

دو روز ہم ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ تیسرے دن اُس نے کہا۔ "بہاول! مَیں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے اور مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی یہ گھٹیا کام نہیں کروں گا۔" مَیں خوش ہو گیا۔

اس دوران صغراں ہماری باتیں چھُپ چھُپ کر سنتی رہتی تھی۔ اس نے مجھے متعدد مرتبہ کہا کہ مَیں چنن شاہ سے جان چھڑا لوں۔ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مَیں نے اُسے ایک ہی جواب دیا: "صغراں مَیں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

دو تین روز بعد چنن شاہ کہیں گیا اور واپس لوٹا تو بہت خوش تھا۔ کہنے لگا۔ "بہاول کام بن گیا۔ تمہاری مرضی کا کام ہے۔"

وہ اپنے کسی پرانے ساتھی کے ساتھ ڈاکے کا منصوبہ بنا آیا تھا۔ بڑی خطیر رقم ہاتھ لگنے والی تھی۔ منصوبہ کچھ یوں تھا کہ ہمیں حیدر آباد شہر میں ایک وین پر حملہ کر کے اس میں موجود بنک کرنسی پر قبضہ کرنا تھا۔ اس وین کا ڈرائیور ہمارا ہی ساتھی تھا جو ہماری مدد کرتا۔ منصوبے کے مطابق مجھے دو اور ساتھیوں کے ساتھ حملہ کرنا اور کرنسی والے تھیلوں پر قبضہ کرنا تھا۔ چنن شاہ کار لیے قریب موجود ہو گا۔ ہمیں اس کار میں بیٹھ کر فرار ہونا تھا۔

منصوبے کے مطابق صغراں سے دو روز بعد واپس لوٹنے کا بہانہ کر کے ہم چلے گئے۔ حیدر آباد میں اُس نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کروا دی۔

صبح ہم نے واردات کرنی تھی۔ رات کو ہوٹل کے ایک کمرے میں جہاں میں اس کا ساتھی قیام پذیر تھے۔ پولیس نے ریڈ کر دی۔ ہم دونوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ تھانے جا کر علم ہوا کہ ان کا تیسرا ساتھی جو پولیس کو پہلے ہی مطلوب تھا کہیں دوپہر کو گرفتار ہو گیا تھا اور اُس نے ڈاکہ مارنے کا اعتراف کر کے ہمیں گرفتار کروا دیا ہے۔ آج مجھے اپنے مرحوم باپ کی وہ بات شدت سے یاد آئی کہ چور ہمیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ یہ شہری لوگ تھے۔ پولیس نے دو دو چھتر مارے اور چالو ہو گئے۔ مَیں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں انہیں جانتا اور جس شخص کو میرے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ آج ہی میرا واقف بنا ہے۔ پولیس والے مجھے تین روز تک مارتے رہے۔ لیکن مجھ سے کیا اُگلوا لیتے۔

سات دن کا ریمانڈ تھا۔ اس دوران انہوں نے اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ مَیں نے پنجاب میں اپنی پھوپھی کے گھر کا پتہ لکھوا دیا۔ پھوپھی کو میرے سُسرال کے نام کا علم تھا۔ خدا جانے وہاں کوئی گیا یا نہیں۔ پولیس نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھ پر ان لوگوں نے آوارہ گردی کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ ضمانت کے لیے کسے کہتا۔ کراچی خط لکھتے ڈرتا تھا۔ ایک فکر یہ بھی کھائے جا رہی تھی کہ صغراں کا کیا بنے گا۔ پھر دل کو تسلی دے لیتا کہ چنن شاہ وہاں ہے۔

چھ ماہ بعد مجھے جیل سے رہائی ملی۔ مانگ تانگ کر کراچی پہنچا تو صغراں اور چنن شاہ کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ خدا جانے دونوں کہاں غائب ہو گئے۔ ہمسایوں نے بتایا کہ چنن شاہ انہیں پنجاب کا کہہ گیا ہے۔ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ مَیں نے تالا توڑ کر اندر دیکھا۔ گھر کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔

"یا اللہ دونوں کہاں گئے؟"

بڑی مشکل سے کرایہ اکٹھا کیا اور مَیں پنجاب پہنچ گیا۔ پھوپھی کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ صغراں یہاں نہیں آئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ چنن شاہ کی

کارستانی ہے۔ مَیں نے پھوپھی سے کچھ پیسے لیے اور وہاں سے چل دیا۔ حُلیہ بالکل بدل گیا تھا اور اب مَیں بآسانی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس دوران گلی گلی کوچہ کوچے مَیں نے دونوں کو تلاش کیا۔ لیکن کوئی نشان نہ ملا۔

مَیں درندہ بن گیا!

اب میرے لیے جرم کی کوئی تخصیص نہیں رہ گئی تھی۔ صرف ایک کام کیا کہ ہر واردات اکیلے کی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں بھٹکتا رہا۔ پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران ملک کے کونے کونے میں جرائم پیشہ لوگ میرے واقف بن چکے تھے۔ میرا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آج اُس شہر میں ہوتا تو کل کسی دوسرے شہر میں۔

ایک مرتبہ اسی طرح میں ایک شہر کے بازارِ حسن سے گزر رہا تھا۔ جب ایک دلال مجھ سے ٹکرا گیا۔ میرے لیے اب یہ دنیا اجنبی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک کوٹھے پر لے گیا۔ جہاں زندگی کا سب سے زیادہ وحشتناک منظر میرا منتظر تھا۔ میرے سامنے بہت سی لڑکیاں تھیں۔ جن میں صغراں بھی تھی۔

صغراں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مَیں اُس کی طرف بڑھا تو وہ دیوانہ وار ایک طرف بھاگی۔ مَیں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"صغراں تم یہاں؟" میرے مُنہ سے بمشکل نکلا۔

"بہادل خدا کے لیے میرا نام نہ پکارو۔ مجھے نہ چھوڑو۔ مَیں مر چکی ہوں" خدا جانے وہ کیا کیا کہتی رہی۔ ہم دونوں ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ دلال مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میرے اصرار کرنے پر صغراں نے رو رو کر مجھے بتایا کہ چنن شاہ نے اُسے میری موت کی خبر دی تھی اور بتایا کہ مَیں حیدر آباد کسی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوں اور اب پولیس یہاں ریڈ کرنے والی ہے۔ وہ مجھے گھر لے جانے کے بہانے کار میں بٹھا کر لے گیا اور کراچی میں ہی اپنے ایک اڈے پر پہنچا دیا۔ جہاں مجھے علم ہوا کہ وہ تو عورتوں کا پرانا

دلال ہے۔ اور ایک عرصے سے عورتوں کو اغوا کر کے فروخت کرنے کا دھندہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد صغراں کی کہانی ان بدنصیب لڑکیوں سے ملتی جلتی تھی، جو بالآخر ظلم و تشدد کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے ایسے اڈوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ صغراں نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے تین مرتبہ خودکشی کی ہے لیکن یہ لوگ اُسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

"صغراں میرے ساتھ چلو۔" مَیں نے اُسے کہا۔

پہلے تو وہ نہ نہ کرتی رہی۔ بالآخر اُس نے کہا: "بہادل یہاں صرف بہادری سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔ تم کل دوپہر کو فلاں جگہ پر آجانا۔ مَیں وہاں ایک ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے کے بہانے جاتی ہوں۔ وہاں سے ہم نکل جائیں گے۔"

مَیں بادلِ نخواستہ واپس آگیا۔

رات مَیں نے کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ اگلے روز میں طے شدہ منصوبے کے مطابق اس جگہ پہنچ گیا لیکن صغراں کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ شام تک مَیں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بیقرار ہو کر اُسی اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ صغراں نے رات کو ہی خواب آور گولیوں کی ساری شیشی نگل کر خودکشی کر لی تھی۔ اُس کی لاش لاوارث سمجھ کر کمیٹی والے لے گئے ہیں۔ اس خبر نے مجھ پر بجلی گرا دی۔ مجھے سمجھ آگئی کہ اس حالت میں صغراں کبھی میرے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مَیں ان لوگوں کو چُن چُن کر ماروں جنہوں نے میری صغراں کو اور مجھے جیتے جی مار ڈالا تھا۔

مَیں اس مشن کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے دوران میں نے دس قتل کیے۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح صغراں کی بربادی میں حصّہ لیا تھا۔ چنن شاہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مَیں اُسے تلاش کرتا رہا۔

پولیس میرے پیچھے پیچھے اور مَیں اُس کے آگے آگے بھاگا پھر رہا تھا۔ مَیں نے اب

جرائم سے توبہ کر کے دکان کھول لی تھی۔ بس ایک آخری گناہ کی مہلت کے لیے خدا سے دُعا مانگتا کہ کسی طرح چنن شاہ مل جائے اور اس مردُود سے دُنیا کو پاک کروں۔ مَیں نے حُلیہ بدل لیا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ دل کے سکون کے لیے کبھی کبھی اللہ والوں کے پاس بھی ہو آتا۔ آخر قدرت نے میری دُعا کو قبول کیا اور حرامی چنن شاہ کو میرے ہاتھوں اس کے انجام تک پہنچانے کے اسباب پیدا کیے۔

ایک روز یونہی ایک بزرگ کی نزدیکی گاؤں میں آمد کی خبر سُن کر وہاں پہنچ گیا۔ منزلِ مراد یہاں میرے ہاتھ لگ گئی۔

اس بزرگ کے خلیفوں میں چنن شاہ بھی موجود تھا۔ اُس نے اپنا بھیس بدل لیا تھا اور فقیروں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ لوگ اسے باباچنن شاہ کے نام سے پکارتے تھے۔ مَیں سمجھ گیا کہ اس حرامی نے اب یہ رُوپ دھار کر اپنا دھندہ شروع کیا ہے۔ مَیں اُس کے پیچھے لگا رہا۔ اُس کے ٹھکانے کا علم مجھے ہو گیا تھا۔ جہاں مَیں نے ایک روز اُس کے مریدوں کے سامنے اُسے کُتّے کی موت مار ڈالا۔ مَیں نے اُسے کلہاڑی سے قتل کیا تھا۔ اس دوران مَیں چلّا چلّا کر کہتا رہا کہ مَیں صغراں کا انتقام ہوں۔ مَیں بہادل خان ہوں۔ میں بہرام خان کا بیٹا ہوں۔ میری غیرت سے کھیلنے والے درندے کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔

کسی نے مجھے نہیں روکا۔ مَیں وہاں سے نکل گیا۔ سیدھا اپنے گاؤں گیا۔ باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ قانونی دستاویزات مکمل کر کے اپنی ساری زمین اپنی پھوپھی کے بیٹوں کو منتقل کر دی اور یہاں آ گیا۔ پولیس ساری زندگی مجھے تلاش نہ کر پاتی۔ لیکن جب زندگی کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہ گیا۔ پھر جی کر کیا کرنا ہے۔ مَیں نے خدا سے ایک آخری گناہ کی مہلت مانگی تھی جو مل گئی۔ اب مَیں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے سرخرو ہو کر اُس کے دربار میں پہنچوں گا۔

کفّارہ بیٹی کا

اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچہریوں اور عدالتوں سے واسطہ پڑے۔ اگر کبھی واسطہ پڑ ہی جائے تو پھر گھبرائیں نہیں۔ عدل و انصاف اور جزا و سزا کی اس دُنیا کو بڑے غور سے دیکھیں۔ یہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز دُنیا ہے۔ اگر آپ کو افسانے یا سچی کہانی لکھنے کا شوق ہے تو یہ دنیا کہانیوں کی زرخیز زمین ہے۔ آپ کو ناقابلِ یقین حد تک سچی کہانیاں ملیں گی۔ آپ کو ایسے ایسے ڈرامے ملیں گے۔ جنہیں آپ اس خدشے کے پیشِ نظر نہیں لکھیں گے کہ لوگ انہیں افسانہ نہ سمجھ بیٹھیں۔

عدل و انصاف کی اس دنیا کے ساتھ میرا تعلق کچھ زیادہ ہی گہرا رہا ہے۔ ایک روز ایک سول کورٹ میں کسی کام سے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ ایک جوان عورت بیان دے رہی تھی۔ عدالتوں میں بیان ہی لیے دیئے جاتے ہیں۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مجھے ریڈر سے کام تھا۔ ریڈر کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ کسی بھی عدالت کے ریڈر کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ میرے کانوں میں بیان دینے والی عورت کے یہ الفاظ پڑے۔

"میرا خاوند بے قصور ہے۔ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ دھوکہ دینے کا جرم میرا باپ ہے اور میری ماں بھی اُس جرم میں شریک ہے۔ مَیں نے اپنے خاوند کو خود کہا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ اُس نے کر لی۔ میرے باپ نے پہلے میرے خاوند کو دھوکہ دیا۔ اب اس نے میرے خاوند سے پیسے بٹورنے کے لیے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔"

مَیں اس عورت کے بیان کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے کام کو بھول گیا۔ لیکن اس کا بیان یہیں پر ختم ہو گیا اور جج نے مخالف پارٹی کے وکیل سے کہا کہ جرح اگلی پیشی پر ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا مقدمہ شروع ہو گیا۔ ریڈر نے مجھے دیکھا اُسے معلوم تھا کہ میں کس کام سے آیا ہوں۔ اُس نے مجھے کہا کہ وہ ابھی مصروف ہے کیونکہ دوسرا کیس شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے مَیں کم و بیش ایک گھنٹے بعد آؤں۔

گھنٹے بعد مَیں دوبارہ گیا تو ریڈر فارغ ہو چکا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہانیوں کی تلاش میرا خبط ہے۔ مَیں نے ریڈر سے کہا کہ میرا کام بعد میں کرنا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وہ جو سانولی اور موٹی سی عورت بیان دے رہی تھی، اُس کا کیا کیس ہے؟ ریڈروں اور عدالت کے دوسرے اہلکاروں کے لیے کوئی بھی کیس عجیب و غریب نہیں ہوتا۔ کسی کو سزائے موت سُنا دی جائے تو بھی یہ لوگ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے سوائے اس کے کہ ایک کیس ختم ہوا۔ اِس ریڈر نے مجھے بے رُخی سے کہا کہ یہاں تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تم اپنی بات کرو۔ مَیں اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ تب اس نے اس کیس کے متعلق مجھے دو چار موٹی موٹی باتیں بتا دیں اور اس لڑکی کے خاوند اور اس کے باپ کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

میرا خبط مجھے اس شہر کے اُس محلے میں لے گیا۔ جہاں اس عورت کا خاوند رہتا تھا۔ وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ مَیں نے اپنا تعارف اور اپنا مدعا اُس کے سامنے رکھا تو وہ کچھ ڈر سا گیا۔ اُسے شک تھا کہ میں مخالف پارٹی یا شاید پولیس یا کچہری کا آدمی ہوں۔

کسی کے سینے سے
راز نکالنا یا کسی کو اپنے زیرِ اثر لانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں یہ جوان سال اور خوبرو آدمی مجھے اپنا ہمدرد اور مخلص دوست سمجھنے لگا۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ مَیں نے اُس کے ساتھ دلی ہمدردی کی تھی اور میرے دل میں کوئی دھوکا اور فریب نہیں تھا۔ مَیں نے اُسے تیار کر لیا کہ وہ اس کیس کے متعلق

مجھے کچھ بتائے جو اُس کے سُسر نے اُس کے خلاف دائر کر رکھا ہے۔

وہ چونکہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس لیے اُس نے کہا کہ مَیں اس کیس کا سارا پس منظر سُنا تو دیتا ہوں لیکن آپ لکھ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ کیس کورٹ میں چل رہا ہے۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ مَیں اس قانون سے واقف ہوں۔ آپ صرف کہانی سُنا دیں اور مَیں یہ اُس وقت لکھوں گا۔ جب کیس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اُس نے مجھے گھر بٹھا کر تمام کہانی سُنا دی، جس کی تصدیق مَیں نے اپنے ذرائع سے اُس کے سُسر کے محلّے سے بھی کی۔ سول کے کیسوں کے جنہیں دیوانی مقدمات کہا جاتا ہے فیصلے برسوں میں ہوا کرتے ہیں۔ اس کیس کا فیصلہ دو سال میں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو دو تین تین مہینے لمبی تاریخیں ملتی ہیں۔

کہانی سُنانے سے پہلے مَیں آپ کو ایک اور بات بتا دوں۔ کوئی واقعہ جب ایک قانونی کیس کی صورت میں عدالت میں جاتا ہے تو اُس کی شکل و صورت ہی بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور سچ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں کہ اس واقعے کے کردار بھی چکرا جاتے ہیں۔ اس شخص نے جسے میں کہانی سُنانے کی خاطر افضل کہوں گا، جو داستان سنائی وہ مَیں اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

افضل دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب اس کا باپ ٹرک کے ایک حادثے میں مر گیا۔ اس کا بڑا بھائی پہلے ہی بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ افضل اپنی ماں کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ ماں بڑی سلجھی ہوئی عورت ہوا کرتی تھی۔ مگر پہلے جوان بیٹے کی وفات پھر خاوند کی اچانک موت نے اُسے ذہنی طور پر اِنبار مل بنا دیا۔ وہ اب افضل کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ لیکن اُس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ وہ اُسے باہر نکلنے سے بھی منع کرتی تھی۔ وہ باہر چلا جاتا تو دروازے میں بیٹھی رہتی۔ موت ایک مستقل خوف بن کر اُس کے دماغ پر سوار ہو گئی اور وہ ذہنی مریضہ بن گئی۔ اُسے ایسی چپ لگی جیسے وہ گونگی ہو گئی ہو۔ افضل کی جذباتی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف بڑوں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دوسری طرف ماں پاگل ہو گئی۔ کوئی عزیز رشتہ دار

بھی نہ تھا۔ جو تھے وہ ۱۹۴۷ء کے قتلِ عام کی نذر ہو گئے تھے اور جو یہاں پہنچے۔ وہ نجانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے۔ افضل کی عمر ابھی سولہ سال نہیں ہوئی تھی۔ اس کچی عمر میں اُس نے رونے دھونے اور مایوس ہونے کے بجائے اپنے آپ میں یہ عزم پیدا کر لیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو گا۔ اُس کی ماں اس حد تک ضرور نارمل رہی کہ افضل کے لیے ہانڈی روٹی کر دیتی اور اُس کے کپڑے دھو دیتی۔ اس کے سوا وہ حقیقی زندگی سے بالکل لاتعلق تھی۔

افضل کے سکول کا ہیڈ ماسٹر اُس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے۔ ایک تو اس کی فیس معاف کروا دی، دوسرا کرم یہ کیا کہ تین چار روپے پیسے والے آدمیوں سے کہہ کر اُس کے لیے معقول ماہانہ وظیفے کا انتظام کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو افضل اور اُس کی ماں اس ملک کے بھکاریوں کی تعداد میں دو کا اضافہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتے اس ہیڈ ماسٹر کی اخلاقی حوصلہ افزائی بھی اتنی تھی کہ افضل نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ اُسے باقاعدہ وظیفہ دینے والوں نے کہا کہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ یہیں پر نہ توڑے۔ کالج میں داخل ہو جائے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اب یہ وظیفہ اُس کے لیے ناکافی تھا۔ اُس نے چار پانچ لڑکوں کی ٹیوشن رکھ لی اور صحیح معنوں میں پیٹ پر پتھر باندھ لیا۔ ماں جو پہلے ذہنی مریضہ تھی۔ اب جسمانی طور پر بھی علیل رہنے لگی۔ افضل نے اُس کے علاج معالجے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

افضل نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ یہ فتح و کامرانی کی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں کے قدموں میں جنّت ہے میرا مستقبل میری کوششوں سے نہیں، بلکہ میری ماں کی دعاؤں نے بنایا ہے۔ اس دَور میں کون کسی کی اس طرح مدد کرتا ہے۔ جس طرح میرے ہیڈ ماسٹر صاحب اور اُن تین چار فرشتہ سیرت انسانوں نے کی۔ مَیں نے باپ اور بڑے بھائی کی موت کو اللہ کی مرضی جان کر قبول کیا۔ مَیں نے کئی بار ایک وقت کا فاقہ کر کے ماں کا علاج معالجہ کروایا۔ پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی ذاتِ باری نے میری محنت اور خدمت قبول کی۔

اگر میرا باپ جائیداد اور روپیہ پیسہ چھوڑ کر مرتا تو میں آج ایک آوارہ آدمی ہوتا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ کم مائیگی اور محنت میں جو لذّت ہے وہ عیش و عشرت میں نہیں۔

افضل نے اپنے خیالات کو اور اپنی زندگی کو ایک عزم کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اُس نے نیم فاقہ کشی کی حالت میں زندگی کے چار سال گزارے اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ ماں علاج معالجے کے باوجود زندہ لاش بن چکی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو جو روگ لگا لیا تھا۔ وہ اُسے کھا گیا۔

اللہ نے اس پر یہ کرم بھی کیا کہ اُسے ایک بہت بڑی پرائیویٹ فرم میں اچھی ملازمت مل گئی۔ وہاں بھی اُس نے خلوص، دیانت داری اور محنت سے کام کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک سال بعد اُسے سیلز پرانچ میں بڑی اچھی تنخواہ پر لگا لیا گیا۔ اُس کی ماں جو اس زندگی سے رشتہ توڑ چکی تھی۔ افضل سے کہا کرتی تھی کہ اب میں اُس دن کے لیے زندہ رہوں گی جب تمہاری دلہن گھر آئے گی۔ میں تم دونوں کے ہاتھوں رُخصت ہوں گی۔ لیکن ماں اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکی۔ ایک صبح افضل جاگا اور جب ماں کو جگانے لگا تو اُس کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ وہ نیند میں بڑی پرسکون موت مر چکی تھی۔

افضل کہتا ہے کہ یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ دُکھ اُسے یہ تھا کہ اُس کی ماں اُس کی دلہن کو دیکھے بغیر دُنیا سے رُخصت ہو گئی تھی۔ افضل کو ہر حال میں اب زندگی کے ساتھی کی ضرورت تھی۔ اُس کی مالی اور سوشل پوزیشن خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ کمپنی نے اُسے سکوٹر بھی لے دیا تھا۔ کیونکہ اُس کا کام سیلز پروموشن سے متعلق تھا۔ وہی افضل جسے محلے والے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا کرتے تھے۔ اب اس کی طرف توجہ دینے لگے۔ دو گھروں کی توجہ کا تو وہ خاص مرکز بن گیا۔ کیونکہ ان گھروں میں جوان لڑکیاں تھیں۔ جن کے لیے اچھے رشتے درکار تھے۔ افضل سے بڑھ کر اور اچھا رشتہ کون سا ہو سکتا تھا، آمدنی معقول، اکیلا لڑکا، مکان اپنا اور دلہن کی نہ ساس مانند، لیکن افضل میں ایسی جھجک اور شرم تھی کہ چاہتے ہوئے بھی وہ رشتے کا لفظ زبان

پر نہیں لاتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں یہ رواج ہے کہ لڑکی والے خود لڑکے والوں سے رشتے کی بات نہیں کرتے۔ لڑکے والوں کو لڑکی کے والدین کے پاس جانا پڑتا ہے۔ افضل میں اتنی ہمت نہیں تھی اور وہ ان طور طریقوں سے واقف بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں ایک عورت اُس کا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے آگئی۔ وہ رشتے کروانے والی پیشہ ور عورت تھی۔ اس نے سب سے پہلے افضل پر یہ جادو چلایا کہ اُس کی ماں کی سگی بہن بن گئی، حالانکہ افضل نے اُس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن اس عورت کی زبان میں ایسا اثر تھا کہ افضل نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے لیے رشتہ ڈھونڈے۔

اس عورت نے سب سے پہلے تو ان دو گھرانوں کے خلاف زہر اگلا جن کی افضل پر نظر تھی۔ اُس نے افضل کو خبردار کیا کہ ان دونوں گھرانوں کی لڑکیاں صحیح نہیں اور ان کے چال چلن بھی مشکوک ہیں۔

"میں تمہارے لیے آٹھ لڑکوں کے نمبر کاٹ کر ایک رشتہ پکا کر آئی ہوں"۔ رشتہ کروانے والی مائی نے کہا۔ "تم انگوٹھی چھلا اور دو چار جوڑے کپڑے تیار کر لو پھر میں شادی کا دن مقرر کرا دوں گی۔"

افضل خوش ہوا کہ اُس کا ایک پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اُس نے مائی کو پچیس روپے پیش کیے۔ مائی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں کسی لالچ سے نہیں آئی۔ میں تو تمہاری ماں کی روح کو راضی کرنے آئی ہوں۔ افضل نے کہا کہ شادی ایک ہی بار کرنی ہوتی ہے مجھے لڑکی دکھا دو۔ افضل کو دراصل اپنے دوستوں کا یہ مشورہ یاد آ گیا تھا کہ تم اکیلے ہو، کہیں سے رشتے کی پیش کش ہو تو لڑکی دیکھے بغیر قبول نہ کرنا۔

"افضل بیٹا"! مائی نے کہا: "وہ بڑے شریف اور پردہ دار لوگ ہیں۔ اگر میں نے انہیں کہا کہ لڑکا لڑکی دیکھنا چاہتا ہے تو وہ بگڑ جائیں گے۔ کہیں گے کہ لڑکا اچھے چال چلن کا نہیں۔"

افضل چُپ ہو گیا۔ دوسرے دن اُس نے دفتر میں اپنے دوستوں کے ساتھ

بات کی۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح بھی ہو، وہ لڑکی کو ضرور دیکھ لے۔ لڑکی کے باپ اور اُس کے گھر کو تو وہ دیکھ ہی لے گا۔ لڑکی کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔

دو تین دن بعد مائی پھر اُس کے گھر آئی اور اس طرح باتیں کرنے لگی۔ جیسے رشتہ بالکل پکا ہو گیا ہے اور اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ افضل کیا کچھ بنائے لیکن افضل نے یہ پُر زور شرط مائی کے آگے رکھ دی کہ کسی طرح لڑکی کی جھلک دکھا دو۔ ورنہ میں یہ رشتہ قبول نہیں کروں گا۔ مائی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی کہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ لیکن وہ کوشش کرے گی کہ کسی طرح لڑکی کا چہرہ اُسے دکھا دے۔

تیسرے روز مائی اس وقت افضل کے گھر آئی۔ جب وہ دفتر سے ابھی آیا ہی تھا وہ افضل کو لڑکی والوں کا گھر تو دکھا چکی تھی۔ وہ گھر کسی اور محلے میں تھا۔ مائی نے اُسے کہا کہ تم اُس گھر کے سامنے سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گزرنا۔ میں کسی بہانے سے لڑکی کو دروازے تک لے آؤں گی اور جب تم وہاں سے گزرو گے تو میں ایک کواڑ کھول دوں گی۔ تمہیں لڑکی نظر آجائے گی۔

مائی کے جانے کے قریباً نصف گھنٹہ بعد افضل گھر سے چل پڑا اور اُس دو منزلہ اور خوبصورت مکان کے قریب پہنچ گیا۔ جو لڑکی کا گھر تھا۔ لڑکی والے امیر کبیر لوگ تھے۔ افضل آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب دروازے کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک کواڑ ذرا سا کھلا۔ اُسے ایک بڑی خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ اُس کے پیچھے مائی کھڑی تھی۔ افضل کو توقع نہیں تھی کہ لڑکی اتنی خوبصورت ہو گی۔ اُس کے قدم اپنے آپ ہی رُک گئے۔ خود افضل خوبرو اور پرکشش جسم کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے لڑکی کے حُسن سے متاثر ہو کر لڑکی کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ افضل بھی مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ بہت ہی خوش تھا۔ وہ اُسی رات لڑکی کے گھر گیا اور اُس کے باپ سے ملا۔ لڑکی کی ماں بھی قریب آکر بیٹھ گئی۔ افضل دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کے والدین سے کہا کہ شادی جلدی کر دیں۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ وہ تو اُس کے حکم کے منتظر ہیں۔

پندرہ بیس دن کے بعد مائی کی زیر ہدایات افضل نے تیاری مکمل کر لی اور بڑی سادگی اور خاموشی سے شادی ہو گئی۔ افضل کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ رات کو وہ دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس پر ہیجان طاری تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس کی دلہن سُرخ گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ افضل نے کانپتے ہاتھوں سے اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا اور اس کے ساتھ وہ اس طرح بدک کر پیچھے ہٹا جیسے اُس نے سانپ کی پٹاری کا ڈھکنا اٹھا دیا ہو۔ پہلے تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اب اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جو مائی نے اُسے دکھائی تھی۔ اس دلہن کا رنگ بیماروں کی طرح پھیکا اور سانولا تھا۔ افضل نے آگے بڑھ کر غصّے سے دلہن کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ اُس کا چہرہ عورت کا چہرہ لگتا ہی نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی مرد نے دلہن کا بہروپ دھار لیا ہو۔ دُلہن دُبلی پتلی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ افضل نے اُس سے پوچھا: "کون ہو تم؟ اور مجھے یہ دھوکہ صرف تمہارے باپ نے دیا ہے یا تم بھی اس میں شامل ہو؟"

لڑکی جواب دینے کے بجائے پلنگ سے اُٹھی اور افضل کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ اب وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"مَیں کسی دھوکے میں شریک نہیں ہوں۔" لڑکی نے کہا: "مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ پھر مجھے شادی کی تاریخ بتائی گئی۔ آپ میرے سر پہ قرآن رکھ دیں تاکہ آپ کو یہ شک نہ رہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"اٹھو" افضل نے کہا: "پلنگ پر بیٹھو اور مجھے یہ سارا فراڈ سمجھاؤ۔"

"مجھے جب بتایا گیا کہ کسی نے میرا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ تو خدا کی قسم، مَیں بہت پریشان ہوئی۔" دلہن نے کہا۔ "اگر مجھے اپنے ماں باپ کا ڈر نہ ہوتا اور مَیں پردے میں نہ ہوتی تو مَیں یہ ضرور کہتی کہ جس کے ساتھ میرا رشتہ پکّا ہو گیا ہے۔ اسے کہو کہ شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے مجھے دیکھ لے۔ مَیں نے رشتہ کروانے والی مائی سے کہا تھا کہ کوئی ایسا انتظام کرو کہ میرا ہونے والا خاوند مجھے دیکھ لے لیکن مائی نے

کہا کہ اُس نے اگر تجھے دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے یہ شادی نہ ہو۔"

"اس مائی نے مجھے تمہارے گھر کے دروازے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی دکھائی تھی۔" افضل نے کہا۔ "اسی لیے مَیں نے بے صبر ہو کر شادی کی تاریخ بڑی مبدی مقرر کروا لی تھی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" دلہن نے کہا۔

"تمہیں یاد ہے کہ مَیں پہلی مرتبہ شام کے بعد تمہارے والدین سے ملنے تمہارے گھر گیا تھا۔" افضل نے کہا: "یہ اُسی دن کا واقعہ ہے۔ اُس روز یہ مائی تمہارے گھر آئی تھی۔"

دلہن سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر سوچ کر اُس نے کہا: "مجھے یاد آ گیا۔ مجھے مائی کا اور اپنے ماں باپ کا یہ دھوکہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ جس دن اور جس وقت کی آپ بات کر رہے ہیں۔ اُس وقت ہمارے محلے کی ایک لڑکی اِس مائی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ لڑکی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ تو مائی نے اسے کہا تھا کہ اُٹھ چلیں۔ یہ لڑکی ابھی میرے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن مائی اسے اُٹھا کر لے گئی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہی لڑکی دکھائی گئی ہے۔ دلہن پھر سوچ میں پڑ گئی اور آہستہ آہستہ سر ہلانے لگی۔ جیسے اُسے کچھ اور یاد ہو۔ اُس نے کہا: "مائی اور میری ماں الگ بیٹھ کر کھُسر پھُسر کرتی رہی تھیں۔ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ میری ماں بھی آپ کو یہ لڑکی دکھانے کی سازش میں شامل تھی۔ میرے ابا جی اتنے شریف انسان ہیں کہ آپ اگر اُن پہ کوئی الزام عائد کریں گے تو محلے میں کوئی بھی آپ کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ لیکن مَیں جانتی ہوں کہ میرا باپ کاروباری آدمی ہے اور اپنا مطلب نکالنا بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس سازش میں شامل ہے۔ مجھے اگر پتہ چل جاتا کہ آپ کو کوئی دوسری لڑکی دکھائی جا رہی ہے تو میں بولے بغیر نہ رہتی۔ میرے تین رشتے آئے تھے۔ تینوں کی عورتیں آئیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ اس کے بعد وہ لوٹ کر نہ آئیں۔ مَیں نے خدا کی اس مرضی کو قبول کر لیا تھا کہ میری شادی کبھی نہیں ہو گی۔

اسی لیے مَیں نے اپنے آپ کو عبادت، وظائف اور تلاوتِ قرآن میں ڈبو لیا تھا۔ مَیں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ باقی زندگی اللہ کی یاد میں گزار دوں گی۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا۔ معلوم نہیں خدا نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے۔"

افضل کبھی کُرسی پر بیٹھ جاتا کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی اُسے اتنا غُصّہ آتا کہ وہ اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا۔ کبھی یہ ارادہ اُسے آگ بگولہ کر دیتا کہ وہ انھی مائی کو جا کر قتل کر دے۔

"مَیں آپ سے نہیں کہوں گی میں جیسی تیسی بھی ہوں۔ مجھے قبول کر لیں۔" دُلہن نے کہا۔ "آپ خوبصورت جوان ہیں۔ مَیں آپ کے قابل نہیں۔ آپ کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے۔ اس کے بعد آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں اور گھر سے نکال دیں۔ میرے ماں باپ کی یہی سزا ہے۔ اگر آپ اپنی اس بدقسمتی کو قبول کرتے ہیں تو میں اس گھر میں آپ کی بیوی نہیں بلکہ ایک نوکرانی کی حیثیت سے پڑی رہوں گی۔ آپ میرے والدین اور مائی کی سزا مجھے دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ لیں کہ آپ مجھ بے گناہ کو سزا دیں گے۔"

افضل نے مجھے اُس رات کی بات سناتے ہوئے کہا: "مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مَیں نے کیسے کیسے دُکھ جھیلے ہیں۔ میرے حالات نے مجھے لڑکپن میں ہی جوان کر دیا تھا۔ میرے ساتھ کچھ لوگوں نے بہت بڑی نیکی کی تھی۔ کسی کی نیکی کی جو قدر میرے دل میں تھی وہ شاید کسی اور کے دل میں نہیں ہو سکتی تھی۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اب اس لڑکی کی باتیں سُنیں تو میرا غصّہ تو ٹھنڈا نہ ہوا۔ لیکن دلہن کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں اُسے طلاق نہیں دوں گا اور اُسے گھر سے بھی نہیں نکالوں گا اور کوشش کروں گا کہ اُس کے ماں باپ کی سزا اُسے نہ ملے۔

دلہن گھٹے ہوئے ذہن کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے افضل کا رویّہ دیکھ کر اور اُس کا فیصلہ سُن کر ایک بار پھر اُسے کہا کہ وہ ایسا ایثار نہ کرے جو اسے ساری عمر کی خوشیوں سے محروم کر دے۔ افضل نے اُسے کہا کہ وہ رشتہ کرانے والی مائی سے اور اُس کے باپ سے انتقام لے گا۔ لیکن اُسے اپنی بیوی بنا کر رکھے گا۔

افضل نے سوچا کہ یہ لڑکی اگر قبولِ صورت نہیں اور اگر یہ ہڈیوں کا کھڑکھڑاتا ڈھانچہ ہے تو یہ اس کا قصور نہیں۔ اسے خدا نے ایسا بنایا ہے لیکن اُسے جب یہ خیال آتا کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے تو اُسے آگ لگ جاتی۔ اُس نے رات ذہنی کشمکش کی کیفیت میں گزار دی۔ اُس نے ولیمے کا انتظام بہت ہی محدود کیا تھا۔ دلہن کے ماں باپ اور دو بھائیوں کو جو دلہن سے چھوٹے تھے اور چار پانچ قریبی دوستوں کو مدعو کیا تھا۔

دوسرے دن یہ سب مہمان آئے تو افضل نے اپنے سُسر کو الگ کر کے کہا "آپ خوش ہوں گے کہ آپ کا فراڈ کامیاب ہے۔ اب میرا انتقام دیکھنا۔ یہ بھی کامیاب ہو گا۔"

سُسر نے کھسیانہ سا ہو کر اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ افضل نے اپنی ساس سے بھی یہی کہا۔ پھر اُس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ دوستوں نے اسی وقت افضل کے سُسر کو گھیر لیا۔ کوئی کہتا کہ اسے پولیس کے حوالے کرو۔ اور کوئی کہتا تھا کہ اس کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کرو۔ لیکن افضل کی کمزوری یہ تھی کہ اُس نے نکاح میں اس دلہن کو قبول کیا اور نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اُسے کوئی اور لڑکی دکھائی گئی تھی۔ بہرحال دعوتِ ولیمہ بدمزگی کی نذر ہو گئی۔ رواج کے مطابق دلہن کو اپنے میکے جانا تھا۔ دلہن کی ماں نے افضل کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور اُسے کہا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو اتنا زیور دیا ہے۔ جتنا کوئی دو بیٹیوں کو بھی نہیں دیتا۔ ساس نے یہ بھی کہا کہ وہ چالیس پینتالیس ہزار روپیہ نقد بھی دے دیں گے۔ اس کے عوض افضل انہیں بدنام نہ کرے اور اُن کی بیٹی کو قبول کر لے۔

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سُسرال کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سُسر کو درمیان

بٹھا کر بتایا کہ اس شخص نے اُس کے ساتھ کیا دھوکہ کیا ہے؟

سب نے کہا کہ رشتہ کرانے والی مائی کو پکڑا جائے۔

"وہ غریب عورت ہے۔" افضل نے کہا۔ "رشتے کرانا اُس کا ذریعہ معاش ہے۔ آپ ایک غریب عورت کو ہی کیوں پکڑتے ہیں؟ میرے سُسر اور ساس کو کیوں نہیں پکڑتے۔ جنہوں نے اس مائی سے مجھے دھوکہ دلوایا؟ اس لیے کہ یہ شریف اور پارسا بنے پھرتے ہیں؟ ایک غریب عورت سے یہ جرم اس امیر آدمی نے کرایا۔ جس نے مجھے زیور اور چالیس پینتالیس ہزار روپیہ نقد پر خریدنا چاہا۔"

یہ کہہ کر افضل دوسرے کمرے میں چلا گیا اور اپنی دلہن کا وہ تمام زیور اُٹھا لایا جو دلہن کو ماں باپ نے دیا تھا۔ اُس نے زیور اپنے سُسر کی جھولی میں ڈالتے ہوئے کہا کہ اُس کی دلہن وہ زیور پہنے گی جو اُس نے خود اُس کے لیے بنایا ہے۔ اُس نے سب کو یہ بھی بتایا کہ اُس کی ساس نے اُسے چالیس پینتالیس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن وہ اس رقم کو قبول نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے کہا کہ وہ اُن کی بیٹی کو طلاق نہیں دے گا، اُسے آباد کرے گا۔ اُس نے یہ اعلان بھی کیا کہ اُس کی دلہن اپنے میکے کبھی نہیں جائے گی۔

یہ محفل برخاست ہو گئی۔ شام کو افضل اور اُس کے دوست رشتہ کرانے والی مائی کے گھر چلے گئے۔ اُس کا خاوند محنت مزدوری کرنے والا شریف آدمی تھا۔ افضل نے مائی سے کہا کہ وہ اُسے پولیس کے حوالے کرے گا۔ ایک دوست نے کہا کہ پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس کی ایک ٹانگ توڑ دیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ اس سے ہم ایسا انتقام لیں گے کہ اسے جو دیکھے گا وہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

مائی نے انہیں بتایا کہ دلہن کے ماں باپ نے اُسے یہ رشتہ افضل کے ساتھ کرانے کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس نے افضل کو جو لڑکی دکھائی تھی اُسے وہ دھوکے سے افضل کی دلہن کے گھر لے گئی اور اُسے باتوں باتوں میں دروازے میں لے جا کر کھڑا کیا تھا۔ مائی نے افضل اور اُس کے دوستوں

کے ڈر سے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ یہ لوگ اُسے خطرناک دھمکیاں دے کر آ گئے۔

افضل عجیب سی زندگی گزارنے لگا۔ اُس نے اپنی بیوی کو کبھی طعنہ نہ دیا کہ اس کے ماں باپ نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اُس کے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اتنا اچھا کہ بیوی نے اُسے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی پسند کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر لے اور وہ دونوں کی خدمت کرے گی۔ افضل کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کیا کرے۔ ایک یہ بیوی تھی جس کے ساتھ اُسے ہمدردی تھی۔ دوسرے یہ دھوکہ تھا جو اُسے دیا گیا اور تیسرے اپنی پسند کی بیوی اُس کے ذہن پر سوار تھی۔

وہ پریشان رہنے لگا۔ اُسے پریشان دیکھ کر اُس کی بیوی اتنی پریشان ہو جاتی کہ وہ رو پڑتی۔ افضل اُسے بہلا تو لیتا لیکن بیوی کو یہ احساس ذہنی اذیت میں ڈالے رکھتا کہ وہ اس خوبرو اور جوان آدمی کی پسند کی بیوی نہیں اور اس کے ساتھ اُس کے ماں باپ نے دھوکہ کیا ہے۔

اُدھر افضل کے دوستوں نے مائی کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ کوئی نہ کوئی دوست اُس کے گھر جا کر اسے دھمکیاں دے آتا۔ دوستوں نے یہی سکیم بنائی تھی کہ اسے پریشان کرتے رہو اور اس پر خوف طاری کیے رکھو۔

شادی کے پانچویں چھٹے مہینے کا ذکر ہے کہ وہی لڑکی جو مائی نے افضل کو دکھائی تھی، افضل کی بیوی سے ملنے آ گئی۔ افضل دفتر سے آ گیا۔ لڑکی نے جسے میں فرضی نام عرفانہ دے دیتا ہوں، افضل سے پردہ نہ کیا۔

"یہی وہ لڑکی ہے نا، جو آپ کو دکھائی گئی تھی؟" افضل کی بیوی نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں۔" افضل نے کہا: "یہی تھی۔"

"مجھے آج آپ کی بیوی سے پتہ چلا ہے کہ آپ کو میری جھلک دکھا کر دھوکہ دیا گیا تھا۔" عرفانہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا: "وہ مائی بہت چالاک اور مکار ہے۔ یہ (افضل کی بیوی) میری سہیلی ہے۔ میں اس کے پاس جاتی رہتی تھی۔ اُس روز مائی ہمارے

گھر آئی اور میری امی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ جانے لگی تو مائی نے مجھے کہا کہ چلو تمہیں تمہاری سہیلی کے گھر لے چلوں۔ مَیں ادھر ہی جا رہی ہوں۔ مَیں اس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ اس کی امی کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر مجھے کہنے لگی کہ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ اُس نے مجھے دروازے میں روک لیا۔ اُدھر سے آپ آ گئے۔ مائی نے کہا کہ اس کے ساتھ رشتہ طے ہوا ہے۔ مَیں آپ کو دیکھ کر مسکرائی کیونکہ آپ میری سہیلی کے خاوند بننے والے تھے۔

عرفانہ افضل کے دل میں پہلے ہی اُتری ہوئی تھی۔ افضل نے اس کے ساتھ ایسی خوشگوار بے تکلفی باتوں کی حد تک پیدا کر لی کہ عرفانہ شام تک وہیں بیٹھی رہی۔ اگر شام کو اُس کی ماں اسے لینے نہ آ جاتی تو شاید وہ کچھ اور دیر وہیں بیٹھی رہتی۔ اس کے بعد عرفانہ تیسرے چوتھے روز افضل کے گھر بظاہر اُس کی بیوی سے ملنے کے لیے آنے لگی۔ وہ اُس وقت آتی تھی۔ جب افضل دفتر سے گھر آ چکا ہوتا تھا۔ باتوں کی حد تک ان کی بے تکلفی خاصی بڑھ گئی۔

افضل نے دیکھا کہ دو مرتبہ ایسے ہوا کہ عرفانہ آئی تو تھوڑی دیر بعد افضل کی بیوی یہ کہہ کر باہر نکل گئی کہ پڑوسن نے بلایا تھا۔ مَیں ذرا اُس کی بات سُن آؤں۔ اس کی غیر حاضری میں افضل اور عرفانہ نے اپنے اپنے دل کھول کر ایک دوسرے کے آگے رکھ دیئے۔ ایک روز عرفانہ نے اُسے کہا کہ اُسے بہت شرمندگی ہے کہ جو دھوکہ افضل کو دیا گیا۔ اس میں اُسے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ واقعی شرمسار ہوتی تھی۔ ایک روز عرفانہ نے کہا کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ وہ افضل کو اس جرم کا جرمانہ ادا کرے۔

"لیکن میں جو جرمانہ تم پر عائد کروں گا۔ وہ تم ادا نہیں کر سکو گی۔" افضل نے کہا۔

"یہی بہتر ہے کہ تم آ جاتی ہو اور میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔"

"آپ جرمانہ بتائیں۔" عرفانہ نے جذباتی لہجے میں پوچھا — "شاید میں ادا کر سکوں۔"

"وہ جرمانہ تم ہو ... تم ... مجسّم۔" افضل نے نشیلی سی مسکراہٹ سے کہا:

"تو مجھے غلط نہ سمجھنا۔ مَیں وقتی دوستی کا قائل نہیں۔ مَیں تمہیں اپنے گھر میں عمر قیدی بنانا چاہتا ہوں۔"

عرفانہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔ اُس کا سر جھک گیا۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"مَیں آپ کے جذبات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" عرفانہ نے کہا: "لیکن میں برداشت نہیں کر سکوں گی کہ میری اتنی عزیز سہیلی کو طلاق ہو جائے۔ کیا آپ اُسے طلاق دے دیں گے؟"

"نہیں!" افضل نے کہا: "یہ اوچھی حرکت مجھے کرنی ہوتی تو مَیں ازدواجی زندگی کی پہلی رات ہی کر گزرتا۔ تمہاری سہیلی نے تمہیں بتایا ہو گا کہ مَیں اُسے فیصلہ دے چکا ہوں کہ مَیں اُسے آباد کروں گا۔ وہ بے قصور ہے۔ اُسے خدا نے جس شکل و صورت میں پیدا کیا۔ وہ خدا کا معاملہ ہے۔ مَیں اُسے رَد نہیں کر سکتا۔ یہ گناہ ہے۔ دوسرا گناہ بھی ہو گا کہ میں اس کے ماں باپ کی سزا اسے دوں۔ یہ تو میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ مَیں اپنی پسند کی شادی کر لوں۔ لیکن میں نہیں مانتا۔"

"یہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔" عرفانہ نے کہا: "اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اُسے کسی پڑوسن نے نہیں بلایا۔ وہ ہمیں تنہائی میں بیٹھنے کا موقعہ دے کر چلی گئی ہے۔"

عرفانہ کے چلے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد افضل کی بیوی آ گئی۔ افضل نے اسے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے جا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ ایسی حرکت کیوں کرتی ہے۔ جس سے اُس کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اُس کی بیوی ہنس کر کہا کہ وہ پڑوسن کے بلانے پر ہی گئی تھی۔

"میری بات غور سے سنو راشدہ!" افضل نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "میں تسلیم کرتا ہوں کہ عرفانہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔"

راشدہ جو مسکرا رہی تھی۔ اس طرح سنجیدہ ہو گئی جیسے کسی نے جلتے دیے کو پھونک

مار دی ہو۔"

"مَیں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے دھوکہ دیں۔" راشدہ نے بھرپور آواز میں کہا۔ "جس طرح آپ نے مجھے دل و جان سے قبول کیا ہے۔ اس کا صلہ دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ مَیں آپ کو اس سے بھی زیادہ خوبصورت صلہ دینے کی قسم کھا چکی ہوں۔"

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں عرفانہ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لوں؟" افضل نے ایسی آواز میں کہا جس میں کچھ غصہ بھی تھا۔ "وہ کسی کی کنواری بیٹی ہے اور تمہارے اعتماد پر میرے گھر آتی ہے۔"

"مَیں چاہتی ہوں کہ وہ میرے اعتماد پر ہمیشہ کے لیے آپ کے گھر میں آجائے۔" راشدہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "مَیں جانتی ہوں کہ عرفانہ آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔ اور وہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ مجھے پڑوسن نے نہیں بُلایا تھا۔ مَیں آپ دونوں کو تنہائی میں چھوڑ کر دانستہ چلی گئی تھی۔ خدا قسم اس سے مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے۔ جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ اپنے جذبات میرے لیے قربان کر رہے ہیں۔ مَیں اپنا آپ، آپ پر قربان کر دوں گی۔" راشدہ بولتے بولتے چپ ہو گئی اور اس کے چہرے پر خون کی لالی آگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر افضل کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جذبات سے لرزتی ہوئی بلند آواز سے بولی۔ "آپ کے ساتھ جو دھوکہ ہوا ہے۔ مَیں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ مَیں آپ کی دوسری شادی کروا کے دم لوں گی۔ آپ کی شادی عرفانہ کے ساتھ ہو گی۔"

وہ بہت دیر ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ جن میں جذباتیت تھی اور حقیقت بھی۔ افضل اتنا سمجھ گیا کہ راشدہ کے انداز میں احتجاج اور غصہ نہیں لیکن افضل کا کردار کچھ ایسا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے۔ تین چار روز بعد وہ مائی آئی۔ جس نے افضل اور راشدہ کا رشتہ طے کروایا تھا۔ اس نے افضل کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بہت روئی۔

"خدا کے لیے مجھے وہ سزا دے دو جو تم دینا چاہتے ہو یا اپنے دوستوں سے کہو کہ

میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" مائی نے روتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کوئی نہ کوئی دوست میرے گھر آکر مجھے ڈرا دھمکا جاتا ہے۔ میں جہاں جاتی ہوں وہاں تمہارے دوستوں کے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ مانٹے میرے دامن کو آتے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لیے میں نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن تمہارے دوستوں نے مجھے ہر محلّے میں اتنا بدنام کر دیا ہے کہ کسی گھر میں کوئی میری بات نہیں سنتا۔ اس سے بہتر ہے کہ مجھے زہر دے کر مار ڈالو۔"

"یہ تو سب نے دیکھا تھا کہ تم نے میرا رشتہ کس طرح کروایا ہے۔" افضل نے کہا۔ "اس میں میرے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔"

دراصل افضل کے دوست اِس مائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اتنے مہینے گزر جانے کے باوجود ایسی کسی دھمکی پر عمل نہ کیا جو وہ اسے دیتے تھے۔ وہ شرارتی سے لڑکے تھے۔ کبھی مائی کے گھر چلے جاتے۔ کبھی اُسے راستے میں روک لیتے۔ مائی جس علاقے میں گھومتی پھرتی تھی۔ وہاں انہوں نے مائی کی یہ کرتوت سب کو بتا دی۔ اس طرح وہ مائی کے لیے مسلسل دہشت اور رسوائی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اب مائی تنگ آکر افضل کے قدموں میں آن گری۔ افضل تو چپ رہا راشدہ بول پڑی۔

"مائی ایک کام کرو۔" راشدہ نے کہا۔ "میں تمہاری خلاصی کرا دیتی ہوں۔ تم عرفانہ کا رشتہ افضل صاحب کے لیے پکا کروا دو۔"

مائی اسے مذاق سمجھی۔ افضل تو خاموش رہا لیکن راشدہ نے مائی کو قائل کر لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی ہے۔ تب افضل نے راشدہ سے کہا کہ وہ ایسی حرکت نہ کرے لیکن راشدہ جو منہ سے نکال چکی تھی۔ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔

اس روز کے بعد مائی افضل کے گھر آتی رہی۔ لیکن جو بھی بات چیت ہوتی وہ راشدہ کے ساتھ ہوتی۔ افضل کو ان کی بہت سی باتوں کا علم ہی نہ ہو سکا۔ اسے یہ علم ضرور ہوا کہ راشدہ اپنے ماں باپ کے گھر کبھی نہ گئی۔

ایک روز عرفانہ کا باپ افضل کے دفتر میں جا کر اُسے ملا اور اُسے کہا کہ رشتے کروانے والی مائی افضل کے لیے عرفانہ کا رشتہ مانگ رہی ہے۔ عرفانہ کا باپ حیران تھا کہ افضل کی بیوی یہ رشتہ کروا رہی تھی۔

"میری ایک بات بڑے غور سے سُننا۔" افضل نے عرفانہ کے باپ سے کہا۔ "مَیں آپ کی بیٹی کا رشتہ چاہتا ہوں لیکن میں راشدہ کو طلاق نہیں دوں گا۔ مَیں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ کی بیٹی میرے گھر آ کر ایک منٹ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کرے گی کہ اس گھر میں اُس کی سوکن بھی موجود ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میری بیوی کے ماں باپ نے میرے ساتھ کیا دھوکہ کیا تھا۔"

"ہاں! ہاں!" عرفانہ کے باپ نے کہا۔ "عرفانہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔ مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ راشدہ بہت نیک لڑکی ہے۔ مَیں دل میں کوئی تسلی لے کر ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر یہ گھر تمہارا نہ ہوتا تو مَیں اپنی بیٹی کو کسی کی سوکن بنا کر نہ بھیجتا۔ میری ایک مجبوری بھی ہے جو مَیں تم جیسے بھلے مانس کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔ میری چھ بیٹیاں ہیں۔ بیٹا ایک ہی ہے۔ جس کی عمر ابھی آٹھ سال ہے۔ مَیں تو ایک بیٹی کو بیاہنے کے قابل نہیں کہاں میری چھ بیٹیاں؟ میرے اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ کوئی تم جیسا مل جائے جو کسی قسم کا مطالبہ نہ کرے۔ اس طرح میری ایک بیٹی تو بیاہی جائے گی۔ عرفانہ چوبیس سال کی ہو گئی ہے۔ مَیں کب تک اُسے گھر بٹھائے رکھوں گا؟ عرفانہ کے بعد دو اور لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی باپ کی خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ بچی جہاں جائے سکھی رہے۔ یہی ڈر لگتا ہے کہ تمہاری پہلی بیوی موجود ہے۔ میری بیٹی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔"

افضل نے اُسے تسلی دلاسہ دیا لیکن در پردہ جو تسلیاں راشدہ عرفانہ کی ماں کو دے چکی تھی۔ وہ کام کر گئیں اور ایک روز نہایت خاموشی اور سادگی سے عرفانہ اور افضل کی شادی ہو گئی۔ افضل نے مجھے بتایا کہ راشدہ کو اُس نے اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ افضل نے ایسی کوئی حرکت نہ کی جس سے راشدہ کو یہ شک ہوتا کہ افضل اب عرفانہ ہی

کا ہو کر رہ گیا ہے۔

ابھی بیس روز ہی بمشکل گزرے ہوں گے کہ افضل کے دفتر میں سول کورٹ کا سمن آ گیا۔ راشدہ کے باپ نے افضل کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ اُس نے بیوی کی اجازت لیے بغیر اور عائلی قوانین میں دیئے ہوئے قانونی طریقے کے خلاف دوسری شادی کر لی ہے۔ افضل نے سمن کی تعمیل کی اور مقررہ تاریخ پر عدالت میں چلا گیا۔ اُس نے ایک وکیل کر لیا۔ جیسا کہ دیوانی عدالتوں میں ہوتا ہے۔ پانچ چھ مہینے تو ابتدائی اور رسمی کارروائیوں ہی میں گزر گئے۔ پھر ایک روز راشدہ کے باپ کی گواہی ہوئی۔

افضل کے وکیل نے اُس پر جرح کی۔ اس جرح میں اس نے صرف اِس نکتے کو سامنے رکھا کہ اس شخص نے ایک خوبصورت لڑکی افضل کو دکھا کر اپنی بدصورت بیٹی کے ساتھ بیاہ دیا۔ وکیل نے راشدہ کے باپ کی یہ حالت کر دی کہ اُس کی زبان ہکلانے لگی۔ وکیل نے عدالت سے درخواست کی کہ یہ کیس آگے چلنا ہی نہیں چاہیے۔ راشدہ کو عدالت میں طلب کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری شادی پر راضی ہے یا راضی ہے۔

راشدہ کے باپ کے وکیل نے افضل کے وکیل کا یہ مؤقف نامنظور کروا لیا اور عدالت کا یہ حکم نامہ لے لیا کہ وہ اپنے تمام گواہ پہلے پیش کرے گا اس طرح مقدمہ لٹکتا چلا گیا۔ کبھی ایک آدھ گواہی ہو جاتی۔ کبھی صرف تاریخ مل جاتی۔ ڈیڑھ پونے دو سال بعد راشدہ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔

راشدہ نے جو بیان دیا وہ بہت ہی طویل تھا حالانکہ افضل کے وکیل نے اُسے ایک مختصر بیان بتایا تھا۔ افضل نے مجھے بتایا کہ کورٹ میں کھڑے ہو کر راشدہ کی حالت بدلنی تھی کہ جیسے وہ آگ کا ایک شعلہ ہے اور جو بھی اُس کے قریب گیا وہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

راشدہ نے اپنے ماں باپ کو خوب ننگا کیا اور کہا کہ اُس کی ایک خوبصورت سہیلی کو

اس دھوکہ میں استعمال کیا گیا۔ اُس نے رشتہ کروانے والی مائی کا نام بھی لیا۔ اُس نے عدالت کو بتایا کہ اُسے اپنے ماں باپ سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ شادی کے بعد اُس نے اپنے ماں باپ کی صورت اس عدالت میں دیکھی ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے بتایا کہ افضل نے کس طرح اُسے اپنی پناہ میں لیا اور کبھی فریب کاری طعنہ تک نہیں دیا بلکہ بیوی کے پورے حقوق دیے۔ راشدہ نے کہا کہ قانون پہلی بیوی کی اجازت کی بات کرتا ہے میں نے اپنے خاوند کی شادی اپنے ہاتھوں کروائی ہے۔

اس طرح احتجاجی اور جوشیلے انداز میں بیان دے کر راشدہ نے عدالت میں سناٹا طاری کر دیا۔ کیس تو یہیں پر ختم ہو گیا تھا۔ لیکن افضل کے وکیل نے مکمل شہادت پیش کرنا بہتر سمجھا۔ مائی کو پیش کیا گیا۔ عرفانہ بھی گواہی دینے آئی اور محلّے کے تین اور آدمیوں کی گواہی ہوئی۔ آخر عدالت نے افضل کو بری کر دیا۔

آہ، ذات انسان کی

ہمارا کُنبہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ مجھ سے بڑی ایک بہن تھی۔ جس کی اُس وقت عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا جو شاید چھ سات سال کا تھا۔ میرا باپ گاؤں کے ان لوگوں میں سے تھا جو دیہات میں امیر کبیر زمینداروں اور گاؤں کے چوہدریوں کی خدمت اور غلامی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میرا باپ ایک جاگیردار کا خاص آدمی تھا۔ خاص آدمی کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی چار سو بیسی اور فراڈ میرے باپ کے ہاتھوں کرایا جاتا تھا۔ اس طرح میرا باپ بہت چالاک اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ ہمیں اُسی جاگیردار کے گھر سے کھانا دانہ ملتا تھا۔ یہ جاگیردار بہت بڑا جاگیردار نہیں تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں اونچے درجے کا زمیندار تھا۔ لیکن پکّا بدمعاش اور بے ایمان آدمی تھا۔ اُس سے کسی کی بہو بیٹی کی عزّت محفوظ نہیں تھی۔ اُسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ اکثر شراب پیتا اور ان کی عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا۔

۱۹۴۷ء میں ایسا انقلاب آیا کہ میرا پورا کُنبہ مشرقی پنجاب کے جہنّم سے صاف بچ نکل آیا اور اس جاگیردار کا سارا خاندان مارا گیا۔ سکھوں نے اس کا چوبارہ جلا ڈالا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دو تین سکھ عورتوں کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی اور سکھ اس کے ذاتی دشمن بن گئے تھے۔ اُنہوں نے اس شخص سے پورا پورا انتقام لیا۔

میرا باپ بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے جو اُستادی ان بڑے چوہدریوں

سے سیکھی تھی۔ وہ اُس نے پاکستان میں آکر استعمال کی۔ اس کے نتیجے میں اُس نے ایک قصبے میں کسی ہندو کا چھوڑا ہوا خاصا بڑا مکان جو دو منزلہ تھا، اپنے نام الاٹ کروالیا۔ اس کے علاوہ قصبے کے بازار میں اُس نے دو دُکانیں بھی الاٹ کروا لیں جو بعد میں کرائے پر دے دیں۔ اس مکان میں گھر کا تمام سامان اور فرنیچر وغیرہ موجود تھا۔ یہ کسی امیر ہندو کا مکان تھا جو سب کچھ چھوڑ کر اپنے کنبے کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔

ہم نے اِس قسم کا مکان اور اس قسم کا فرنیچر وغیرہ دیکھا ضرور تھا لیکن یہ ہمارے مالکوں کے گھروں میں ہوتا تھا۔ جس کی ہم صرف جھاڑ پونچھ کیا کرتے تھے۔ اِسے استعمال کرنے کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ ایسے گھروں میں ہم جوتیاں باہر اُتار کر اندر قدم رکھتے تھے۔

خدا نے ہمیں اس سے زیادہ اچھا سامان بمعہ چوبارہ دے دیا۔ لیکن خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہمارا دماغ خراب ہوگیا۔ صاف بات یہ ہے کہ ہماری ذات اُن ذاتوں میں سے ایک تھی۔ جنہیں آج اسلامی ملک میں بھی "کمین ذات" کہا جاتا ہے۔ میرے باپ نے کریانے کی دُکان کھول لی تھی۔ اُسے چاہیے تھا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو سکول داخل کروا دیتا۔ اس کے بجائے اُس نے ہم دونوں کو دکانداری پر لگا دیا۔ کاغذوں میں میرے باپ نے اپنی ذات کچھ اور لکھوا دی۔ مَیں اس ذات کا نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ کئی لوگوں نے یہی ذات اپنے ناموں کے ساتھ جوڑ لی ہے۔

سب سے زیادہ دماغ میری بہن کا خراب ہوا۔ خدا نے اُسے شکل وصورت اور جسم اتنا اچھا دیا تھا کہ اچھے کپڑے پہن کر وہ جاگیرداروں کی بیٹی لگتی تھی۔ اس کا رنگ بھی گورا تھا۔ جب شہر میں آکر اچھا مکان، کھانے پینے اور پہننے کو امیروں جیسا ملنے لگا۔ تو اُس کی خوبصورتی اور زیادہ نکھر آئی۔ ایک تو اتنے امیرانہ مکان اور سامان نے اُس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ دوسرا اُس کا حُسن اُس کے دماغ پر سوار ہوگیا۔

محلے کے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں اُس کے پاس آتی تھیں۔ مَیں نے خود کئی بار دیکھا کہ وہ لڑکیاں بڑی سلجھی ہوئی باتیں کرتی تھیں۔ وہ ہمیں بڑے اُونچے خاندان کے فرد سمجھتی تھیں۔ میری بہن یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ واقعی اونچے خاندان کی لڑکی ہے ایسی حرکتیں کرتی تھی جو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بلکہ وہ مذاق بن جاتی تھی۔ ہمارے پاس اگر امیری تھی تو صرف یہ کہ ہمیں دو منزلہ مکان مل گیا تھا اور اس میں امیرانہ سامان موجود تھا۔ آمدنی کے لحاظ سے اگر ہم غریب نہیں تو امیر بھی نہیں تھے۔ عزت سے گزارہ چل رہا تھا لیکن میری بہن یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہم بہت امیر لوگ ہیں۔ اپنی اصل ذات کو چھپانے کے لیے وہ جعلی ذات ہر کسی کو بتاتی تھی۔ زیادہ تر وقت سنگھار میز کے بڑے شیشے کے سامنے بیٹھ کر گزارتی اور میک اپ کیے رکھتی تھی۔

میک اَپ کرتے رہنا اور بالوں کی مختلف شکلیں بناتے رہنا اس پر ایک نشے کی طرح سوار ہوگیا تھا۔ ہماری ماں نے غربت کا وقت دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں رہتی اور گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھی۔ وہ میری بہن کو بھی گھر کے کام کاج میں لگانے کی کوشش کرتی۔ لیکن میری بہن کہتی کہ برتن مانجھنے اور جھاڑو وغیرہ کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری بہن اپنے آپ کو شہزادی سمجھتی تھی۔ میرا باپ بھی بیٹی کی ان حرکتوں سے پریشان رہنے لگا تھا۔

میری بہن دوسرے گھروں میں جاتی رہتی تھی۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ وہاں بھی وہ شوبازی ہی کرتی رہتی تھی۔

ہمیں خطرہ یہ نظر آرہا تھا کہ اس قسم کی لڑکیاں بڑی جلدی خراب ہوجایا کرتی ہیں۔ لیکن ہماری بہن کی کہیں سے بھی کوئی شکایت نہ ملی۔ اس کی بجائے یہ پتہ چلا کہ محلّے کے ۔۔ لڑکوں نے میری بہن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن میری بہن نے ۔۔ نوں کو دھتکار دیا تھا۔ وہ دراصل کسی کو پلے باندھتی ہی نہیں تھی۔

میرے والدین کو مشکل اُس وقت پیش آئی۔ جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کی شادی کر دینی چاہیے۔ ساتھ والے محلے میں ہمارے گاؤں کا ایک خاندان آکر آباد ہوا

تھا۔ اُس کی ذات وہی تھی جو ہماری اصلی ذات تھی۔ انہیں بھی مکان مل گیا تھا اور وہ بھی رئیس ہو گئے تھے۔ وہ لوگ اپنے بیٹے کے لیے میری بہن کا رشتہ مانگنے آئے۔ میری ماں نے فوراً ہاں کر دی۔ میرا باپ بھی رضامند تھا۔ لیکن بہن نے اُن لوگوں کے جاتے ہی طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ مَیں اتنی گھٹیا ذات کے لوگوں میں نہیں جاؤں گی۔ ماں اسے کہتی تھی کہ ہم بھی اسی گھٹیا ذات کے لوگ ہیں۔ لیکن میری بہن نہیں مان رہی تھی۔ میرا باپ جو مشرقی پنجاب کے اپنے گاؤں میں چار سو بیسی اور بدمعاشی میں مشہور تھا، ادھر آ کر بالکل سیدھا ہو گیا۔ اُس نے آخری چار سو بیسی یہی کی کہ دو منزلہ مکان اور دُکانیں الاٹ کروالیں اور کاغذوں میں اپنی ذات بدل لی تھی۔

وہ بیٹی کی اس ضد پر بہت پریشان ہوا۔ اپنی عزت کی خاطر ہمیں یہ رشتہ منسوخ کرنا پڑا۔ تین چار مہینے بعد ایک اور اچھے گھر سے رشتے کا پیغام آیا۔ میری بہن نے کہا کہ وہ لڑکے کو دیکھے بغیر ہاں نہیں کرے گی۔ باپ نے اُس پر سختی کی اور دو تین تھپڑ بھی لگا دیے لیکن میری بہن نے یہ رشتہ بھی بھگا دیا۔

ایک عورت کبھی کبھی ہمارے گھر میں آتی تھی۔ وہ رشتے کرانے کا کام بھی کرتی تھی اور اس کی کہیں نوکری بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ میری ماں کے ساتھ گپ شپ لگاتی اور میری بہن کے ساتھ علیحدگی میں کھُسر پھُسر کرتی۔ یہ عورت بدمعاش نہیں لگتی تھی بلکہ میری ماں اُسے پسند کرتی تھی۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے اس عورت سے کہا ہے کہ ہماری بیٹی کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر دے۔ اُس وقت میری بہن کی عمر اکیس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔

ایک صبح ہم سو کر اُٹھے تو بہن کو غائب پایا، تمام کمروں میں دیکھا، وہ کہیں نہ ملی۔ اگلی رات تک بھی وہ نہ آئی تو میری ماں کہنے لگی کہ تھانے اطلاع دی جائے۔ میرے باپ نے کہا کہ تھانے والے کیا کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ جوان اور بالغ لڑکی ہے، اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔ وہ دوسری بات یہ کہیں گے کہ کسی پر شک ہے یا کسی کے ساتھ دشمنی ہے تو وہ بتاؤ۔ ہم کیا بتائیں گے؟ تھانے والوں کو یہ پتہ

چل جائے گا کہ لڑکی کی عادتیں کیسی تھیں۔ بہتر ہے کہ چپ رہا جائے۔ اگر اُسے آنا ہوا تو خجل خراب ہو کر آ جائے گی۔

میری ماں کو شک تھا کہ رشتہ کرانے والی جو عورت ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ میری بہن اس کے ذریعے گھر سے بھاگی ہے، لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ عورت بدستور ہمارے گھر آتی رہی۔ وہ قسمیں کھا کر کہتی کہ اُسے میری بہن کے بھاگ جانے کا کچھ علم نہیں۔ ہم رو دھو کر چُپ ہو گئے۔

تین چار مہینوں بعد میری ماں کے پیٹ میں درد اُٹھا اور تیسرے دن وہ مر گئی۔ پتہ ہی نہ چلا کہ اُسے کیا بیماری تھی۔ میرے باپ کو بیٹی کا ہی بہت غم تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری ماں کا صدمہ ایسا پڑا کہ باپ بھی چارپائی سے لگ گیا۔ کچھ دنوں بعد اُس نے دکان بھی چھوڑ دی۔ کوئی ڈاکٹر اور حکیم نہ چھوڑا لیکن صدمے کا علاج کون کر سکتا تھا۔ ایک اور مہینہ گزرا تو باپ بھی چل بسا۔

ہم دو بھائی بے آسرا رہ گئے۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور چھوٹا بھائی تیرہ چودہ سال کا تھا۔ چھوٹا بھائی کچھ آوارہ ہو گیا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ باپ بھی سر سے اُٹھ گیا ہے تو اُس نے دکان پر بیٹھنا کم کر دیا، بالآخر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور دُکان کو نقصان پہنچانے لگا۔

ادھر ہم پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ میرا ایک تایا اور ایک چچا معلوم نہیں کہاں سے جاگ پڑے۔ ایک روز وہ دونوں آئے اور کہنے لگے کہ تمہارے باپ نے یہ جو مکان اور دُکانیں الاٹ کروائی تھیں۔ ہم تینوں بھائیوں کے نام ہیں۔ مَیں نے کہا کہ میرے والدین کی زندگی میں تو انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا باپ بڑا بدمعاش آدمی تھا ہم اس سے ڈرتے ادھر نہیں آتے تھے۔ اب ہم اپنا حصّہ لینے آئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا چکر چلایا کہ پولیس کو ساتھ لا کر مجھے مکان سے بیدخل کرا دیا۔ مَیں کورا اَن پڑھ تھا۔ اگر باپ نے کچھ پڑھایا لکھایا ہوتا تو مَیں

کہیں عرضی پر چہ دائر کر کے اپنا حق مضبوط کر لیتا۔ انہوں نے مجھ پر یہ مہربانی کی کہ دو کمروں کا ایک معمولی سا مکان مجھے دے دیا اور کہا کہ دکان کا مال تقسیم ہو گا اور مجھے اپنا حصّہ مل جائے گا۔ مَیں آپ کو لمبی بات کیا سناؤں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس ملک میں کس طرح بے انصافی ہوتی ہے۔ پانچ چھ ماہ کے اندر میرے مُردہ باپ کے ان بھائیوں نے مجھے کنگال کر دیا اور مجھے اپنا نوکر بنا لیا۔ دکان پر بھی ان کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔

میں تو پہلے ہی غموں اور صدموں کا مارا ہوا تھا۔ بہن معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ ماں باپ بھی نہ رہے اور ایک روز پتہ چلا کہ چھوٹا بھائی چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے اور حوالات میں ہے۔ مَیں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُسے ایک روز گرفتار ہونا ہی تھا۔

میرے دماغ پر ان صدمات کا ایسا اثر ہوا کہ میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی ایسے محسوس ہوتا تھا کہ مَیں ہوش میں بھی ہوں اور بے ہوش بھی۔ آنکھوں کے سامنے کبھی کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ پھر یوں بھی محسوس کہ مَیں چلتے چلتے کہیں پہنچ گیا تو مجھے ہوش آئی۔ مَیں سوچنے لگا کہ مَیں یہاں کس طرح پہنچا ہوں۔ ایسے ہی ایک مرتبہ مَیں اسی بے ہوشی کے عالم میں قصبے سے باہر نکل گیا۔ جب مَیں اپنے آپ میں آیا تو میں ایک گاؤں میں پہنچا ہوا تھا۔ دو تین آدمی میرے پاس کھڑے تھے۔ اُنہوں نے باہر ہی بٹھا لیا۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ مَیں کہاں ہوں۔ انہوں نے جب مجھے بتایا تو مَیں نے اندازہ کیا کہ مَیں اپنے گھر سے بارہ تیرہ میل دُور نکل آیا ہوں۔

گاؤں کے اور بھی بہت سے آدمی میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ میرے آنسو بہنے لگے۔ وہ سب اچھے لوگ تھے۔ اُنہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ مَیں نے انہیں وہ سب کہانی سُنا دی جو مجھ پر گزری تھی۔ مَیں نے انہیں اپنا یہ فیصلہ بھی سُنایا کہ میں اب واپس نہیں جاؤں گا۔ وہاں اب میرے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔

گاؤں والوں کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان میں دو تین آدمی بڑے سیانے معلوم ہوتے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ مجھے واپس نہیں جانا چاہیے۔ گاؤں کے مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اگر یہیں رہنا چاہتا ہے۔ تو اسے مَیں مسجد میں رکھ لوں گا۔

مجھے یہ بات بہت پسند آئی۔ مَیں خود بھی سوچ رہا تھا کہ باقی عمر خدا کی یاد میں گزار دوں۔ مَیں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں ان کے ساتھ مسجد میں رہوں گا۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلے رہتے تھے۔

مَیں نے مسجد کی خدمت شروع کر دی۔ میں مسجد میں جھاڑو دیتا تھا اور وضو کے لیے پانی بھر دیتا تھا۔ پھر مَیں نے میّتوں کو غسل دینے کا کام بھی شروع کر دیا۔ مَیں دراصل گاؤں میں ہی جنا پلا تھا۔ مَیں اپنی اصلیّت میں واپس آ گیا تو مجھے سکون مل گیا مَیں ہر طرح خوش رہنے لگا۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ وہ میری شادی کرا دیں گے۔ مَیں اللہ کی عبادت اور مسجد کی خدمت میں اتنا ڈوب گیا تھا کہ میں نے شادی کرنے کی کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔

مسجد کی خدمت کرتے تین سال گزر گئے۔ مَیں ہر طرح خوش تھا۔

اس گاؤں میں دو تین اونچے خاندان بھی رہتے تھے۔ ایک روز ان میں سے ایک گھر کے بڑے چوہدری نے مجھے اپنے ہاں بلایا اور کہا کہ دس گیارہ میل دُور ایک گاؤں میں ایک پیغام لے کر جانا اور اس کا جواب وہاں سے لے کر آنا ہے۔ اُس نے مجھے پیغام دیا اور اپنی گھوڑی بھی دے دی۔ مَیں اُسی وقت روانہ ہو گیا۔

مَیں جب اس گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں کے باہر ہی سبزیوں کا ایک باغیچہ نظر آیا۔ جس کے گرد جھاڑیوں اور سبزے کی باڑ لگائی گئی تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ مَیں اس باڑ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ باغیچے میں مجھے ایک جوان عورت ٹہلتی نظر آئی۔ اس کی شکل میری بہن سے ملتی جلتی تھی۔ وہ میری بہن نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ کسی بڑے جاگیردار کی بیٹی نظر آتی تھی۔ اُس نے بڑے قیمتی کپڑے اور زیور پہن رکھے تھے۔ مَیں اس کی طرف دیکھتا رہا اور گھوڑی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ اس عورت نے جب میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو میری بہن ہی ہے۔

مَیں نے گھوڑی روکی، کُود کر اترا اور بھاگتا ہوا باڑے کے اندر چلا گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ میرے ساتھ لپٹ جائے گی۔ لیکن مَیں اُس کے قریب پہنچا تو وہ یوں کھڑی مجھے دیکھتی رہی جیسے مَیں اُس کا نوکر ہوں اور وہ ابھی مجھے کہے گی کہ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

"تم بشیراں ہو؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا اور کہا۔ "مجھے پہچانا نہیں۔ مَیں تمہارا بھائی رشید ہوں۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُس نے بے رُخی سے پوچھا۔

مَیں نے دیہاتیوں کی طرح کھدر کی چادر اور کُرتا پہن رکھا تھا۔ میرے سر پر ململ کا صافہ اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ میری بہن کو میرا یہ حلیہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مَیں نے اُس کے پوچھے بغیر اُسے سنایا کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔ اور مَیں کس حالت میں ایک گاؤں میں پہنچا تھا اور تین سال سے ایک مسجد اور اس کے مولوی صاحب کی خدمت کر رہا ہوں۔ مَیں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں سب کو اپنی اصلی ذات بتایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" مَیں نے پوچھا: "یہاں تک تم کس طرح پہنچی تھیں؟"

اُس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جو دو منزلہ اور بہت عالیشان تھا۔ کہنے لگی۔ "وہ میرا گھر ہے۔ مَیں یہاں کے سب سے بڑے زمیندار کی بیوی ہوں۔ مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ مَیں یہاں تک کس طرح پہنچی تھی۔"

اتنے میں تین چار سال کی عمر کا ایک بڑا خوبصورت بچہ دوڑتا ہوا میری بہن کے پاس

آن کھڑا ہوا اور مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ میرا پہلا بچہ ہے۔" میری بہن نے کہا لیکن اُس نے کوئی خوشی کا اظہار نہ کیا۔

مَیں بچے کو اُٹھانے اور پیار کرنے کے لیے بازو پھیلا کر آگے بڑھا تو میری بہن لے آگے ہو کر مجھے روک دیا۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں ایک ایسی بات کہہ دی جیسے اس نے میرے دل میں چاقو اتار دیا ہو۔

"مَیں اس بچے کو یہ نہیں بتانا چاہتی کہ تم اس کے ماموں ہو۔"

مَیں نے بہت صدمے برداشت کیے تھے۔ لیکن اپنی بہن کے یہ الفاظ برداشت نہ کر سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں نے محسوس کیا تھا کہ اُس وقت تک بہن نے میرے ساتھ اس طرح باتیں کیں۔ جیسے وہ میرے ساتھ بولنا نہیں چاہتی۔ وہ مجھ پر اپنا رعب جما رہی تھی۔ مَیں سمجھ گیا کہ اس کی شوبازی والی عادت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

مَیں نے اُسے بتایا کہ یہاں کے فلاں چوہدری کے لیے ایک پیغام لایا ہوں۔

"جاؤ" اُس نے کہا۔ "اپنا کام کرو اور واپس چلے جاؤ۔"

"مَیں نے تو کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ میں نے کہا: "تمہاری یہ بات سُن کر کہ تم یہاں کے سب سے بڑے چوہدری کی بیوی ہو۔ مَیں نے یہ سوچا تھا کہ مَیں تمہارے ہاں نوکر بن کر تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھے تو یہ بھی خیال آیا تھا کہ میں جب یہ کہوں گا کہ میں تمہارا نوکر بن کر رہوں گا تو تم کہو گی کہ تم میرے بھائی ہو۔ مَیں تمہیں بھائیوں کی طرح رکھوں گی۔ نوکر بنا کر کیوں رکھوں۔"

"مَیں تمہیں یہاں کسی صورت نہیں رکھ سکتی۔" اُس نے کہا۔

"کیوں" مَیں نے پوچھا: "تم پر کوئی پابندی ہے۔"

"مجھ پر کون پابندی عائد کر سکتا ہے۔" اُس نے کہا: "یہاں میرا حکم چلتا ہے۔

مَیں یہاں کی ملکہ ہُوں۔"

"پھر مَیں تمہارے پاس کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔" اُس نے کہا۔ "اگر تم میرے بھائی ہو اور تمہارے دل میں میری محبت ہے تو مجھ پر یہ مہربانی کرو کہ یہاں کسی کو نہ بتانا کہ مَیں تمہاری بہن ہوں۔ مَیں نے یہاں اپنی وہ اونچی ذات بتا رکھی ہے۔ جو ہم نے کاغذوں میں لکھوائی تھی۔ میرے خاوند نے یہاں سب کو یہ بتا رکھا ہے کہ میں شہر کے ایک امیر کبیر گھرانے کی ایک لڑکی ہوں۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ ہم مہاجر ہیں اور ہماری اصلیت کیا ہے۔ اگر تم میرے پاس رہے۔ تو ایک نہ ایک روز پردہ اُٹھ جائے گا۔ اس میں میری اور میرے خاوند کی بے عزّتی ہوگی۔ زیادہ دیر یہاں نہ رُکو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس سے زیادہ وہ مجھے اور کیا کہتی۔ مَیں اگر رُکا رہتا تو وہ اپنے مالی یا نوکر کو بلا کر کہتی کہ اس کو دھکّے مار کر باہر نکال دو۔ مَیں نے اُس کے بچے کو بڑے پیار اور غور سے دیکھا اور وہاں سے چل دیا۔ ایک دو قدم اُٹھا کر مَیں رُک گیا اور پیچھے مڑ کر اپنی بہن سے کہا: "اِن دو منزلہ حویلیوں والے زمینداروں کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے۔ مَیں نے تمہیں اپنا گاؤں بتا دیا ہے۔ مجھے بُلا لینا۔"

وہاں سے مَیں اس گھر گیا۔ جہاں پیغام دینا تھا۔ پیغام دیا۔ وہ بھی کوئی زمیندار تھا۔ اس نے اپنے نوکر سے کہا کہ مجھے کھانا کھلائے۔ مَیں نوکر کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔ مَیں نے کھانے کے دوران اس نوکر سے اپنی بہن کے متعلق پوچھا اُسے یہ نہ بتایا کہ مَیں اس کا بھائی ہوں۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ نوکر چاکر اور مزارعے اپنے مالکوں کا پردہ نہیں رہنے دیا کرتے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی اس چوہدری نے شہر سے نکلوائی تھی۔" نوکر نے مجھے بتایا: "تم نے دیکھا یہ کتنی خوبصورت عورت ہے۔ یہ اس چوہدری کا شغل ہے۔

اس کے آدمی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ کسی خوبصورت لڑکی کو ورغلانے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اس لڑکی کو بتا دیتے ہیں کہ اس کی شادی جاگیردار کے ساتھ کرائی جائے گی۔ اُسے کسی دھوکے میں نہیں رکھتے۔ چوہدری بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے وہ ایسی دو لڑکیاں گھروں سے نکلوا کر اُن کے ساتھ شادی کر چکا ہے۔ اُن دونوں کی جوانی اور خوبصورتی ڈھل گئی ہے۔ اب یہ تیسری ہے جو اس نے ورغلا کر گھر سے نکلوائی ہے۔ سُنا ہے کسی امیر اور اونچی ذات کے خاندان کی لڑکی ہے، لیکن ہے وہی شوباز ہر کسی پر حکم چلاتی ہے۔ چوہدری کی سب سے پہلی بیوی بھی زندہ ہے، جس کے ساتھ اس نے باقاعدہ برادری سے رشتہ مانگ کر شادی کی تھی۔ جس روز چوہدری کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پہلی بیوی باقی تینوں بیویوں کو چلتا کرے گی۔

میری حالت بہت بُری ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ مَیں پھر پاگل ہو جاؤں گا۔ میری بہن نے جس طرح مجھے دھتکارا تھا۔ وہ کون سا بھائی برداشت کر سکتا ہے۔

مَیں کھانا کھا کے وہاں سے چل پڑا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ وہ عورت جو رشتہ کرانے کا کام کرتی اور ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی۔ میری بہن کو اُسی نے ورغلایا اور اس کے ہاں تک پہنچایا ہوگا۔ کبھی مجھے خوشی ہوتی کہ میری بہن کسی اور غلط جگہ نہیں پہنچ گئی۔ کبھی وہ ساری عمر خراب ہوتی رہتی، لیکن مجھے جب نوکر کی بات یاد آتی تو میں سوچتا کہ میری بہن کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

دو سال بعد میری بہن اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ یہ مجھے اس طرح پتہ چلا کہ رات بہت گزر گئی تھی۔ مَیں مسجد کے صحن میں سویا ہوا تھا۔ کوئی دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہوا اور سیدھا میرے پاس آیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ وہ پانچ چھ سال کا بچہ تھا۔ جو میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ مَیں ڈر گیا کہ یہ کون ہے۔ مَیں نے اُسے تسلی دی اور پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ چار پانچ دن ہوئے اُسے اُس کے گاؤں سے اغوا کیا گیا تھا اور اس کی آنکھیں باندھ کر یہاں لے آئے تھے۔ انہوں نے اسے ایک کمرے میں بند رکھا اور اُسے کھانے پینے کے لیے دیتے رہے۔

"آج رات اس کمرے کی کنڈی کھلی رہ گئی۔" بچے نے مجھے بتایا۔ "مَیں کمرے سے نکلا۔ صحن میں دو تین آدمی سوئے ہوئے تھے اور باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ مَیں جب باہر والے دروازے سے نکلنے لگا تو ایک آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ میرے پیچھے دوڑا۔ باقی دو آدمی بھی میرے تعاقب میں آئے۔ آگے یہ مسجد دیکھی تو میں ادھر آگیا ہوں۔۔۔۔ مجھے ان سے بچاؤ اور مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔"

مَیں نے اس سے اُس کے گاؤں اور باپ کا نام پوچھا۔ اس کا جواب سُن کر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا مارا ہو۔ وہ میری بہن کا بیٹا تھا۔

اتنے میں تین آدمی مسجد کے دروازے میں آن کھڑے ہوئے۔ ایک نے وہیں سے للکار کر کہا کہ بچّہ ہمارے حوالے کر دو۔ مَیں نے انہیں کہا کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ بچّہ میرے پاس نہیں یہ خدا کے گھر میں آیا ہے۔ انہوں نے مجھے دھمکیاں دیں۔ یہ بچّہ آخر میرا بھانجا تھا۔ مَیں مرنے مارنے پر اُتر آیا۔ مَیں نے انہیں کہا کہ تم میں سے کوئی بھی مسجد کے اندر آیا تو مَیں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مَیں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مولوی صاحب اور بڑے چوہدری صاحب کو ساتھ لے آؤ تو میں بچہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بچے کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ ان لوگوں میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ کسی مقابلے میں ٹھہر سکیں۔ ہماری آوازوں پر کوئی آدمی جاگ اُٹھا اور وہ مسجد میں آگیا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ یہ لوگ کسی کا بچّہ اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اور بچہ بھاگ کر مسجد میں آگیا ہے۔ اس آدمی نے دو اور آدمی بلا لیے۔ اسی وقت تینوں آدمی بھاگ گئے۔ مَیں نے بچے کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھا اور اسے بتایا کہ میں اس کا ماموں ہوں۔ بچے کو تھپکیاں دے کر سُلا دیا۔

صبح یہ معاملہ بڑے چوہدری تک پہنچا۔ بچّے کو وہ گھر یاد تھا۔ جہاں اسے قید رکھا گیا تھا۔ اس نے وہ مکان دکھا دیا۔ وہاں ایک بدمعاش قسم کا آدمی رہتا تھا۔ چوہدری نے اسے پکڑ لیا اور دو آدمیوں سے کہا کہ اُسے الٹا لٹکا کر جوتے مارو۔ پٹائی کے دوران

اس آدمی نے بتایا کہ میری بہن کے گاؤں کے دو آدمی اس بچے کو ایک رات لائے تھے اور وہ کہتے تھے کہ بچے کو ایک رات یہاں رکھنا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے اسے قتل کر کے لاش غائب کرنی پڑے۔

"بچے کو اغوا کرنے کی وجہ یہ ہے۔" اُس نے کہا کہ اس کا باپ جو فلاں گاؤں کا بہت بڑا زمیندار تھا مر گیا ہے۔ اُس کی پہلی بیوی نے باقی تین بیویوں سے کہا کہ وہ سب وہاں سے چلی جائیں اور جائداد میں حصّے کی اُمید نہ رکھیں۔ وہ تو بے اولاد تھیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جائداد میں سے حصّہ نہیں مانگیں گی اور جس روز ان کا کوئی ٹھکانہ بن گیا چلی جائیں گی، لیکن اس بچے کی ماں جو سب سے چھوٹی اور نئی ہے، اڑ گئی۔ اُس نے کہا کہ میں اپنے بچے کا پورا حصّہ لوں گی۔ چوہدری کے پہلی بیوی کے جوان بیٹوں نے اس عورت سے کہا کہ وہ گاؤں سے نہ گئی تو اُس کے بچے کو غائب کر لیا جائے گا۔ پھر بھی وہ تین چار دن تک نہ گئی تو اس کے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ بچے کو میرے گھر میں لانے والے اُس گاؤں کے دو بدمعاش ہیں۔ انہوں نے بچّے کو اغوا کیا اور میرے گھر لا کر چھپا دیا۔ رات کو دروازہ کھلا رہ گیا تو بچّہ بھاگ نکلا۔"

چوہدری نے اُس کی اور پٹائی کروائی اور کہا کہ میرے گاؤں میں اغوا کے لیے بچے کو چھپایا گیا اور مجھے علم نہیں۔ تب مَیں نے چوہدری کو بتایا کہ یہ بچہ میرا بھانجا ہے۔

"دیکھ شیدے!" بڑے چوہدری نے کہا: "وہ اگر تیری بہن ہے تو اسے یہاں لے آ۔ اسے کوئی انصاف نہیں ملے گا۔ میں اس چوہدری کے بیٹوں اور ان کی ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہاری بہن اور اس بچے کو غائب کر دیں گے۔ یہ جائداد اور وراثت کا معاملہ ہے۔ اس میں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ تمہاری بہن کا اس خاندان سے کوئی خونی رشتہ نہیں۔ اُن کے خلاف تو پولیس بھی کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔"

مَیں نے بچے کو مولوی صاحب کے حوالے کیا اور اپنی بہن کے گاؤں چلا گیا
اُسے مَیں نے اس حالت میں دیکھا کہ وہ دو منزلہ حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھی
زار و قطار رو رہی تھی۔ اب اس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے ساتھ لپٹ گئی اور
بولی کہ ان لوگوں نے میرا بچہ مجھ سے چھین لیا ہے۔ مَیں نے اسے بتایا کہ بچہ
میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ اُسے ساری کہانی سنا دی۔

"تم میرے بچے کو اپنے پاس رکھو" میری بہن نے کہا۔ "میں ان لوگوں سے
جائداد کا حصہ لے کر یہاں سے نکلوں گی۔"

وہ نہیں مان رہی تھی۔ مَیں نے اُسے اُس کے بچے کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ
میرے ساتھ چلی آئے لیکن وہ وہاں سے ہل نہیں رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا
تھا۔ جیسے اُسے اپنا بچہ اتنا عزیز نہیں جتنی جائداد۔ مَیں اُسے سمجھانے کی کوشش
کر رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔ اتنے میں ایک بڑا خوبصورت جوان کمرے میں داخل
ہوا۔ وہ چوہدری کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔
مَیں نے اسے بتایا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔

"اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ اُس نے کہا۔" اگر نہیں لے جاؤ گے تو کل
صبح اس کی لاش لینے آجانا۔ اگر پولیس کو ساتھ لاؤ گے تو تم بھی یہاں سے زندہ
نہیں نکلو گے۔"

مَیں آخر اپنی بہن کو وہاں سے نکال لایا اور اسے اپنے گاؤں میں لے آیا۔
اس کے ساتھ اس کا ایک ٹرنک تھا جس میں اس کے زیورات اور کپڑے تھے۔
اتنی خوبصورت عورت کو دیکھ کر سب حیران ہوتے تھے۔ وہ میرے ساتھ غریبانہ سے
گھر میں رہنے لگی۔ اُسے یہ رہن سہن بالکل پسند نہ تھا۔ پندرہ بیس روز بعد میں نے
مولوی صاحب سے کہا کہ میری بہن کی شادی کا بندوبست کریں۔

چھ سات روز بعد مولوی صاحب نے مجھے بتایا کہ گاؤں میں اچھے گھرانوں کے
دو لڑکے موجود ہیں۔ جنہیں رشتہ چاہیے لیکن دونوں کے باپوں نے ایک سا جواب دیا۔

[illegible] نے کہا کہ جو لڑکی یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک بوڑھے کی بیوی بننے جا رہی ہے
[illegible] سے نکل آئی تھی۔ اس پر کون اعتبار کرے گا۔ اس کے دل میں تو جائداد کا لالچ
[illegible]

"اصل وجہ یہ ہے رشید!" مولوی صاحب نے کہا: "تمہاری ذات کا سب
[illegible] علم ہے۔ تمہاری بہن اونچی ذات کے خاندان میں کس طرح جا سکتی ہے اگر وہ
[illegible] چھوٹی ذات کے آدمی کو قبول کرلے تو میں کل نکاح پڑھا دوں گا۔"

میں نے اپنی بہن سے بات کی تو اُس نے کہا۔ "میں لعنت بھیجتی ہوں چھوٹی
[illegible] باتوں پر۔ مجھے اپنے جیسا خاوند مل جائے گا۔"

مَیں خاموش ہو گیا۔ مَیں جتنی خدمت مسجد اور مولوی صاحب کی کرتا تھا، اس
سے زیادہ خدمت اپنی بہن کی کرنے لگا۔ مَیں نے اپنے آپ کو اس کا نوکر بنا دیا تھا۔
[illegible] گاؤں کے ہر گھر میں جاتی تھی اور اس طرح ہر گھر میں اس کی بے تکلفی پیدا ہو گئی۔

تقریباً دو ماہ گزرے، ایک صبح میں اُٹھا تو میری بہن اپنے بچے سمیت غائب
تھی۔ مَیں نے بھاگ دوڑ کر اور ادھر ادھر سے پوچھ کر یقین کر لیا کہ اُسے اور اُس
کے بچے کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح وہ اپنے ماں باپ
کے گھر سے نکلی تھی۔ اسی طرح میرے گھر سے نکل گئی۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے
اس کی صورت نہیں دیکھی۔

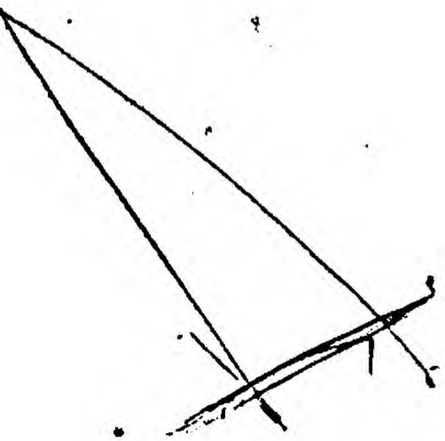

وہ غیرت مند کہلاتے ہیں

ایک دفعہ لاہور سے دُور ایک گاؤں میں رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔ دیہات کے لوگوں کی تفریح گپ بازی ہوتی ہے۔ شام کے وقت کہیں محفل جما لیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ تبادلۂ خیالات کیا کرتے ہیں۔ لیکن دیہات کے لوگ تبادلۂ داستان کرتے ہیں۔ باری باری ہر آدمی ایک سُنی سنائی کہانی سناتا ہے۔ ان کہانیوں میں اکثر بالکل سچی ہوتی ہیں۔

اُس رات جب میں اس گاؤں کا مہمان تھا۔ میرے اعزاز میں میرے گرد اگرد محفل جم گئی۔ ٹرانسسٹروں کے ذریعے فلمی گانے اور سڑکیں بن جانے کی وجہ سے شہروں کی مغرب زدہ تہذیب دیہات میں پہنچ گئی ہے جس نے دیہات کی معصومیت کو ڈس لیا ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ہیں جنہوں نے دیہات کے روایتی خلوص اور معصومیت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ یہ بوڑھے لوگ ہیں جو اپنے سادہ اور ستھرے ماضی میں جی رہے ہیں۔

یہ محفل جو میرے اعزاز میں سج گئی تھی، یہ دیہات کا ایک رواج ہے جو ابھی تک قائم ہے۔ کسی گھر میں مہمان چلا جائے تو گاؤں کا ہر آدمی اُسے ملنا اور خیر خیریت پوچھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میرے متعلق ان لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ مَیں لاہور شہر سے آیا ہوں اور میرا تعلق اخباری دنیا کے ساتھ ہے۔ وہ احترام سے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے اور یوں جھجک کر بیٹھ جاتے جیسے مَیں پیروں فقیروں کے خاندان کا فرد ہوں۔

پہلے تو کچھ دیر کے لیے یہ محفل پریس کانفرنس بنی رہی۔ وہ مجھ سے سیاسی نوعیت کی باتیں پوچھتے تھے جو مجھے بھی معلوم نہیں تھیں۔ مَیں نے ہر سوال کا جواب اسی طرح

ٹال مول دیا۔ جس طرح سرکاری پریس کانفرنسوں میں اخباری نمائندوں کو جواب دیئے جاتے ہیں۔ میں نے گفتگو کی کاریگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور پریس کانفرنس کو گپ شپ کی محفل بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کہانیاں سُننے سُنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک آدمی نے خبر سُنائی کہ ساتھ والے گاؤں کی ایک لڑکی اغوا ہو گئی ہے۔ لیکن پتہ چلا ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی بلکہ اپنی مرضی سے ایک آدمی کے ساتھ نکل گئی ہے۔ یہاں سے لڑکیوں کے اغوا، ناجائز تعلقات اور اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ نکل جانے کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بوڑھا آدمی جو خاموش بیٹھا تھا، آخر بول پڑا۔

میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ انہیں صغراں کی کہانی سناؤ۔ بیک وقت چار پانچ آدمیوں نے بوڑھے کی تائید کی۔ ایک نے کہا کہ ایسی عورت کہاں پیدا ہو گی۔ جس نے اس دنیا میں اپنے گناہ بخشوا لیے ہیں۔ بوڑھے نے کہانی سنانی شروع کر دی۔ دوسرے کبھی اُس کی تائید کرتے کبھی تھوڑی سی تصحیح کر دیتے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کہانی بالکل سچی ہے۔ مَیں آپ کو یہ کہانی اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔

پندرہ سولہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ کہانی سنانے والے بوڑھے کے سسرال کے گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ پولیس میں اغوا کی رپورٹ درج کروائی گئی اور اُس آدمی پر شک کا اظہار کیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ لڑکی جس کا نام صغراں تھا۔ نکل گئی تھی۔ وہ آدمی تقریباً دس میل دور کے ایک گاؤں کا رہنے والا اونچے خاندان کا نوجوان آدمی تھا۔ اُس کا نام ہاشم تھا۔ ان دونوں دیہاتوں کا مشترک تھا۔ صغراں اور ہاشم کی ملاقات شاہ صاحب کے ڈیرے پر اور اُن کے لوگوں کے عرس پر ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے بھی دیکھا کہ لڑکی دو نوکرانیوں کو ساتھ لے کر مہینے میں دو تین دفعہ شاہ صاحب کے پاس جاتی تھی۔

نوکر چاکر اور وہ لوگ جنہیں دیہات میں اونچی ذاتوں والے کمین ذات کہا کرتے ہیں، اپنے پیٹ اور اپنے بال بچوں کے وفادار ہوتے ہیں۔ وہ کسی کا راز چھپا نہیں رہنے دیتے۔ اونچی ذاتوں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی محفل میں اِن کے خلاف بات کرنے کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا۔ بڑی ذات کا جو فرد شہر کے کسی سیاسی لیڈر کے ساتھ مل کر سیاست میں منہ مارنے لگے تو وہ اپنے آپ کو گاؤں کا وزیر اعظم جانتا لگتا ہے۔

کانوں کان یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ صغراں شاہ صاحب کے سلام کے بہانے کسی اور گاؤں کے ایک بڑے خوبصورت جوان سے ملتی ہے پھر اس جوان آدمی کا نام اور گاؤں کا پتہ بھی چل گیا۔ پھر ہاشم کو دو تین مرتبہ شام کے بعد صغراں کے گاؤں کے قریب بھی دیکھا گیا۔ لاہور جیسے شہر میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے اور لوگوں کی مصروفیات بھی اتنی ہوتی ہیں کہ ہر کسی کو اپنی غلط حرکتوں پر پردہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دیہات وہ حمام ہے۔ جس میں سب ننگے ہوتے ہیں۔ وہاں کا ماحول اور وہاں کی فضا ایسی ہے کہ کسی کی کوئی غلط حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ویسے بھی لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ دوسروں کی نقل و حرکت پر نظر جمائے رکھتے ہیں اور ہر آدمی پر جاسوسی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ صغراں اور ہاشم کی ملاقاتیں چھپی نہ رہ سکیں۔

ایک روز پتہ چلا کہ صغراں کو باپ نے مارا پیٹا ہے۔ اس سے تیسرے روز پتہ چلا کہ صغراں لاپتہ ہوگئی ہے۔ شام تک پولیس آگئی۔ تھانیدار نے صغراں کے باپ کی حویلی کی بیٹھک میں ڈیرے ڈال دیے اور ساری رات اس بیٹھک میں سے اُن دو تین نوکرانیوں کی چیخیں سُنائی دیتی رہیں۔ جنہیں صغراں اپنے ساتھ شاہ صاحب کے ڈیرے تک لے جاتی تھی۔ دوسرے دن پولیس ہاشم کے گاؤں چلی گئی۔ اس کے بعد پولیس صغراں کے گاؤں نہ آئی۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ صغراں کے باپ نے ہاشم پر شک ظاہر کیا تھا اور نوکرانیوں نے بھی بیان دیا تھا کہ صغراں ہاشم سے ملنے جایا کرتی تھی۔ پولیس ہاشم کے گاؤں میں گئی تو اس نے صغراں کو تھانیدار کے سامنے

کھڑا کر دیا۔ نکاح نامہ بھی پیش کر دیا۔ نکاح پڑھنے والے مولوی اور نکاح کے گواہوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ صغراں نے بیان دیا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے ہاشم کے ساتھ آئی ہے۔

ہاشم بھی اونچی ذات کا اور روپے پیسے والے زمینداروں کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ مر چکا تھا اور اب اپنے خاندان پر اُسی کی حکومت تھی۔ اپنی برادری کے ساتھ اُس نے اپنے تعلقات اتنے اچھے بنا رکھے تھے کہ ہر کوئی اس کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ کہانی سُنانے والے بوڑھے نے کہا کہ ایک تو لڑکی کا بیان کام کر گیا اور کچھ پیسہ چل گیا اور یہ بھی ہوا کہ ساری برادری ہاشم کی حمایت میں کھڑی ہو گئی۔ پولیس نے اپنا کام وہیں ختم کر دیا۔

دیہات میں اپنی عزت سے اتنی آسانی سے لوگ دست بردار نہیں ہوا کرتے غریب لوگ بھی نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتقامی کارروائیوں پر اُتر آتے ہیں اور باقی عمر جیلوں میں گزار دیتے ہیں۔ صغراں کا باپ برادری کے دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر ہاشم کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ ہماری عزت واپس کر دے، لیکن ہاشم کی پوری برادری اکٹھی ہو گئی۔ سب نے کہا کہ قانونی کارروائی ہو چکی ہے۔ اگر تم لوگ دھمکیاں اور رعب دینے آئے ہو تو اپنی لڑکی کو ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ صغراں کا باپ سمجھ گیا کہ یہاں دال نہیں گلے گی۔

ہاشم کی برادری میں آدمی بھی زیادہ تھے اور پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ دیہات میں یہی دو چیزیں طاقت کہلاتی ہیں۔ صغراں کا باپ خالی خولی دھمکیاں دے کر واپس آگیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بیٹی کا کبھی نام نہ لیا۔

"اب ہاشم کے گاؤں چلے چلو جہاں صغراں گئی تھی۔" محفل میں بیٹھتے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

"اب ہماری کہانی ہاشم کے گاؤں میں چلی جاتی ہے۔" کہانی سُنانے والے بوڑھے نے کہا، "ہمارے گاؤں کی رشتہ داریاں ہاشم کے گاؤں ہیں۔ وہاں

سے ہمیں صغراں کے متعلق پتہ چلتا رہا کہ اُس کا وقت کیسا رہا ہے۔"

ان لوگوں نے یہ کہانی آگے یوں سنائی کہ ہاشم نے صغراں کے ساتھ شادی کر لی۔ ہر کسی کو یہی توقع تھی کہ یہ جوڑا بہت خوش رہے گا۔ دیہات میں اپنی مرضی کی شادی کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں میں سے کوئی ایک لڑکی اپنے پسند کے آدمی کے ساتھ گھر سے نکل جانے کی جرأت کرتی ہے۔ لیکن لڑکی اور لڑکے کے خاندانوں میں خونی دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکی لڑکا اگر شادی کر بھی لیں تو ان کی تمام زندگی خوف و ہراس میں گزرتی ہے۔ صغراں اور ہاشم جیسا خوش قسمت جوڑا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اگر ہاشم کے ساتھ پیسہ اور اُس کے ساتھ برادری نہ ہوتی تو صغراں کو وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ کبھی نہ رکھ سکتا۔

لڑکی کسی گاؤں سے صغراں کی طرح نکل کر آئے اور اپنی مرضی کی شادی کر لے تو وہ گاؤں والوں کے لیے ایک عجوبہ اور تماشا بن جاتی ہے۔ صغراں کے گھر میں بھی عورتیں آتی جاتی رہتیں۔ کوئی اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے، کوئی اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی بے غیرت ہے۔ لیکن صغراں کو کسی کی پراہ نہیں تھی۔ اُسے اپنی پسند کا خاوند مل گیا تھا جو اپنی دُنیا کا بادشاہ تھا۔

ڈیڑھ ایک مہینے بعد ہی عورتوں نے دیکھا کہ صغراں اُداس اُداس نظر آنے لگی ہے۔ ایک آدھ مہینہ اور گزرا تو ایک دو عورتوں نے صغراں کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ گاؤں میں اپنی ہم عمر دو تین لڑکیوں کو اُس نے اپنی سہیلیاں بنا لیا تھا۔ اُن کی زبانی پتہ چلنے لگا کہ صغراں ہاشم کے ساتھ خوش نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے بعد راز کھل گیا کہ صغراں کا غم یہ تھا کہ ہاشم اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صغراں نے اپنی سہیلیوں کو بتایا کہ ہاشم نے اُسے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ سیانے کہتے ہیں کہ جو لڑکی تمہارے پیچھے گھر سے نکل آئے، اُس کے ساتھ شادی کر کے بھی اُس کا اعتبار نہ کرو، کیونکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی نکل کر جا سکتی ہے۔

ہاشم صغراں کو زیادہ باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار صغراں نے ہاشم سے کہا کہ وہ شاہ صاحب کے سلام کے لیے جانا چاہتی ہے۔ ہاشم نے اُسے کہا کہ تمہارے پاس بھی تم شاہ صاحب کے سلام کے بہانے آیا کرتی تھیں۔

یہ بوڑھا آدمی اور اُس محفل میں بیٹھے دو تین آدمی مجھے یہ واقعہ دلچسپ کہانی کی صورت میں سنا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسے واقعات کے پس منظر میں کیسے کیسے عناصر اور کیسی کیسی نفسیات کام کرتی ہے۔ ہاشم جوان تھا۔ اس کے پاس پیسہ تھا۔ اُسے برادری کی حمایت حاصل تھی اور اُس کے پُرشباب جذبات تھے۔ اِن عناصر نے اُسے اتنی دلیری دی کہ اُس نے ایک لڑکی کو نکال کر اس کے ساتھ شادی کر لی لیکن وہ تین چار جماعتیں پڑھا ہوا دیہاتی تھا۔ دیہات کے لوگوں کے ذہنوں میں عزت اور وقار کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔ اس تصور میں عقل کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ ہاشم کی فطرت پر دیہاتی ماحول اور روایات کا جو غلبہ تھا۔ وہ صغراں کی زندگی میں زہر گھولنے لگا۔

صغراں نے ایک سال بعد ایک بچی کو جنم دیا۔ تین چار ماہ بعد صغراں کی سہیلیوں کی زبانی پتہ چلا کہ ہاشم نے اُسے کہا ہے کہ یہ بچی جب دودھ پینے کی عمر سے گزر آئے گی تو اُسے وہ اپنے پاس سلایا کرے گا۔

"کیوں؟" صغراں نے اُس سے پوچھا: "کیا میں اُس وقت مر جاؤں گی؟"

"نہیں۔" ہاشم نے خاوندوں کے رُعب سے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کو تمہارے سائے سے بچا کر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" صغراں نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ سیانے کہتے ہیں، جیسی ماں ویسی بیٹی۔" ہاشم نے کہا۔ "اگر یہ تمہاری گود میں پلی تو جس طرح تم میرے پیچھے نکل آئی تھیں۔ اسی طرح یہ کسی اور کے پیچھے نکل جائے گی۔"

اس بات پر صغراں اور ہاشم کی بہت تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ ہاشم نے اُسے کہا کہ اگر

اس نے زیادہ بک بک کی تو وہ اُسے گھر سے نکال دے گا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ صغراں کے دل کا کیا حال ہُوا ہوگا۔ اگر ماں باپ کی مرضی سے اس کی شادی ہوتی تو اور بات تھی۔ اونچی ذات کی لڑکی تھی۔ یہ بات کہاں برداشت کرتی۔ اب اگر ہاشم اُسے گھر سے نکال دیتا تو وہ کہاں جاتی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہاشم کا دل بڑا سخت ہوگیا ہے۔ صغراں اپنی سہیلیوں سے کہتی کہ اُسے ہاشم کے سلوک کا کوئی دُکھ نہیں۔ اب اسے یہ غم کھا رہا ہے کہ اُس نے کیسے کمین آدمی کی خاطر اپنے باپ کی پگڑی مٹی میں رول دی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہاشم نے صغراں کو زرخرید لونڈی بنا لیا۔ جس کا کام یہ تھا کہ ہانڈی روٹی کرے اور دن ہو یا رات، اُس کی طبیعت ساتھ دے یا نہ دے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ ہاشم کی تفریح کا ذریعہ بنے۔ صغراں نے دل پر پتھر رکھ کر اس جان لیوا حقیقت کو قبول کر لیا کہ وہ ایک جانور کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ اب وہ تڑپ سکتی ہے آزاد نہیں ہو سکتی۔

تین سال گزر گئے۔ صغراں کے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ ان تین سالوں میں ہاشم اور صغراں کا تعلق اتنا ہی رہ گیا جتنا میاں بیوی میں چند منٹ کا جسمانی تعلق ہوتا ہے۔ شاید اُن کی آپس میں بات چیت بھی قریباً بند تھی۔ ہاشم نے جھوٹی غیرت پر ایک وہم کو سامنے رکھ کر صغراں کی محبت کا خون کر دیا تھا۔ صغراں نے اپنی سہیلیوں سے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے اپنی عزت اور غیرت بہت پیاری ہے، ورنہ جس طرح ہاشم اُس کے چال چلن پر شک شبہ کرتا رہتا ہے، چاہیے یہ کہ وہ بے غیرت بن کر دکھا دے، لیکن وہ اتنی بے غیرت نہیں ہو سکتی۔

تین سال گزر گئے تو اُس گاؤں میں ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ آدھی رات کے وقت گاؤں کے تین چار کتے جو رکھوالی کے لیے رات کو کھول دیئے جاتے تھے۔ بڑی زور سے بھونکے اور گاؤں سے باہر کی طرف دوڑے۔ چوکیدار نے بھی گاؤں والوں کو آوازیں دیں۔ گاؤں میں رکھوالی کے کتے شام کے بعد کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ کتے مشک لینے کے اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ گھپ اندھیرے میں گاؤں کا کوئی آدمی

کے سامنے آجائے تو یہ کتے اُسے نہیں چھیڑتے اور اگر کوئی اجنبی گاؤں میں داخل ہو جائے تو یہ کتے اُس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ہاشم کے گاؤں میں رات کو رکھوالی کے چار کتے کھلے رہتے تھے۔ جن میں ایک کتا ہاشم کا تھا۔ ان چاروں کتوں کی آوازوں اور چوکیداروں کی للکار پر گاؤں کے بہت سے آدمی جاگ اُٹھے اور کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لے کر باہر کو دوڑے، چوکیدار گھروں سے کچھ دُور نکل گیا تھا۔ لوگ اُدھر گئے۔ چوکیدار واپس آرہا تھا اور چاروں کتے اس کے پاس تھے۔ اُس نے بتایا کہ سب سے پہلے رہٹ کے قریب ایک کتا اس زور بھونکا جیسے اُس نے کسی آدمی کو دیکھا ہو۔ پھر صاف آوازیں آئیں جیسے اُس نے کسی پر حملہ کیا ہو۔ ان آوازوں پر باقی تین کتے بھی اُدھر کو دوڑے اور چوکیدار بھی اُدھر کو دوڑ پڑا۔

چوکیدار نے بتایا کہ ہاشم کا کتا دُور نکل گیا تھا۔ چاندنی پھیکی پھیکی سی تھی۔ چوکیدار نے ایک تو یہ دیکھا کہ ہاشم کا کتا ایک آدمی پر اُچھل اُچھل کر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے اس نے یہ دیکھا کہ رہٹ کی طرف سے ایک عورت دوڑتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو گئی۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون تھی۔ چوکیدار تین کتوں کو للکار کر اُدھر کو دوڑا جہاں ہاشم کا کتا کسی کو گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ آدمی کتے کو شاید ڈنڈا یا لاٹھی مار کر بھاگ نکلا۔

گاؤں والے تو سوچتے رہ گئے کہ وہ آدمی کون تھا۔ جس پر ہاشم کے کتے نے حملہ کیا تھا اور وہ عورت کون تھی۔ جو رہٹ کی طرف سے دوڑتی ہوئی گاؤں میں آئی تھی۔ دوسری صبح گاؤں میں ایک اور تماشا ہوگیا۔ وہ یہ کہ ہاشم نے صغراں کو گھر سے نکال دیا۔ ہاشم نے اعلانیہ کہا کہ رات کو جس آدمی پر اُس کے کتے نے حملہ کیا تھا۔ وہ صغراں سے ملنے آیا تھا اور وہ عورت جسے چوکیدار نے رہٹ کی طرف سے بھاگ کر گاؤں میں آتا دیکھا تھا۔ وہ صغراں تھی۔

ہاشم کو صغراں کی یہ حرکت اس طرح معلوم ہوئی کہ جب چوکیدار کی للکار پر

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ صغراں اپنے بستر سے غائب ہے۔ ہاشم باہر نکلا تو صغراں بڑی تیز تیز چلی آرہی تھی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہاشم نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ صغراں نے کہا کہ وہ رفع حاجت کے لیے باہر نکلی گئی تھی۔ ہاشم کو جب پتہ چلا کہ اُس کے کتے نے کسی آدمی پر حملہ کیا تھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ آدمی صغراں سے ملنے آیا تھا۔ کتا اپنے مالکوں کے ساتھ جاتا ہے۔ جب وہ آدمی صغراں کے ساتھ تھا تو کتا صغراں کے پاس چلا گیا۔ کُتّے نے جب اپنی مالکن کو ایک اجنبی کے بازوؤں میں دیکھا ہوگا تو اُس نے اس اجنبی پر حملہ کر دیا ہوگا۔

ہاشم غصّے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس بدکار عورت کو قتل کر کے اپنے دو بچوں کو یتیم نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں اس عورت کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے گھر سے نکال رہا ہوں۔

گاؤں میں جس نے بھی یہ بات سُنی اُس نے کہا کہ ہاں ہاشم سچ کہتا ہے۔ لیکن ہاشم کی برادری کی ایک بزرگ عورت باہر آئی اور وہ صغراں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی یہ بڑی نیک عورت ہے۔ خدا نے اس عورت کے دل میں نیکی اور رحم بھر دیا ہے۔ اس کا خاوند بھی جتنا رعب والا ہے اتنا ہی رحم دل ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد اس بزرگ نے ہاشم کو بلایا۔ معلوم نہیں اندر کیا ہوتا رہا۔ دوپہر کے وقت دیکھا کہ ہاشم صغراں کو ساتھ لے کر اپنے گھر جا رہا ہے۔ لوگوں کے لیے یہ بڑا اچھا تماشا تھا۔ لیکن تماشا یہیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے دیکھا کہ صغراں کے آنسو خشک ہو گئے ہیں اور اُس کا چہرہ جو ہر وقت اداس رہتا تھا۔ چمکنے لگا ہے۔ اب ہاشم کو لوگ دیکھتے تھے کہ وہ نادم سا رہنے لگا تھا۔ پھر عورتوں نے یہ بتایا کہ اب صغراں ہاشم پر حکم چلاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا چکر چلا ہے۔ لوگوں نے ایک تماشا بھی دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کمہارن کو اس بزرگ نے گھر بلا کر بے عزّت کیا۔ مار پٹائی بھی کی اور اُس کے خاوند کو تو بہت زیادہ ہی مارا پیٹا گیا۔ جیسا کہ مَیں نے کہا ہے کہ دیہات میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

اس بارہ روز بعد یہ پتہ چل گیا کہ یہ سب کیا واقعہ تھا۔

ہوا یہ تھا کہ ہاشم کی برادری کے ایک اونچے گھرانے کی ایک جوان عورت جس کی عمر ابھی پچیس چھبیس سال تھی۔ تین سال سے بیوہ ہو کر ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی اُس کی شادی ہو گئی لیکن تین سال بعد ہی اُس کا خاوند مر گیا۔ اس کا کوئی بچہ بچی نہیں تھا۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی لڑکی اگر شادی ہوتے ہی بیوہ ہو جائے تو اُس کی دوسری شادی نہیں کرتے اور وہ ساری عمر جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ لیکن ہمارے پاکستانی دیہاتوں میں بھی ہندوؤں کا یہ ظالمانہ رواج بڑی سختی سے قائم و دائم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیوہ کی شادی اُس کے ماں باپ اور خاندان کے لیے بے عزّتی کا باعث ہوتی ہے۔ اکثر لوگ بیوہ کے رشتے کو خواہ وہ جوان اور خوبصورت ہی کیوں نہ ہو۔ قبول نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک خاوند کو کھا چکی ہے۔ دوسرے کو بھی چٹ کر جائے گی۔

بات یہ کھلی کہ صغراں کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ اس بیوہ نے تین چار سال کی بیوگی کس طرح گزاری ہے۔ وہ چوری چھپے پانچ چھ میل دُور ایک گاؤں کے ایک آدمی سے ملتی رہتی تھی۔ اُن کے درمیان یہ کمہارن رابطے کا کام کرتی تھی۔ یہ کمہارن صغراں کے گھر جا کر اُس کی خدمت خاطر بھی کرتی تھی۔ صغراں اُسے غریب سمجھ کر کبھی کپڑے کبھی پیسے اور کبھی آٹا دانہ دل کھول کر دیا کرتی تھی۔ اس کمہارن نے صغراں کو بتا دیا تھا کہ یہ بیوہ عورت اس کے ذریعے فلاں آدمی سے فلاں جگہ ملتی ہے۔

صغراں اُس بیوہ عورت کی ماں کے پاس گئی۔ اُس نے بیوہ کا پردہ نہ ہٹایا اور یہ کہا "شیداں کی شادی کر دے۔ اتنی جوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ یہ تو بالکل کنواری لگتی ہے۔ اس کا ابھی بچی بچہ بھی کوئی نہیں۔

"دیکھو صغراں!" شیداں کی ماں نے کہا۔ "جو بات تم نے آج کہی ہے وہ پھر کبھی زبان پر نہ لانا۔ غیرت والے ماں باپ بیٹیوں کی دو دو شادیاں نہیں کیا کرتے۔"

صغراں نے پھر بھی شیداں کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بات نہ بتائی جو

کمہارن نے اُسے بتائی تھی۔ شیداں کی ماں کو غصہ آگیا۔

"تمہیں کیا پتہ غیرت کسے کہتے ہیں۔ شیداں کی ماں نے کہا "تم غیرت والی ہوتی تو اس طرح کسی کے پیچھے نکل کر نہ آتیں۔"

یہ ایسی چوٹ تھی جو صغراں برداشت نہ کر سکی اور واپس اپنے گھر آگئی۔ شیداں اندر بیٹھی صغراں اور اپنی ماں کی باتیں سُن رہی تھی۔ شیداں نے صغراں سے کہا کہ اس کے ماں باپ قسم کھائے بیٹھے ہیں کہ اُس کی دوسری شادی نہیں کریں گے۔ تم پہلی عورت ہو جس نے میرے درد کو پہچانا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ میں زندگی کس طرح بسر کروں گی۔

"شیداں بہن!" صغراں نے کہا۔ "کچھ کھا کر مر جانا کسی کے پیچھے میری طرح نکل کر نہ چلی جانا ورنہ ساری عمر روتی رہو گی۔"

شیداں چپ رہی اور اُس نے سر اس طرح جھکا لیا جیسے صغراں نے اُس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ شیداں نے جب سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تمہارے دل کا حال صرف میں سمجھ سکتی ہوں۔" صغراں نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تمہارا دل کہاں ہے لیکن دل کی بات نہ ماننا۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے۔" شیداں نے دکھیاری سی آواز میں پوچھا۔

"جس کسی نے بھی بتایا ہو۔ تم اس کا فکر نہ کرو۔" صغراں نے کہا۔ "تمہارا یہ راز میرے سینے سے باہر نہیں نکلے گا۔ جو زخم میں نے کھایا ہے، میں نہیں چاہتی کہ وہ زخم تم بھی کھاؤ۔ میں تمہارے بھلے کی بات کروں گی۔ تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گی۔ میں یہی کر سکتی تھی کہ تمہاری ماں کو سمجھاؤں۔ وہ میں کر چکی ہوں۔ اُس کا جواب تم نے سُن لیا ہے۔ عورت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی کہ بھاگ جائے یا مر جائے۔ تم مر جانا بھاگنا مت۔"

"کسی نے ایک شاہ کا پتہ بتایا ہے۔" شیداں نے کہا۔ "سُنا ہے وہ کوئی ایسا

ال کرتا ہے کہ دشمن بھی زیر اور پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔"

"شیداں!" صغراں نے کہا۔ "میں بے پیری ہوں۔ شاید تمہیں میری یہ بات اچھی نہ لگے۔ میں تو صرف اللہ کی ذات پر تکیہ لگائے بیٹھی ہوں۔ کسی پیر فقیر اور کسی عامل شاہ کے پاس نہ جانا۔ میں جانتی ہوں کہ تم جیسی خوبصورت اور جوان بیوہ جب کسی پیر یا عامل کے پاس جاتی ہے تو وہ کیا عمل کرتا ہے۔" صغراں نے تڑپ کر کہا۔ "سب فریب کاری ہے۔ اس دُنیا میں دھوکا فریب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ محبت بھی جھوٹ ہے، تعویذ دھاگے بھی جھوٹ ہیں۔ نام صرف اللہ کا رہ جاتا ہے۔ اللہ نے ابھی تک میری نہیں سنی لیکن میں نے امید کا دامن پکڑا ہوا ہے۔ اللہ کبھی تو سُنے گا۔"

شیداں جو ایک بھرپور جوان اور بڑی خوبصورت عورت تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں لیے اور سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔ صغراں نے اس کا یہ راز کہ وہ کسی سے ملتی ملاتی ہے۔ اپنے سینے میں دبائے رکھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُس نے کمہارن کو بڑی سختی سے کہا تھا کہ اگر اُس نے شیداں کا یہ پردہ فاش کیا تو اُسے قتل کروا دیا جائے گا۔

اب میں واپس کہانی کے اس مقام کی طرف آتا ہوں۔ جہاں صغراں کو اونچی ذات کی ایک بزرگ عورت اپنے گھر لے گئی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد ہاشم کو بھی اُس گھر میں بلا لیا گیا تھا اور پھر ہوا یوں تھا کہ ہاشم اور صغراں اپنے گھر آئے اور سب نے دیکھا کہ صغراں اپنے گھر آئے اور سب نے دیکھا صغراں ہنسی خوشی رہنے لگی اور ہاشم کا رویّہ اس کے ساتھ بالکل بدل گیا۔

اُس بزرگ عورت کی حویلی میں جو باتیں ہوئیں وہ کچھ دنوں بعد حویلی کے باہر بھی سنی جانے لگیں۔ مجھے کہانی سنانے والوں نے پورے وثوق سے بتایا کہ اندر کیا ہوا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ اُس بزرگ چوہدرانی اور اُس کے خاوند نے صغراں سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے کہ جس آدمی پر تمہارے کُتّے نے حملہ کیا تھا۔ وہ تمہیں ملنے آیا تھا اور تم اس کے ساتھ تھیں۔ صغراں نے کہا کہ میں جو بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتی

تھی۔ وہ اب نکالنا پڑے گی۔ لیکن میں یہ بات اپنے خاوند کے سامنے کروں گی۔ یہ سُن کر چوہدرانی اور اُس کے خاوند نے اسی وقت ہاشم کو بلالیا۔

ہاشم آیا تو چوہدری اور چوہدرانی نے اُسے شرمسار کرنے کی کوشش کی اور کہا اچھی ذاتوں والے لوگ اس طرح نہیں کیا کرتے کہ بیویوں کو بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیں۔

ہاشم اس قدر غصے میں تھا کہ اسکے منہ میں جو آیا اُس نے بک دیا۔

"ہاں صغراں!" چوہدری نے صغراں سے کہا۔ "تم وہ بات کرو جو تم کہتی تھی کہ اس کے سامنے کرنی ہے۔"

"مَیں کسی کی بیٹی کا پردہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔" صغراں نے کہا: "میں بھی تمہاری ہی طرح اونچی ذات کی لڑکی ہوں۔ میں کوئی بھنگن اور جمعدارنی نہیں کہ بلاوا کسی کو سُنوا کرتی پھروں لیکن مجھ پر خاوند کی طرف سے جو مصیبت آپڑی ہے اور جس طرح مجھے سارے گاؤں میں ننگا کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد ضروری ہوگیا ہے کہ مَیں پردہ اُٹھا دوں اور وہ راز آپ کے سامنے رکھ دوں جو میں تین چار مہینوں سے اپنے سینے میں دبائے ہوئے ہوں۔

"شیداں کو آپ سب جانتے ہیں، تین چار سال سے بیوہ ہوکر گھر بیٹھی ہے۔ اُس کی فوراً شادی ہونی چاہیے۔ وہ ابھی جوانی کی عمر میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جوانی اُسے اندھا کردے۔"

"ہر عورت تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوتی۔" ہاشم نے بڑے غصے سے صغراں سے کہا۔ "پہلے میری پوری بات سُن لو۔ اس کے بعد جو سزا مجھے دینی ہے دے دینا۔ لیکن تمہیں یہ بتادوں گے کہ مَیں نے اپنے آپ کو ختم کرنے کا انتظام کر رکھا ہے اس گاڑی سے میری لاش نکلے گی جسے تم اپنے ہاتھوں دفن کرو گے۔ شیداں کچھ عرصے پار والے گاؤں کے چوہدریوں کے بیٹے اسلم سے ملتی ملاتی ہے اور تھوڑے ہی دنوں بعد جس طرح میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر گھر سے نکلی تھی، شیداں بھی نکل جائے گی۔"

"تم کیا ثبوت پیش کرسکتی ہو۔" چوہدرانی نے پوچھا۔

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔" ہاشم نے بھڑکی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ خود بدکار ہے۔ اور شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو بدنام کرتی پھرتی ہے۔"

صغراں پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ اُسے غصہ بھی نہ آیا۔ اُسے ہنسی بھی نہ آئی۔

"مَیں نے یہ تو نہیں کہا کہ شیداں بدمعاش ہے۔" صغراں نے کہا۔ "وہ شریف لڑکی ہے۔ مَیں اُسے نیک اور پاک سمجھتی ہوں، لیکن وہ انسان ہے۔ مَیں اُسے بدنام نہیں کر رہی۔ مَیں خدا لگتی بات کہہ رہی ہوں۔ تم لوگ مجھ سے ثبوت مانگتے ہو۔ نوری کمہارن کو بلالو۔ میں اس غریب عورت کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ لیکن تم ثبوت مانگتے ہو۔ اس کمہارن کے کہنے پر مَیں نے خود دو دفعہ اسلم کو رات کے وقت رہٹ کے قریب دیکھا ہے۔"

"تم رات کو رہٹ پر کیا لینے گئی تھیں؟" ہاشم نے پوچھا۔

"مَیں شیداں کے پیچھے گئی تھی۔" صغراں نے کہا۔ "کمہارن نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا کہ آج رات اسلم فلاں وقت آئے گا۔ مَیں نے دو دفعہ اس رہٹ کے قریب انہیں رکتے دیکھا ہے۔ مَیں شیداں کی ماں کے پاس گئی۔ لیکن شیداں کا راز فاش نہ کیا۔ مَیں نے اس کی ماں سے کہا کہ وہ شیداں کی شادی کردے۔ اُس کی ماں نے اُلٹا مجھے بے غیرت کہہ دیا، پھر شیداں میرے پاس آئی اور بہت دیر روتی رہی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ پار والے چوہدریوں کے بیٹے اسلم سے ملتی ہے۔ اُس نے یہ بالکل نہیں کہا کہ نہیں یہ بات غلط ہے۔ بلکہ اُس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ مَیں نے شیداں کو سمجھایا کہ کچھ کھا کر مرجانا کسی کے پیچھے نہ نکلنا۔"

صغراں نے چوہدری اور چوہدرانی کو ہاشم کا وہ سلوک پوری طرح سنایا جو پانچ سالوں سے اُس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

"مَیں نے اس شخص کی محبت پر اپنے والدین کی عزت قربان کردی۔ اس کی غلام بن کر رہی۔" صغراں نے کہا۔ "لیکن اس نے مجھے آوارہ اور بدکار سمجھ لیا۔ مَیں آپ کو

پورے پانچ سالوں کی بپتا سنا چکی ہوں۔ میرے لیے یہ زندگی جہنم ہے۔ مَیں شیداں کو اس جہنم سے بچانے کی قسم کھا چکی ہوں۔ مَیں نے اُسے سمجھایا کہ جس شخص کی محبت کی خاطر اپنا گھر بار اور اپنے والدین کی عزت و آبرو قربان کر دو گی، وہ اپنے دماغ میں یہ وہم بٹھائے رکھے گا۔ جو میرے پیچھے نکل آئی ہے وہ اب کسی اور کے پیچھے نکل جائے گی۔

"شیداں مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔ وہ میرے پاس آتی رہی۔ مَیں اُسے بتاتی کہ میرا حال دیکھ لو۔ کسی کے پیچھے نکل کر نہ جانا لیکن وہ میری بات نہ سمجھ سکی۔ کل کمہارن میرے پاس آئی اور اُس نے مجھے بتایا کہ آج رات شیداں اسلم کے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس نے وقت آدھی رات کا بتایا۔ ہم چھت پر سوتے ہیں۔ ہاشم اور بچے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ہماری چھت سے رہٹ نظر آتا ہے۔ چاندنی اتنی تیز تو نہیں تھی۔ لیکن مجھے ایسے نظر آیا جیسے کوئی آدمی وہاں جا رہا ہو جہاں مَیں نے اسلم اور شیداں کو دو مرتبہ اکٹھے دیکھا تھا۔۔۔۔

"میرا وجود اندر باہر سے کانپنے لگا۔ اگر اس وقت میرا یہ خاوند جاگ رہا ہوتا تو بھی میں وہی کرتی جو مَیں کر گزری۔ میں اُٹھی اور دبے پاؤں نیچے آ گئی۔ باہر نکلی، ہمارا کتا قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑا آیا۔ پہلے تو مَیں نے یہ سوچا تھا کہ جب شیداں باہر نکلے گی تو اُسے روک لوں گی۔ لیکن اپنے کتے کو دیکھا تو میرے دل میں بڑا خوفناک ارادہ آ گیا۔ مَیں نے کتے کو ساتھ لیا اور رہٹ کے قریب دوسری طرف چھپ کر بیٹھ گئی۔ کتے کے سر اور گردن پر مَیں ہاتھ پھیرتی رہی۔ تم لوگوں نے ہمارا کتا دیکھا ہوا ہے۔ بڑا خونخوار ہے۔ رکھوالی میں یہ بھیڑیا بن جاتا ہے۔ گاؤں میں سے ایک عورت نکلی۔ وہ شیداں ہی ہو سکتی تھی۔ اُسے دیکھ کر اسلم اوٹ سے سامنے آ گیا اور اس عورت کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ مَیں اٹھی۔ کتے کا منہ اسلم کی طرف کیا اور کتے کو تھپکی دے کر آہستہ سے للکارا اور اُس کی طرف چھوڑ دیا۔

"اسلم ہمارے کتے کے لیے اجنبی تھا۔ اُس نے کتے کی طرف دیکھا۔ لیکن کتے کی

رفتار دیکھ کر اسلم بھاگ اُٹھا۔ کتے نے اسے دُور نہ جانے دیا۔ میرے کتے کی آوازوں پر گاؤں کے تین چار کتے دوڑے آئے۔ شیداں وہیں سے واپس بھاگ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے گھر سے نکلتے اور واپس گھر جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اسلم میرے کتے سے اپنے آپ کو چھیڑ کر بھاگا۔ لیکن میرا کتا اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر اس کے ساتھ گاؤں کے کتے بھی شامل ہو گئے۔ اس دوران چوکیدار کی للکار سنائی دی اور مَیں نے چوکیدار کو اس طرف آتے دیکھا۔ پھر گاؤں کے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں دوسری طرف سے اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ ہاشم دروازے میں کھڑا تھا۔ میں ہانپ رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو۔ مَیں اگر کمین ذات کی ہوتی تو شیداں کا راز فاش کر کے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر دیتی۔ مَیں دراصل اتنی زیادہ گھبرا گئی تھی کہ میری عقل نے بھی کام نہ کیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ رفع حاجت کے لیے گئی تھی۔ رات بھر یہ مجھ سے پوچھتا رہا اور کہتا رہا کہ جس آدمی کو کتوں نے بھگایا ہے تم اُسی کے ساتھ تھیں۔

"میں اُسی بات پر اڑی رہی جو میرے منہ سے نکل چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ مَیں نے ایک خاندان کی عزت بچائی ہے ایک وکھیاری بیوہ کو اُسی جہنم سے بچایا ہے۔ جو میرے خاوند نے میرے لیے بنا رکھا ہے۔ اگر سمجھتے ہو کہ مَیں جھوٹ بول رہی ہوں تو مَیں نے جن جن کے نام لیے ہیں، انہیں بلا لو۔ میں نے شیداں کا پردہ نہ اُٹھانے کی قسم صرف اس لیے توڑی کہ مجھے اپنے دو بچے یاد آتے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں ماں ہوں۔ اگر میرے بچے نہ ہوتے تو میں اس شخص ہاشم پر لعنت بھیج کر کچھ کھاتی اور مر جاتی۔ مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔ اس نے اللہ اور رسولؐ کی قسمیں کھا کر مجھے کہا تھا کہ میرے ساتھ آ جاؤ۔ میں ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ لیکن اُس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ مَیں آپ کو سنا چکی ہوں۔ یہ مجھ پر جھوٹے الزام لگاتا رہا۔"

چوہدریوں نے جب در پردہ تفتیش کی تو صغراں کی ساری باتیں بالکل صحیح معلوم

ہوئیں۔ اسی وجہ سے نوری کمہارن اور اس کے خاندان کی پٹائی ہوئی تھی۔ اتنی خطرناک واردات کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ شیداں کی شادی کر دی جاتی لیکن اُسے بھی مارا پیٹا گیا اور اُس پر پہرے بٹھا دیے گئے۔

صغراں نے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھا تھا وہ پورا ہوا۔ ہاشم نے اُسے اپنے گھر میں اِس طرح آباد کر لیا جیسے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا ہو۔ اُس نے صغراں کو اپنے خاندان کی چوہدرانی بنا دیا لیکن شیداں مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ دو سال بعد شیداں گھر سے باہر نکلنے لگی۔ پھر وہ گاؤں سے باہر نکلنے لگی اور پھر وہ پیر صاحب کے آستانے کی ہو کر رہ گئی۔ اُس نے اپنی حالت درویشوں اور ملنگوں جیسی بنا لی۔ پورا پورا دن شاہ صاحب کے گھر میں گزارتی تھی۔ اسلم کے متعلق پتہ چلا کہ صغراں کے کتے نے اُسے بہت بُری طرح زخمی کیا تھا۔

مجھے کہانی سنانے والے جھوم جھوم کر عقیدت سے کہہ رہے تھے کہ شیداں شاہ صاحب کے سائے میں رہ رہ کر پوری طرح درویش ہو گئی اور شاہ صاحب اس پر اتنے مہربان ہوئے کہ اپنی کرامات کا کچھ حصّہ اُسے دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ اب عورتیں اپنی مرادیں شیداں کے پاس لے کر جاتی ہیں۔ خدا نے اُس کی پھونک میں ایسا اثر ڈالا ہے کہ بے ہوش مریض اُٹھ کر چلنے لگتا ہے۔

مجھے ان لوگوں کی سادگی پر رونا آ رہا تھا۔ ایک جوان بیوہ نے شاہ صاحب کی صورت میں بیوگی کاٹنے کا وسیلہ پا لیا تھا۔ پھر بھی شیداں کے والدین فخر سے کہتے ہیں کہ ہم غیرت والے لوگ ہیں اور غیرت والے لوگوں کی بیٹیاں دوسرا خاوند نہیں کیا کرتیں۔

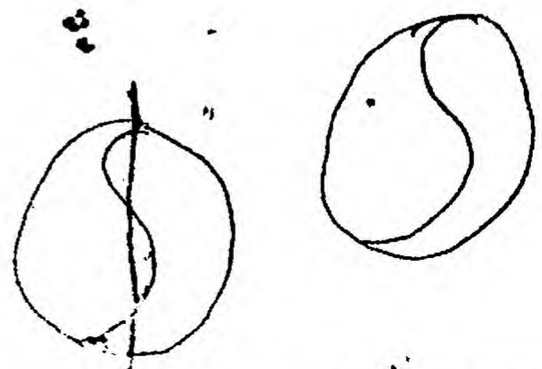

جُرم ایک جاسوس کا

میرے نام ایک لفافہ آیا۔ کھولا تو اس میں سے کاغذوں کا ایک دبیز پلندہ نکلا۔ اوپر موٹے قلم سے لکھا تھا۔ "میں بھی جاسوس تھا۔" تحریر اتنی شکستہ کہ بہت ہی مشکل سے پڑھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں بہت زیادہ رعشہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جاسوسی کی ایسی اصطلاحیں لکھی ہوئی تھیں جو صرف جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال میں نے یہ تحریر اس طرح پڑھی جیسے انٹیلی جنس والے کسی جاسوس کا خفیہ الفاظ میں دیا ہوا پیغام DECIPHER کرتے ہیں۔ لکھنے والے نے ایک کہانی لکھی تھی جو میں عام اور قابلِ فہم زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ میں چونکہ خود جاسوسی کے میدان کا کھلاڑی رہا ہوں۔ اس لیے میں وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ کہانی من گھڑت نہیں ہو سکتی۔ ایسی کہانی وہی لکھ سکتا ہے جو جاسوسی کے لیے کسی ملک میں گیا ہو۔

لکھنے والے نے کہانی پر اپنا نام نہیں لکھا۔ اپنا اتا پتا بھی نہیں لکھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ "میں ایک لمبے عرصے سے بیمار پڑا ہوں اور اب آخری منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنا زور لگا چکے ہیں۔ میری ماں مجھے پیروں اور عاملوں کے تعویذ پلا پلا کر میرے ہی غم میں مر چکی ہے۔ نہ کسی دوائی نے کام کیا نہ کسی تعویذ نے اثر کیا۔ میرے مرض کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں اپنا یہ مرض آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کیونکہ اسے صرف آپ سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے کہ میری یہ کہانی چھپنے تک میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوں گا۔ پورے آٹھ مہینے لگا کر یہ آپ بیتی لکھی ہے۔ ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی سکت نہیں رہی۔ میں اپنا نام اور پتہ دینا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ

میں پاکستان کی تاریخ کا مجرم ہوں۔ ہیرو نہیں ہوں۔
مَیں اُس کی آپ بیتی اُسی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ باتیں دانستہ طور پر لوگوں سے چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ جنگ کی صورت میں عوام کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ محاذوں پر کیا ہو رہا ہے۔ محاذوں کے پیچھے اور فوجی ہیڈ کوارٹروں میں اور سیاسی میدان میں اور انٹیلی جنس کے پردوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عوام کے علم میں نہیں لایا جاتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ انہیں اس سے بے خبر رکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت میں بہت سی باتیں جن کا تعلق جاسوسی کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

۱۹۶۲ء میں چین اور بھارت کی جنگ ہوئی تھی۔ بھارت میں پاکستان کے جاسوس موجود تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بھارتی جاسوس ہمارے ملک میں موجود رہتے ہیں۔ جب چین سے بھارت کی جنگ ہوئی تو بھارت نے پاکستان کے بہت سے جاسوسوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ پھر چین اور بھارت کی جنگ ختم ہو گئی۔ بھارت نے اس بہانے امریکہ برطانیہ وغیرہ سے بیشمار اسلحہ جمع کر لیا اور اس کی نیت کا صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ یہ اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ یہ انٹیلی جنس کی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے دشمن ملک کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ کس طرح معلوم کرتی ہے۔ دشمن کے ارادے جاسوسوں کے ذریعے معلوم کر لیے جاتے ہیں۔ بھارت کے ارادے اور اُس کی نیت صاف نظر آ رہی تھی۔ بھارت بہت بڑی جنگی طاقت بنتا جا رہا تھا۔

اُس وقت تک میں پاکستان کی انٹیلی جنس میں شامل ہو چکا تھا اور ٹریننگ بھی ہو چکی تھی۔ بھارت اور چین کی جنگ کے تقریباً ایک سال بعد مجھے ایک خاص مشن دے کر بھارت بھیج دیا گیا۔ یہ بتانا ضروری اور صحیح نہیں کہ مشن کیا تھا اور میں بھارت میں کس طرح داخل ہوا اور ان سرکاری حلقوں تک میں کس طرح پہنچا۔ جہاں مجھے اپنے مشن کی تکمیل کرنی تھی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ صرف بھارت کے جاسوس پاکستان میں موجود ہیں اور پاکستان اس معاملے میں کمزور ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس بھارت

کی زمین کی تہوں کے نیچے سے بھی راز نکال کر لے آتی ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ جو کارنامے پاکستانی جاسوسوں نے کیے ہیں۔ وہ بھارتی جاسوس نہیں کر سکتے۔

میں دلّی جا پہنچا اور ان سرکاری حلقوں میں داخل ہو گیا جن کے چاروں طرف فولاد کی فصیل اور پہرے کا انتظام بڑا سخت ہوتا ہے۔ وہاں میری حیثیت اعلیٰ درجے کے افسر کی سی تھی۔ جسے انگریزی میں VIP کہتے ہیں۔ مَیں نے وہاں کے اعلیٰ درجے کے کلبوں تک رسائی حاصل کر لی۔ ایک تو مجھے ٹریننگ ملی ہوئی تھی اور دوسرے پیدائشی دماغ تھا۔ جس سے میں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔ مَیں آپ کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی سوسائٹی میں مجھے اتنی بڑی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ مَیں مڈل کلاس خاندان کا آدمی ہوں۔ مَیں نے اداکاری میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ میں ہر قسم کے بہروپ بھر کر اس طرح کی ایکٹنگ کر سکتا تھا۔ میں صدر ایوب کے باڈی لینگویج اور آواز میں تقریر کرنے میں ماہر تھا۔ اگر مَیں ریڈیو پر تقریر کرتا تو سارا ملک یہی سمجھتا کہ صدر ایوب بول رہا ہے۔ مَیں بھٹو اور دوسرے لیڈروں کی آواز میں بھی تقریر کر سکتا تھا۔ اسی طرح میں نہرو اور شاستری کی آوازوں کی بھی سو فیصد نقالی کر سکتا تھا۔ بھکاری کا بہروپ دھارنا یا بھارت کا نواب یا مہاراجہ بننا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ میرے اس وصف نے اور انٹیلی جنس کی حاصل کردہ ٹریننگ نے میری پوری پوری مدد کی۔

میں ایک مرتبہ پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مَیں آپ کو وہ طریقے نہیں بتاؤں گا جن سے میں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری طرح وہاں جو بھی جاسوس جاتا ہے۔ وہ یہی طور طریقے اختیار کرتا ہے۔ پاکستان انٹیلی جنس کا اپنا ایک طریقِ کار ہے جو میں ظاہر نہیں کروں گا۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ مَیں آپ کو جاسوسی کی کہانی نہیں سنا رہا۔ یہ میری ذاتی کہانی ہے جسے آپ میرے جرم کی داستان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بھارت کی سوسائٹی جس میں اکثریت اعلیٰ سرکاری اور فوجی حلقوں کی ہوتی ہے۔ پاکستانی سوسائٹی جیسی ہے، لیکن بھارتی سوسائٹی زیادہ آزاد اور ننگی ہے۔ وہاں شراب کھلے

بندوں چلتی ہے اور انتہا درجے کی بے حیائی نہ صرف یہ کہ فیشن میں شامل ہے۔ بلکہ ہندو مذہب کی طرف سے بھی اس پر کوئی بندش نہیں۔ اس سے مجھے خاصا فائدہ پہنچا۔

جاسوس کے لیے ضروری ہے

کہ وہ ہر وقت بیدار مغز رہے۔ دو چیزیں انسانی دماغ کو بیکار کر دیتی ہیں۔ ایک ہے عورت اور دوسری شراب۔ جاسوس اونچی سوسائٹی میں جا کر ان دونوں چیزوں سے بچ نہیں سکتا اور جاسوس انہی دونوں کے نشے میں اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

میں جس سوسائٹی میں گیا۔ وہاں انہی دونوں چیزوں کا جادو چلتا تھا مجھے انہی دونوں چیزوں کے ذریعے اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ تھا کہ مجھ سے کوئی پوچھ بیٹھتا کہ میری کوٹھی کہاں ہے تو اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ میں جہاں رہتا تھا۔ وہ ایک مڈل کلاس گھرانہ تھا۔ میں اس محلے اور گھرانے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پاکستان حاصل کرنے میں آج کے بھارت کے مسلمانوں نے بھی اتنی ہی قربانیاں دی تھیں۔ جتنی پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں نے دی ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پاکستان کے تحفظ کے سلسلے میں پاکستانی مسلمانوں میں اتنا جذبہ نہیں جتنا بھارتی مسلمانوں کا جذبہ شدید ہے۔ بھارتی مسلمان اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہندو آج تک انہیں سزا دے رہا ہے۔ یہی مسلمان تھے۔ جن کے ایک خاندان نے صرف دلی میں ہی نہیں بلکہ میں جہاں بھی گیا میری رہائش اور تحفظ کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔

دلی کے ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں جہاں سول اور ملٹری کے افسر زیادہ ہوتے تھے، مجھے جاتے ہوئے قریباً ایک ماہ گزر گیا۔ وہ لوگ مجھے کٹر برہمن سمجھتے تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ میرا بس چلے تو میں آج ہی پاکستان پر حملہ کر دوں۔ اس ایک مہینے میں میری دوستی ایک جواں سال ہندو لڑکی کے ساتھ ہو گئی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی اس کا نام جو کچھ بھی تھا۔ وہ مجھ تک رہنے دیں۔ میں اسے پورنما کہوں گا۔ بھارتی انٹیلی جنس کے کاغذات میں اس کا، اس کے باپ اور خاوند کا نام بڑے صاف الفاظ میں لکھا

ہوگا۔

دراصل دوستی کی ابتدا پورنما نے کی اور انتہا میں نے کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے خاوند کے دو چار افسروں کے ساتھ تعلقات پیدا کر چکی ہے۔ یہ اس کے خاوند کی غلطی تھی۔ اس کی اپنی مجبوری تھی۔ خاوند کی غلطی یہ تھی کہ پچاس برس کی عمر میں اس نے پچیس چھبیس سال عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور شادی صرف اس لیے کی تھی کہ وہ خوشامد کے ذریعے بھارتی حکومت کا اعلیٰ افسر بن گیا تھا اور اس کی پرانی بیوی اس کے ساتھ سوسائٹی میں گھومتی پھرتی اچھی نہیں لگتی تھی۔

پورنما کو وہ باقاعدگی سے اپنے ساتھ کلب میں اور جہاں کہیں بھی ڈنر یا پارٹی ہوتی یا کوئی فنکشن ہوتا ساتھ لے جاتا تھا۔ پورنما نے مجھے دراصل اپنا ایک اور شکار سمجھا تھا لیکن وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ لڑکی میری روح پر قابض ہو گئی ہے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں مجھے کئی مرتبہ دعوت گناہ دی تھی جو میں نے اس لیے قبول نہ کی کہ مجھے عورت کے نشے سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔ دوسری وجہ میری اپنی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لڑکی پاک صاف نہیں۔ میں نے اسے پاک صاف سمجھنا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آجاتی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں مجاہد ضرور تھا۔ لیکن میں مرد مومن نہیں تھا۔ میں نے زندگی میں ہر عیش بھی دیکھی ہے اور اپنی توفیق کے مطابق اچھے برے کام بھی کیے ہیں۔ کوئی شریف آدمی جاسوسی میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن پورنما کو دیکھ کر میرے دل سے بدی کا خیال نکل جاتا تھا۔

میں نے ایک روز اپنے دل کی کیفیت اسے بتا دی۔ اس نے کہا کہ وہ اسی محبت کی تلاش میں ہے لیکن وہ جس آدمی کے قریب ہوتی ہے۔ وہ اسے ایک خوبصورت عورت سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا۔ پورنما نے یہ بھی کہا کہ سچی محبت کی تلاش میں وہ گناہوں کا ایک بت بن گئی ہے جسے یہ مرد پوجتے ہیں۔ میں نے اس سے تسلیم کروا لیا کہ وہ جس محبت کی تلاش میں ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔

اُس شام کے بعد ہم دونوں نے یہ معمول بنالیا کہ کلب کے ساتھ جو ایک وسیع لا
تھا، اس کے ایک تاریک کُنج میں جاکر بیٹھ جاتے اور کبھی کبھی موقع ملتا تو اس کے خا
کی گاڑی لے کر کسی ایسی طرف نکل جاتے جہاں ہمیں تنہائی میسر آسکے۔ دلّی میں ایسی
سی جگہیں تھیں۔ تین چار مرتبہ ہم جمنا کے کنارے بھی جا بیٹھے۔ دن کو ہم ہمایوں
مقبرے میں بھی وقت گزارتے رہے۔ پُورنما محبت کی اتنی پیاسی تھی کہ وہ میری
کا حصّہ بن گئی تھی۔ اُس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میری حالت
تھی کہ تاریک تنہائی میں بھی میرے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تو بھی میرے ذہن سے نکل جاتا
کہ میں مرد ہوں اور یہ عورت ہے۔

اُس نے مجھ سے چند مرتبہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ وہ میرے گھر آنا چاہتی
تھی۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ وہ میرے گھر آنے کی غلطی کبھی نہ کرے کیونکہ مَیں بہت
بڑے خاندان کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی مر چکی ہے ا
میری ماں بڑی سخت طبیعت کی عورت ہے۔ مختصر یہ کہ مَیں نے اُسے ایسی وجوہا
بتائیں کہ پھر کبھی اُس نے میرے گھر آنے کا نام نہ لیا اور وہ مجھے ایک مظلوم اور محبو
انسان سمجھنے لگی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بوڑھے خاوند سے چھٹکارہ حاصل کر
چاہتی ہے۔ وہ مجھے اُکساتی تھی کہ مَیں اُسے کسی طرح طلاق دلا دوں یا کہیں بھ
لے جاؤں۔

مَیں نے اس وقت تک کچھ راز حاصل کر لیے تھے۔ جو مَیں نے اپنے مخصو
طریقوں سے پاکستان پہنچا دیے تھے۔ لیکن میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ مَیں
اس پر بہت غور کیا کہ پُورنما کو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کروں۔ وہ میرے
آسکتی تھی۔ مَیں اُس کی اس کمزوری یا اس وصف کو استعمال کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہندو
سوسائٹی سے نالاں تھی۔ مگر مَیں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف نہیں تھی
میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ مَیں پورنما کو استعمال کرنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ مَیں
نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ پاکستان کے اتنا ہی خلاف تھی، جتنا کسی ہندو

ہونا چاہیے۔

اس کے بجائے مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مَیں اُس کے ہاتھ میں
کھیلنے لگوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری محبت پاک تھی۔ جس میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا
لیکن پُورنما کی محبت میں جو نشہ اور خمار تھا وہ مجھے کبھی کبھی فراموش کروا دیتا تھا کہ مَیں
جاسوس ہوں اور یہ لڑکی میرے ملک کی دشمن ہے۔ میرے لیے اپنے آپ میں آنا
دشوار ہو جایا کرتا تھا۔ مَیں جانتا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہندو سوسائٹی میں کس قدر
بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ پھر بھی مَیں اس وقت حیران رہ جاتا جب پورنما کا خاوند
اسے میرے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اُس نے مجھے اپنے
گھر کھانے پر بلایا اور دوسری مرتبہ چائے پر۔ یہ مکروہ شکل ہندو میرے ساتھ جلد
ہی بے تکلف ہو گیا۔ مَیں اس کی وجہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے۔
پورنما اپنے حسن و جوانی کے اثر سے اس بوڑھے خاوند کو بندر کی طرح نچاتی رہتی تھی۔
ایک نقصان یہ بھی نظر آرہا تھا کہ دو تین افسر پورنما کی وجہ سے میرے خلاف ہو
گئے تھے۔

چار پانچ مہینے گزر گئے۔ مَیں نے اس دوران اپنا کچھ کام کر لیا تھا لیکن ایک
انتہائی ضروری کام ابھی باقی تھا جو خاصا مشکل تھا۔ اس کے لیے آرمی کے چیف آف
ہیڈ کوارٹر تک پہنچنا ضروری تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ اس کا کچھ تعلق
گڑگاؤں کے ساتھ بھی تھا۔ گڑگاؤں دلّی سے پندرہ سولہ میل دُور ہے۔ جنگ عظیم
کے زمانے میں انگریزوں نے وہاں ائرفورس کے لیے ایک اڈہ بنایا تھا۔ ۱۹۴۷ء
کے بعد وہاں اور بھی بہت کچھ بن چکا ہے۔ مجھے وہاں تک جانا ہی تھا۔ لیکن ایک
شام پورنما نے خواہش ظاہر کی کہ چلو آج ذرا دُور کی سیر کریں۔ میں نے اُسے کہا کہ چلو
جدھر چلنا ہے چلے جاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ گڑگاؤں کی طرف چلتے ہیں۔ کہنے لگی کہ
اُس طرف کی فضا اور ماحول بڑا کھلا ہے۔

اُس نے اپنے خاوند کی گاڑی لی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر خود ہی گاڑی چلائی۔

مَیں اُس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہی باتیں اُسے اچھی لگتی تھیں لیکن مَیں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اُس روز وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے ایک بات شروع کی تو بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ ہم اُس وقت دلّی اور گڑگاؤں کے درمیان جا رہے تھے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔ پھر چپ کیوں ہو گئی ہے۔ اُس نے ہنس کر مجھے ٹالنا چاہا لیکن مَیں نے دیکھا کہ اُس کی ہنسی بناوٹی تھی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ آج کیوں پریشان ہے اُس نے میری طرف دیکھا اور گاڑی روک لی۔

اُس نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا۔ مَیں سر سے پاؤں تک سُن ہو گیا۔ اچانک ارادہ کیا کہ اسے دھکّا دے کر گاڑی سے نیچے پھینک دوں اور گاڑی لے کر بھاگ جاؤں۔ اُسے میرا نام کس نے بتایا تھا؟ وہ تو مجھے ایم۔ ڈی شرما کے نام سے جانتی تھی۔ مَیں نے اُسے پھینک کر گاڑی میں بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن پورنما پر میرا ہاتھ اُٹھ نہ سکا۔ فرار کی دوسری صورت یہ تھی کہ مَیں اسے گاڑی میں چھوڑ کر خود نکل جاتا میں وہاں سے سڑک کے دائیں یا بائیں طرف کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا۔ اگر مَیں دلی پہنچ جاتا تو پھر میری گرفتاری کا خطرہ بہت کم ہو جاتا۔ پُورنما سے پوچھنے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی کہ اُسے میرا نام کس نے بتایا ہے۔ میرے سمجھنے کی بات صرف یہ تھی جو مَیں نے سمجھ لی کہ اسے اگر میرا اصلی یعنی اسلامی نام معلوم ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔" اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور اس کو چُومتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام مجھے آج معلوم نہیں ہوا۔ مَیں دو تین مہینوں سے جانتی ہوں کہ تم مسلمان اور پاکستانی جاسوس ہو۔"

"پھر تم نے مجھے پکڑوایا کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مَیں تمہیں پکڑوانے کے لیے ہی گڑگاؤں لے جا رہی تھی۔" پُورنما نے کہا۔

"لیکن دلّی سے یہاں تک میرے سینے میں جو لڑائی لگی رہی ہے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ ایک طرف میری محبت ہے۔ دوسری طرف میرا مذہب اور میرا ملک ہے۔ تم نے شاید محسوس نہیں کیا کہ میں کس قدر گھبراہٹ میں تھی، یہاں پہنچ کر اچانک میرا ذہن صاف ہو گیا۔ میرے دل نے کہا کہ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ مَیں اپنی محبت کو قتل نہیں کر سکی۔"

مَیں حیران تھا کہ میری نشاندہی کس طرح ہوئی ہے اور میرا نام یہاں کس طرح بے نقاب ہوا ہے۔ مَیں نے پُورنما سے پوچھا۔

"مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھو۔" پُورنما نے کہا۔ "ہمارے پاس اتنی لمبی گفتگو کا وقت نہیں ہے۔ مَیں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تین مہینے ہوئے تمہارا پردہ اُٹھ گیا تھا۔ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ تمہارے ساتھ لگی رہوں اور دیکھوں کہ تم کہاں کہاں جاتے ہو، کس کس کو ملتے ہو اور تمہاری سرگرمیاں کیا ہیں۔ مَیں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی ہے لیکن میں اپنی یہ ڈیوٹی پوری نہ کر سکی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں دھوکے میں رکھوں۔ لیکن میرے دل میں تمہاری محبت جو پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میری بہت بڑی کمزوری بن گئی۔ مَیں اپنے افسروں کو تمہارے متعلق جھوٹ موٹ کی رپورٹیں دیتی رہی۔ مَیں نے تم سے پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ تم نے مجھے جو جواب دیا تھا وہ مَیں جانتی تھی کہ جھوٹ ہے۔ پھر بھی مَیں نے تم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ میرا خاوند تمہیں دیکھ کر اس لیے خوش نہیں ہوتا تھا کہ تم اسے اچھے لگتے ہو بلکہ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے پاکستان کے ایک جاسوس کو اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔"

صرف جاسوسوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جاسوسوں کو کس طرح پکڑا جاتا ہے۔ لیکن پبلک کو اس کا علم نہیں۔ بہتر ہے کہ اسے ذرا صاف کر کے بیان کر دیں۔ پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ میرے متعلق اگر پتہ چل گیا تھا کہ مَیں جاسوس ہوں تو انہوں نے مجھے پکڑ کیوں نہیں لیا۔ بعض جاسوسوں کو فوراً نہیں

پکڑا جاتا۔ بلکہ اُن کا خفیہ تعاقب کر کے دیکھتے رہتے ہیں کہ یہ کہاں جاتا اور کس قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس طرح اُس کے پورے رنگ یا گروپ کا سُراغ مل جاتا ہے اور سب ایک ہی مرتبہ پکڑے جاتے ہیں۔ میں اس سطح کا جاسوس تھا۔ جہاں بھارتی انٹیلی جنس کو بجا طور پر شک تھا کہ میرے تعلقات بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ اُن سب کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے پُورنما کو میرے ساتھ لگا دیا لیکن پورنما ہندو بھی تھی۔ پاکستان کی دشمن بھی تھی اور وہ انسان بھی تھی۔ اُس کے جذبات پیاسے تھے۔ وہ ہندو کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ لیکن اُس کے جذبات فرض پر غالب آجاتے تھے۔

"میرے خاوند نے بڑی خوشی سے اجازت دی تھی کہ مَیں اپنے ملک کی خاطر یہ ڈیوٹی انجام دوں۔" پورنما نے کہا۔ "تمہارے متعلق انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ تمہارا اصل مشن کیا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے مشن کا کچھ نہ کچھ تعلق گڑگاؤں کے ساتھ بھی ہے۔ ہمارے دو ہندو افسروں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اُن سے تم کیا کیا معلومات لے چکے ہو۔ اب تمہیں گرفتار کرنا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ میں تمہیں گڑگاؤں تک سیر کے بہانے لے چلوں۔ ہمارے افسروں کو معلوم تھا کہ تم گڑگاؤں ضرور جاؤ گے۔ مَیں تمہیں گرفتار کروانے کے لیے لے جا رہی تھی لیکن مجھے شک ہے کہ وہ تمہیں گرفتار نہیں کریں گے بلکہ تمہیں قتل کر کے کہیں پھینک دیں گے۔"

مَیں نے اُسے کہا کہ بھارت کی حکومت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اتنے قیمتی جاسوس کو قتل کروا دے۔ مجھے گرفتار کریں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کیا کیا ——— انفارمیشن حاصل کر کے پاکستان بھیج چکا ہوں۔

"یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔" پورنما نے کہا۔ "تم نے کئی ایک افسروں کو بیوقوف بنائے رکھا ہے۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا ہے۔ وہ تم سے ذاتی طور پر انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی نیت نہیں بتائی۔ مجھے

ہے کہ یہ افسر تم سے انتقام لیں گے۔ مَیں نے بہت کوشش کی ہے کہ اپنی ڈیوٹی سچے ہندو کی طرح پوری کروں۔ لیکن مَیں تمہاری محبت کو اپنے دل سے نکال نہیں سکی۔ تم بھاگ جاؤ۔"

"اور تم؟"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" پُورنما نے کہا۔ "میں کہہ دوں گی کہ راستے میں تمہیں کوئی شک ہو گیا تھا اور تم کسی بہانے گاڑی رکوا کر بھاگ گئے ہو۔"

پورنما نے اپنے فرض پر محبت کو غالب کر لیا تھا۔ لیکن مَیں اپنے فرض کو محبت پر قربان کرنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے نہیں بھاگنا تھا بلکہ بھاگنے کی ضرورت یہ تھی کہ مَیں نے کچھ اور معلومات حاصل کر لینی تھیں۔ جو پاکستان پہنچنی ضروری تھیں۔ میرے پاس وہیں سے یہ معلومات بھیجنے کا انتظام تھا۔ لیکن یہ ایک راز تھا جو مجھے ذاتی طور پر پاکستان پہنچانا تھا۔ یہاں سے میرے جرم کی ابتدا ہوئی۔ مجھے دو تین روز پہلے ہی وہاں سے نکل آنا چاہیے تھا۔ لیکن پُورنما میرے لیے زنجیر بنی رہی۔ میں نے سوچا کہ چلو تین چار دن اور رُک جاتے ہیں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مَیں نے ارادہ کر لیا کہ نکل جاؤں۔ لیکن مجھے خیال آگیا کہ ایک لڑکی اپنے آپ کو میری محبت پر قربان کر رہی ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ جب اکیلی واپس جا کر کہے گی کہ جاسوس بھاگ گیا ہے تو اس پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ اسے ایذا رسانی کی اُس جگہ میں ڈال دیں گے۔ جس میں جاسوسوں کو ڈالا جاتا ہے۔ اپنے فرض کی خاطر مجھے ایک ہندو لڑکی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میں بھی بہرحال ایک انسان تھا۔

"نہیں پُورنما!" ——— میں نے اُسے کہا۔ "مَیں تمہیں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"مَیں خود نہیں سمجھ سکتی کہ میں تمہارے بغیر اکیلی کیسے زندہ رہوں گی۔" پُورنما نے کہا۔

"لیکن میں تمہاری محبت کی قیمت دینے کا تہیہ کر چکی ہوں۔

اگر میں پوری تفصیل سے سُنانا شروع کر دوں کہ اُس نے کیا کہا اور مَیں نے کیا کہا تو یہ فلمی کہانی بن جائے گی۔ میں صرف یہ بات صاف کر کے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ محبت کی خاطر ایسی قربانی کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن پورنما کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ مڈل کلاس خاندان کی لڑکی تھی۔ جس کی شادی اتنے بڑے افسر کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اُس کی خوبصورتی تھی جو اس بوڑھے افسر نے دیکھ لی اور پورنما کے باپ کو معلوم نہیں کتنی رقم دے کر پورنما کو اپنی بیوی بنا لیا۔ ایک تو یہ شخص بوڑھا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس بوڑھے نے پورنما کو محبت کی خاطر بیوی نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اسے نمائشی چیز بنا کر ساتھ رکھتا تھا اور اپنے بڑے افسروں کو خوش کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ یہ بوڑھا مرکزی حکومت میں سیکرٹری کی سطح کا افسر تھا۔ اُس نے پورنما کو بہت بُری طرح استعمال کیا۔ ایک تو پورنما کے دل میں انتقام کا جذبہ تھا۔ اور دوسرے اُسے ہر انسان کی طرح محبت اور شریفانہ ازدواجی زندگی کی ضرورت تھی۔ وہ محبت اُسے مجھ سے ملی مَیں آپ بتا چکا ہوں کہ وہ انتہائی متعصب ہندو تھی لیکن سچی محبت کی تشنگی اس قدر شدید تھی کہ اس کے دل سے نہ صرف تعصب نکلا بلکہ مذہب بھی اس کے ذہن سے اتر گیا۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ رات کی تنہائیوں اور تاریک ویرانوں میں بھی میری اور پورنما کی محبت پاک رہی —

پاک محبت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے اور ایک ایسا نشہ بھی ہوتا ہے جو انسان کو کسی کام کا نہیں رہنے دیتا۔ پورنما قربانی پر تل گئی تو مَیں نے سوچا کہ میں تو مرد ہوں مجھے بھی اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے اس سے بڑھ کر قربانی دینی چاہیے۔ اُس نے جب یہ کہا کہ وہ میرے بغیر اکیلی نہیں رہ سکے گی تو میرے مُنہ سے نکلا کہ پورنما تمہارے بغیر میں بھی اکیلا نہیں رہ سکوں گا۔

مَیں نے اسے سٹیئرنگ سے اُٹھایا خود ادھر ہو بیٹھا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ مَیں نے گاڑی گھمائی اور دلی میں ایک جگہ گاڑی روک کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر گیا۔ وہاں کے لوگوں سے کچھ باتیں کیں۔ کپڑے تبدیل کر کے معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ مَیں نے انہیں پورنما کے متعلق ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ مَیں ساتھ لیے جا رہا ہوں۔

مَیں نے جو بات نہیں سوچی تھی وہ اُس گھر کے ایک بزرگ نے سوچ لی۔ اُس نے اپنی بیٹی کا برقعہ مجھے دے کر کہا کہ لڑکی کو اس برقعے میں لے جانا۔ میں واپس آیا۔ برقعہ پورنما کو دیا جو اُس نے اسی وقت اوڑھ لیا۔ اب ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کار نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ ہم ریلوے سٹیشن پہنچے تیسرے درجے کے دو ٹکٹ انبالہ کے لیے خریدے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو رہی تھی۔ لیکن یہ ہمارے لیے بڑی لمبی مدت بنتی جا رہی تھی۔

پورنما کو زنانہ ڈبے میں بٹھایا اور مَیں مردانہ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔ اس نے ہمیں بحفاظت انبالہ پہنچا دیا۔ تھرڈ کلاس کے ہجوم نے ہمیں بڑی اچھی طرح چھپائے رکھا۔ انبالہ اسٹیشن پر اترے۔ تو میرے کہنے پر پورنما نے برقعہ اتار دیا اور وہ چادر اپنے اوپر اوڑھ لی جو مَیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس چادر سے اس نے دیہاتی عورتوں کی طرح لمبا گھونگھٹ نکال لیا۔ میں نے اپنا حلیہ اور چلنے کا انداز بھی دیہاتیوں کا سا کر لیا۔ پورنما کو بھی بتایا کہ وہ کس طرح چلے۔

وہاں سے ہم بس میں سوار ہوئے۔ بس میں داخل ہونے کا ہمارا انداز بالکل جاہلوں کا سا تھا۔ اس بس نے ہمیں لدھیانہ پہنچا دیا۔ اصل مسئلہ تو سرحد پار کرنے کا تھا۔ یہ مسئلہ اس لیے ٹیڑھا اور خطرناک ہو گیا تھا کہ سرحدوں کی ناکہ بندی لازمی تھی۔ بھارتی انٹیلی جنس کو رات ہی پتہ چل گیا ہو گا کہ جس جاسوس کو انہوں نے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ جال سمیت لاپتہ ہو گیا ہے۔ ہم جس وقت لدھیانہ پہنچے اس

وقت بھارتیوں کو پورنما کے خاوند کی گاڑی بھی دلّی ریلوے سٹیشن کے باہر مل چکی ہوگی اور سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کا شکار سرحد کی طرف نکل گیا ہے۔

سرحد کی ناکہ بندی کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اگر مَیں اکیلا ہوتا تو میرے لیے یہ مسئلہ اتنا ٹیڑھا نہ ہوتا۔ ایک لڑکی کے ساتھ سرحد پار کرنا۔ تقریباً ناممکن تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس نے اپنی بارڈر فورس کو چوکنا نہ کیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ معجزہ تھا۔ بارڈر فورس چوکس نہ ہوتی تو پھر ایک چھوڑ میں چار لڑکیوں کو بھی ساتھ لا سکتا تھا۔

ایک بس نے ہمیں امرتسر پہنچا دیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم سرحد کی طرف چل پڑے۔

یہ علاقہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں میری عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ جب میں اس علاقے سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ مَیں اس وقت بالکل نہتا تھا اور اب سولہ برس بعد بھی نہتا تھا۔ اُس وقت بھی دُشمن میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور اب بھی میرے تعاقب میں تھا۔ آپ خود جاسوس بن کر ان علاقوں سے گزر چکے ہیں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ علاقے بیان کیے جائیں۔ پورنما بڑی دلیری سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو میرے اوپر بوجھ نہ بنائے۔ ہم نے بس میں کوئی جذباتی بات نہ کی۔ پورنما نے ڈر اور خوف کا بالکل اظہار نہ کیا۔

مَیں نے امرتسر سے چار پانچ روٹیاں اور پکوڑے خریدے تھے۔ یہ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر کھا لیے تو پیاس نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً آدھ میل اور آگے گئے تو ایک راجباہ سے پانی پیا جو صاف نہیں تھا۔ ہم جب وہاں سے چلے تو مَیں نے اندازہ کیا کہ سرحد تھوڑی ہی دور رہ گئی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمیں دریائے راوی بھی عبور کرنا ہے۔ مجھے دریا کی فکر نہیں تھی۔ خطرہ بارڈر سکیورٹی فورس کا تھا۔ میں آپ کو یہ نہیں سنا رہا کہ ہم کس طرح چلتے رہے۔ کتنی

دیر لگی اور کیسے کیسے راستوں سے گزرے۔ یہ تو آپ خود جانتے ہیں۔

مَیں اب آپ کو سرحد پر لے آتا ہوں۔ میرے کان بڑے تیز تھے۔ قدموں کی آہٹ ایک طرف سے سُنائی دی تو مَیں نے پورنما سے کہا کہ وہیں دبک کر بیٹھی رہے خواہ کچھ بھی ہو اپنی جگہ سے نہ ہلے اور مَیں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ سرحد پر گشتی سپاہی کہاں ہے۔ مَیں نے اُسے سرگوشیوں میں بتا دیا کہ سرحد چوکس ہے۔

پورنما کو دو جھاڑیوں کے درمیان بٹھا کر مَیں جُھک جُھک کر اور جو بھی آڑ میسر آئی۔ اس کے پیچھے ہو کر ذرا آگے نکلا کہ خطرے کا جائزہ لوں۔ دو سنتری میرے پانچ چھ گز قریب سے گزر گئے۔ مَیں نہیں دیکھ سکا۔ تقریباً دس منٹ بعد اور سنتری گزرے۔ جن میں سے ایک اپنے ساتھی کو اپنے گھر کی کوئی کہانی سُنا رہا تھا۔ مَیں نے یہ اندازہ کیا کہ چار سنتری آگے نکل گئے ہیں اور میرا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ مجھے اب واپس جا کر پورنما کو ساتھ لانا تھا۔

مَیں جوں ہی پیچھے کو چلا، پورنما کی بڑی خوفزدہ آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا تھا اور وہ دوڑی چلی آ رہی تھی۔ رات تاریک تھی۔ اُس کی پکار سُن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک طرف پورنما کے دوڑتے قدموں کی آہٹیں تھیں۔ دوسری طرف سے بھاری بھرکم بھاگتے ہوئے قدموں کی خوفناک آہٹیں تھیں۔ مجھے "ہالٹ"، "ہالٹ" کی پکار بھی سنائی دی۔ میں سرحد کی طرف بھاگنے کے بجائے پورنما کی طرف دوڑا۔ مَیں نے پرواہ نہ کی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ مَیں اور پورنما اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی۔ اٹکتی کانپتی آواز میں اس نے کہا کہ کوئی چیز سرسر کرتی میرے پاؤں کے قریب سے گزر گئی تھی۔ شاید سانپ ہوگا۔ وہ اس سے ڈر گئی تھی۔

اس علاقے میں صرف دیہاتی عورتیں رات کو بے دھڑک گھوم پھر سکتی ہیں۔ دلی شہر کی لڑکی اس علاقے میں سوائے ڈرنے اور بدکنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔

پورنما کا خوف بجا تھا۔ مَیں اُسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر سرحد کی طرف دوڑا۔ آگے سرکنڈے آ گئے۔ مَیں نے پورنما کو وہاں بٹھا لیا۔ لیکن ہمیں پکڑنے والوں کے قدموں کی آہٹیں اور للکار قریب آ رہی تھیں۔ مَیں نے جان لیا کہ ہم گھیرے میں آ گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اگر سرکنڈوں کے اندر چلے گئے تو سرحد کے یہ پہرہ دار سرکنڈوں کی تلاشی ضرور لیں گے۔

مَیں نے اُن کی آوازوں سے اندازہ کیا کہ مجھے کدھر سے نکلنا چاہیے۔ مَیں نے پورنما سے کہا کہ میرے ساتھ پیٹ کے بل رینگتی چلو۔ تھوڑی دُور تک ہم پیٹ کے بل رینگتے گئے۔ سرحدی محافظ بالکل خاموش ہو گئے۔ یہ شاید ان کی چال تھی۔ کچھ اور آگے جا کر مَیں نے پورنما کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور ہم تیز تیز چلنے لگے۔ اچانک پیچھے سے ایک للکار سُنائی دی اور ہم دوڑ پڑے۔ لیکن بیک وقت معلوم نہیں کتنی رائفلیں فائر ہوئیں۔ گولیاں میرے قریب سے گزریں اور پورنما جو میرے ساتھ چلتی آ رہی تھی۔ چیخ مار کر رُک گئی۔ مَیں نے مڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی پھر لڑھک گئی۔ مَیں بے اختیار اس طرف لپکا۔ اُسے گولی لگ چکی تھی۔ اُس کے منہ سے صرف اتنی سرگوشی نکلی۔ "تم چلے جاؤ!" یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

مَیں نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض خاموش تھی۔ میرے سینے میں ایک راز تھا۔ جو پاکستان تک پہنچانا تھا۔ مجھے بھاگ آنا چاہیئے تھا۔ اب مَیں اکیلا تھا۔ مَیں شاید رینگتا سرکتا، چھپتا وہاں سے نکل ہی آتا۔ لیکن پورنما کی موت نے میرے دماغ پر بُرا اثر ڈالا۔ مَیں یہ بھول کر کہ میں کتنے بڑے خطرے میں ہوں۔ پورنما کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر اُس کا سر اوپر اُٹھایا اور اپنا گال اُس کے گال کے ساتھ لگا دیا اور مَیں بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔ بھارتی باڈر سکیورٹی فورس کے آدمی جب مجھے پکڑ کر اُٹھا رہے تھے۔ مَیں اُس وقت بھی ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

اس کے بعد آپ خود جانتے ہیں کہ مجھے وہاں سے گرفتار کر کے کس جہنم میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ تفتیش کا وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس میں سے ہر اُس جاسوس کو گزارا جاتا ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے۔ اذیتوں سے مَیں بے ہوش ہو جاتا تھا اور جب ہوش آتا تو پھر وہی تفتیش اور پہلے سے زیادہ ایذا رسانی شروع ہو جاتی۔ اس بات کو مجھ تک ہی رہنے دیں کہ مَیں نے انہیں کیا بتایا اور کیا نہیں بتایا۔ میں اصل بات جو کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مَیں نے اپنے آپ کو اذیت دینی شروع کر دی۔ مَیں خود کہتا تھا کہ مجھے یہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میرا جرم یہ نہیں تھا کہ مَیں پاکستانی جاسوس تھا اور میرا جرم یہ بھی نہیں تھا کہ مَیں ایک ہندو لڑکی کو اغوا کر کے لایا تھا۔ میرا اصل جرم یہ تھا کہ مَیں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنے جذبات کا خیال رکھا۔ وہ راز جو مَیں بھارت سے لا رہا تھا۔ میرے ملک کی امانت تھی۔

۱۹۶۵ء میں رَن کچھ میں پاکستان اور بھارت کی لڑائی ہوئی اور پھر جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا۔ تب تک میں بھارت کے تین جیل خانے دیکھ چکا تھا اور اذیتیں سہہ سہہ کر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔

۱۹۶۶ء میں اعلان تاشقند کے بعد جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور ان کے ساتھ خدا نے میری سُن لی اور مجھے بھی چند اور پاکستانی قیدیوں کے ساتھ پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ مَیں اپنے گھر آ گیا اور مسلسل بیمار رہنے لگا۔ میرے بہت علاج کروائے گئے۔ سب سمجھتے تھے کہ مجھے بھارت میں جو اذیتیں دی گئی ہیں۔ یہ ان کا اثر ہے۔ لیکن یہ صرف مَیں جانتا تھا کہ یہ کیا اثر ہے؟

مَیں نے اپنے آپ کو یہ روگ لگا لیا کہ مَیں نے فرض پورا نہیں کیا۔ جس کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا۔ میرا علاج تو نفسیات کا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے سینے کا غبار کاغذ پر منتقل کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے تو کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن میرا جسم اندر سے اس قدر کھایا جا چکا ہے کہ مَیں چند دنوں کا مہمان ہوں۔

☆

تاریک راہوں میں

لوگ اسے لنگڑا بھی کہتے ہیں۔ کھوکھے والا اور چائے والا بھی کہتے ہیں اور جو اُس کے ماضی سے آشنا ہیں۔ وہ اسے سابق سمگلر بھی کہتے ہیں۔ مگر وہ پاکستان کی داستانِ شجاعت کے ایک باب کا عنوان ہے۔ جسے کوئی پڑھنا گوارا نہیں کرتا اور جس کے متعلق کوئی کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک کھوکھے میں بیٹھا چائے بیچتا ہے۔

اُسے مَیں جانتا ہوں یا میرے وہ معدودے چند دوست جو بھارت کی جیلوں میں کچھ عرصہ گزار کے آئے ہیں یا اسے بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس، ملٹری انٹیلی جنس اور وہاں کی پولیس جانتی ہے۔

آپ اس مصلحت کو سمجھتے ہوں گے جس کے تحت میں اُس کا نام پتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ اس کے بجائے مَیں اُسے شریف کہوں گا۔ وہ بھارت کے ضلع ہوشیار پور کے ایک قصبہ مکیریاں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ قصبہ دسوہا کے قریب ہے۔ اس کی عمر بارہ سال تھی — جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اُسے بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ مگر یہ ہجرت خون میں ڈوبا ہوا سفر تھا۔ اس کی ماں کو ہندوؤں نے جولائی ۱۹۴۷ء میں ہی قتل کر دیا تھا۔ اگست میں اُس نے اپنے باپ اور بہن کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ پا پیادہ سفر تھا۔ راستے میں اس کے قافلے پر حملہ ہوا تو وہ اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گیا۔ وہ تو قیامت تھی۔ جس میں سے وہ گزرا۔ یہ ایک لمبی اور روح کھڑے کر دینے والی داستان ہے کہ وہ کس طرح پاکستان پہنچا۔ حملے کے بعد سفر کے دوران اسے نہ باپ ملا نہ بہن ملی۔

پاکستان میں آکر بارہ سال کی عمر کا یہ لڑکا محنت مزدوری کرنے لگا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی جذباتی حالت کیسی ہو گی اور اُس نے زندگی کے وہ دن کس طرح گزارے ہوں گے۔ دو سال گزر گئے اور ایک دن اسے ایک نابینا شخص نظر آیا۔ جس کی شکل و صورت اس کے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ شریف کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ یہ اندھا اس کے قریب سے گزرا تو شریف رہ نہ سکا۔ اسے روک لیا۔ وہ اس کا باپ ہی تھا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ شریف نے اپنی بہن کے متعلق پوچھا تو باپ نے اسے بتایا کہ جب قافلے پر حملہ ہوا تھا تو ہندو اور سکھ اس کی بہن کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ باپ اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا رہا مگر ناکام ہو کر پاکستان آ گیا۔ اس سے بیٹی چھن چکی تھی اور کمسن بیٹا بچھڑ گیا تھا۔ بچوں کی ماں ہندوؤں کے ہاتھوں پہلے ہی قتل ہو چکی تھی۔ باپ نے رو رو کر اپنی بینائی کھو دی تھی۔ شریف نے عہد کر لیا کہ وہ اپنی ماں کے خون کا اور بہن کی عصمت کا انتقام لے گا۔

اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو باپ مر گیا۔ شریف کے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ مگر اسے صحیح راستے پر ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔ اُس نے قتل و غارت اور خونریزی دیکھی تھی۔ اس سے اپنا گھر اور گھر کے تمام افراد چھن گئے تھے۔ اس کی قسمت میں محنت مزدوری لکھی تھی۔ ان حالات نے اسے سمگلر بنا دیا۔ وہ دراصل کسی سمگلر کا نوکر بنا تھا۔ نوکر سے چیلا بنا پھر اچھا خاصا اُستاد بن گیا۔ یہ ۱۹۵۳ کا واقعہ ہے۔ جب پاکستان میں سمگلنگ باقاعدہ کاروبار کی صورت میں عروج پر تھی۔ اس وقت بعض وزیر اور بڑے بڑے افسر بھی اس کاروبار کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شریف کا سمگلروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ البتہ یہ حیران کن تھا کہ اس پیشے میں اُس نے ذہانت اور بے خوفی کے مظاہرے شروع کر دیے۔ وہی سرحد جو اس نے ۱۹۴۷ء میں عبور کی تھی اور پھر یہ سرحد اس کے لیے لوہے کی دیوار بن گئی تھی۔ اب اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ راتوں کو کم اور دن دہاڑے زیادہ بار سرحد پار کیا کرتا تھا۔

سمگلر عموماً سرحد تک رہتے ہیں۔ آگے مال دوسرے گروہ لے جاتے ہیں۔ لیکن شریف ان چیدہ چیدہ سمگلروں میں سے تھا جو خود سرحد پار جاتے اور اپنا مال خود ٹھکانے پر پہنچا کر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک کام ہوتا ہے۔ شریف کو اب یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کتنی بار بھارت کے دور اندر تک گیا تھا۔ دلّی تک چلے جانا تو کوئی بات ہی نہیں تھی، وہ مدراس تک گیا تھا۔ وہ کئی بار اپنے آبائی قصبے کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں اُس نے عمر کے ابتدائی بارہ سال گزارے تھے۔ اس کا خون اُبل پڑتا اور اُس کے دل میں انتقام کا عزم تازہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار وہ پاکستان میں مال سمیت پکڑا گیا اور اُسے ایک سال سزائے قید ہوئی۔ وہ جب جیل سے نکلا تو اُستاد سمگلر بن چکا تھا۔ جیل میں استادوں نے اسے مزید ٹریننگ دے دی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے رَن کچھ میں حملہ کیا اور جنگ شروع ہوگئی۔ تو شریف کے اندر وہ انسان بیدار ہوگیا۔ جو بھارت سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ فوراً فوج میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا، مگر اُسے سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے فوج نے قبول نہ کیا۔ قانون یہی تھا۔ جرائم پیشہ اور سزا یافتہ آدمی کو فوج میں نہیں لیا جا سکتا۔ وہ بہت مایوس ہوا۔

رن کچھ کی جنگ بند ہوگئی لیکن جنگ کے بادل چھائے رہے۔ بھارت کے اس وقت کے وزیراعظم شاستری نے ان الفاظ میں پاکستان کو للکارا۔ "ہم اب اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے۔" بھارتی فوجوں کی نقل و حرکت بتا رہی تھی کہ اب وسیع پیمانے پر جنگ ہوگی۔ بھارت کو اپنی جنگی طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ پاکستان کو ریت کی ڈھیری سمجھتا تھا۔ پاک فوج چوکس ہوگئی۔ چوکس ہونے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام فوج کا ایک شعبہ کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ایسے غیر فوجی افراد کو بھی استعمال کیا جاتا ہے جو دشمن کے

علاقے سے واقف ہوں اور اس قسم کی اداکاری کر سکیں کہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔

شریف فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پریشان اور مایوس پھر رہا تھا۔ وہ انتقام کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے بھرتی ہونے کے لیے کسی سے بات کی تو اُسے بتایا گیا کہ ملٹری انٹیلی جنس کو آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وہ گیا تو اسے بتایا گیا کہ دشمن کے علاقے میں جا کر بھارتی فوجوں کی مورچہ بندی اور پوزیشنوں کے متعلق معلومات فراہم کرنی ہے۔ شریف مشرقی پنجاب سے خوب واقف تھا۔ وہ سرحد کا کیڑا تھا۔ اس نے صاف بتایا کہ وہ سمگلر ہے اور دشمن کے علاقے میں کوئی شک پیدا کیے بغیر گھومنا پھرنا خوب جانتا ہے۔ اُسے جاسوسی کے لیے رکھ لیا گیا۔

دو چار روز کی ہدایات کے بعد اُسے بھارتی علاقے میں بھیجا گیا۔ وہ اس طرف کے دیہاتی کسان کے بھیس میں لاپرواہی سے گھومتا پھرتا رہا اور کامیابی سے واپس آگیا۔ پھر اس کے ساتھ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک دو آدمی بھیجے گئے۔ انہیں وہ دیہاتی لباس میں لے گیا۔ اُس نے نہایت استادی سے سرحد پار کی۔ ایسے حالات میں جب سرحد پر دشمن کی فوج موجود ہو اور باڈر سیکورٹی فورس کی گشت بھی ہو۔ سرحد پار کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ شریف نے یہ مشکل آسان کر دی اور وہ دوسرے مشن سے بھی کامیاب واپس آیا۔ دوسری بار اُس کے ساتھ فوجی تھے۔ جنہوں نے دشمن کی وہ پوزیشنیں دیکھ لیں جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ شریف کی تعلیم کل چھ جماعت تھی اور عملی تجربہ صرف سمگلنگ کا تھا لیکن اس کے اندر جو جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ اُس نے اس کی ذہانت بیدار کر دی تھی۔ اُسے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ اتنا زیادہ ذہین آدمی ہے۔ وہ دوسرے مشن میں ہی سمجھ گیا کہ فوج کو کس قسم کی معلومات درکار ہیں اور فوج کا ڈیپلائے کیا ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی فوجی اس کے ساتھ جائے۔ وہ اب خود جانے لگا اور نہایت کارآمد معلومات لانے لگا۔

اُس نے ایک ڈھنگ اور اختیار کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے بھارتی فوج کے اگلے دستے

سپاہیوں کو اغوا یا گمراہ کر کے اپنی فوج کے پاس لانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے کا صرف ایک واقعہ سُنا دینا کافی ہوگا۔ ایک روز وہ سرحد پار کے کسی سرحدی قصبے میں اپنے مشن پر گیا ہُوا تھا۔ لاریوں کے اڈے پر اُس نے دو مرہٹے سپاہی دیکھے جن کی بٹالین سرحد پر مورچہ بند تھی۔ یہ دونوں سپاہی چھٹی کاٹ کر آئے تھے۔ یا کہیں سے ڈیوٹی پر آئے تھے۔ معلوم نہیں انہیں لاریوں کے اڈے پر کیوں اتار گئے تھے۔ بہرحال شریف نے دیکھا کہ یہ سپاہی کسی گاؤں کا راستہ پوچھ رہے تھے۔ اُن کی بٹالین وہاں تھی۔ پنجاب کے علاقے اور زبان سے وہ واقف نہیں تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے تھے

شریف نے انہیں چائے کی پیالی پر پھانس لیا اور انہیں یہ تسلّی دے لی کہ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کی بٹالین کے مورچوں سے واقف ہے۔ انہیں چائے اور گپ شپ میں اُلجھائے رکھا تاکہ ذرا شام ہو جائے۔ کچھ وقت بعد وہ انہیں ساتھ لے گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ شریف اپنی بھارتی فوج کی بے پناہ تعریفیں کر رہا تھا اور پاکستان کو گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ سپاہی بڑی سادگی میں اس کے ساتھ چلتے آئے اور انہیں اس وقت اپنی سادگی کا احساس ہوا جب اُنہوں نے دیکھا کہ وہ جس پوسٹ میں پہنچا دیے گئے ہیں وہ پاکستان کے رینجرز کی پوسٹ ہے۔ رینجرز نے ان بھارتی سپاہیوں کو فوج کے حوالے کر دیا۔

پھر چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح طلوع ہوئی۔ سرحد پر توپیں گرج رہی تھیں۔ ٹینک دھاڑ رہے تھے۔ مشین گنوں اور رائفلوں نے قیامت کا شور بپا کر رکھا تھا۔ ہندو اٹھارہ سالوں کی تیاری کے بعد پاکستان کو فتح کرنے آیا تھا۔ پہلے روز ہی ہر محاذ پر حملہ روک لیا گیا۔ بھارتی فوج کسی نہ کسی طرف سے آگے بڑھنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ شریف پاک فوج کے کسی ڈویژن یا بریگیڈ کے ساتھ جاسوسی کے لیے موجود تھا۔ اسے اب ایک اور قسم کی ڈیوٹی دی گئی۔ یہ کمانڈو اپریشن تھا۔ دُشمن کے مورچوں کے پیچھے جا کر کسی بتائے ہوئے ٹارگیٹ کو تباہ کرنا ہوتا تھا۔ کبھی پتہ چلتا تھا کہ کسی گاؤں میں دشمن نے تیل، پٹرول یا ایمونیشن کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ اسے تباہ کرنے کے لیے کمانڈو پارٹیاں بھیجی جاتی تھیں اور ایسے ہی کچھ اور مشن تھے جن میں شریف کو گائیڈ کے طور پر بھیجا گیا۔

اس نے نہایت جانفشانی اور خوبی سے راہنمائی کی۔ اپنے جانباز فوجیوں کو کمال دلیری سے دُشمن کے عقب میں تباہی مچاتے دیکھا مگر اسے افسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے افسروں سے کہا کہ اسے بھی ہتھیار دیا جائے اس نے جب اپنے جذبات کا اظہار کیا تو اسے ایک سٹین گن دے دی گئی۔ اسے سٹین گن کے استعمال کا تھوڑا سا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں ہندوؤں سے انتقام لے لیا۔ لیکن وہ ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ایک شام وہ پاک فوج کی ایک پارٹی کے ساتھ گائیڈ بن کر جا رہا تھا۔ یہ ٹارگیٹ بھی دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں تھا۔ راستے میں ایک پل آگیا۔ جس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اُس نے پارٹی کو پیچھے چھپا رہنے دیا اور خود دریا پار کرنے کا کوئی اور ذریعہ یا ایسی جگہ دیکھنے چلا گیا۔ جہاں دریا گہرائی میں نہ ہو۔ وہ سب سے پہلے پل کا جائزہ لینے گیا۔ جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر اُس نے پل کے قریب جانے کی بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جنگ کی حالت میں کوئی پل ایسا نہیں ہوتا۔ جو فوج کی نگرانی میں نہ ہو۔ اسے پل پر روک لیا گیا۔ اس نے چرب زبانی اور ایکٹنگ سے سپاہیوں کو قائل کر لیا کہ وہ ہندو کسان ہے اور قریب ہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔

اس کی بدقسمتی کہ ایک سکھ حوالدار آگیا۔ اس نے کہا کہ اس کی تلاشی لو۔ شریف نے کپڑوں کے اندر سٹین گن چھپا رکھی تھی۔ اُس نے بھاگنے کا فیصلہ کیا مگر اس کے تین طرف سپاہی تھے اور چوتھی طرف دریا۔ اسے زیادہ خیال ان چار جانبازوں کا تھا جو قریب ہی چھپے تھے۔ اس کے سامنے یک دقت دو مسئلے تھے۔ ایک اپنے فرار کا اور دوسرا پاک فوج کے جوانوں کو بچانے کا۔ اس نے اپنے سب سے قریب کھڑے بھارتی سپاہی کو کسی طرح ذرا پیچھے کر دیا اور بجلی کی سی تیزی سے دوڑ کر دریا میں کود گیا۔ اندھیرے میں اس کے پیچھے کئی گولیاں فائر ہوئیں۔ جن میں سے ایک گولی اس کے کندھے میں لگی۔ خوش قسمتی سے ہڈی بچ گئی۔ گولی گوشت میں سے گزر گئی۔

اس نے پروانہ کی اور ڈبکی لگا کر پُل کے نیچے سے گزر گیا۔ روشنی راؤنڈ فائر ہوئے دریا روشن ہوگیا۔ شریف نے زیادہ سے زیادہ دیر پانی کے اندر رہنے کی کوشش کی اور وہ خطرے سے نکل گیا۔

کیا اس کا یہ کارنامہ معمولی تھا؟ وہ آگے جا کر دریا میں سے نکلا۔ قمیض پھاڑ کر خون روکنے کی کوشش کی اور اس جگہ واپس گیا جہاں وہ چار جوانوں کی پارٹی کو چھوڑ آیا تھا؛ اگر اس کا یہ کارنامہ تفصیل سے بیان کیا جائے تو بے شمار صفحات صرف اسی کے لیے درکار ہوں گے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر یہ نہ بتایا کہ وہ زخمی ہوگیا ہے۔ وہ انہیں کسی اور طرف لے گیا اور جب یہ پارٹی اپنا کام کر چکی تو وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے گر پڑا۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر لے آئے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ختم ہوگئی۔ لیکن شریف نے ایسے محسوس کیا۔ جیسے یہ اس کی زندگی کے مشن کی ابتدا تھی۔ اُس نے پاک فوج کو جاسوسی کے لیے خدمات پیش کر دیں۔ جب فوجیں سرحدوں سے ہٹ گئیں تو وہ بھارت کے اندر جا کر جاسوسی کرنے لگا اسے سرحد پار کرنے اور کرانے کی خصوصی مہارت حاصل تھی۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک اس نے کئی بار بھارت جا کر انٹیلی جنس کے لیے بڑی اہم معلومات اور دستاویزات حاصل کیں۔ دوسرے جاسوسوں کو کئی بار سرحد پار کرائی۔ اس کا ہر مشن کامیاب ہوتا تھا، مگر ۱۹۷۰ء میں وہ ایک ایسے سکھ جاسوس کے ساتھ چلا گیا۔ جو ڈبل ایجنٹ تھا یعنی وہ درپردہ دونوں ملکوں کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ اب شریف اس کے ساتھ گیا تو اس ڈبل ایجنٹ نے اسے گرفتار کرا دیا۔ یہ حیران کن نہیں کہ پاکستان نے ایک سکھ کو اپنا جاسوس بنا رکھا تھا۔ ایسا ہر ملک میں ہوتا ہے کہ ایک حریف ملک کے باشندوں سے ہی جاسوسی کرائی جاتی ہے۔ پاکستان میں آپ کو پاکستانی بھارت کے لیے جاسوسی کرتے نظر آئیں گے۔

بھارت کی سیکورٹی فورس ایک عرصے سے شریف کے نام سے واقف ہو چکی تھی اور

اسے گرفتار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ مگر شریف ان کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اس سکھ نے اُسے بڑے ڈرامائی طریقے سے گرفتار کرایا۔ شریف اُسے جانتا تھا۔ وہ سرحد پار کر کے اس سکھ کے گھر چلا گیا۔ سکھ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی جوان بیٹی کو اس کے پاس ایک کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔ شریف نے اسے حفاظتی اقدام سمجھا۔ سکھ اپنی بیٹی کو اس لیے اس کے ساتھ بٹھا گیا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے، اس کی بیٹی کے ساتھ باتوں میں مگن رہے گا۔

بہت دیر تک سکھ نہ آیا تو شریف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ تو اسے پولیس کھڑی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ جال میں پھنس گیا ہے۔ اس نے سکھ کی بیٹی سے کہا کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور اس نے اسے (بیٹی کو) آلۂ کار بنایا ہے۔ بیٹی طیش میں آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ پاکستان کا جاسوس ہے اور شریف اسی کام کے لیے پاکستان سے آیا ہے شریف نے اسے کہا کہ وہ کھڑکی سے نکل جائے گا۔ لیکن اسے گولی مار دی جائے گی۔ سکھ کی بیٹی نے اسے کہا —— "میں کھڑکی میں سے نکلتی ہوں تم میرے پیچھے نکلو اور میرے پیچھے ہی رہنا۔ وہ مجھے گولی نہیں ماریں گے۔ اگر انہوں نے گولی چلا بھی دی تو پہلے میں مروں گی۔ میرا باپ دھوکہ باز نکلا تو میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں پنجاب کی جٹی ہوں" —— لیکن شریف ایک جوان لڑکی سے اتنی قربانی لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اُس نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس نے اس سے خوب بدلے لیے۔ اُسے اتنی اذیتیں دیں کہ وہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہا۔ اسے مرنے بھی نہ دیا گیا۔ بھارتیوں کو معلوم تھا کہ وہ معمولی قسم کا جاسوس نہیں۔ اُنہوں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی اور کچھ عرصہ بعد قیدیوں کے تبادلے میں اسے پاکستان بھیج دیا——

آج ہماری تاریخ کا یہ درخشاں باب ایک کھوکھے میں بند ہو گیا ہے۔ اس باب کا ہیرو ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہو کر اس کھوکھے میں چائے بناتا نظر آتا ہے اور جب اس کا کوئی گاہک نہیں ہوتا تو وہ سر جھکائے گہری سوچوں میں کھو جاتا ہے۔ شاید اپنے ماضی کو تلاش کرنے لگتا ہے۔

کیا وہ پتھر تھا؟

یہ اس انسان کی کہانی ہے جس کے متعلق بھارت کے ۱۹۶۵ء کے ہوم منسٹر گلزاری لال نندہ نے کہا تھا۔ "اسے ضرور سزا ملنی چاہیئے۔" اس وقت اندرا گاندھی وزیر اطلاعات تھی۔ اس نے متعلقہ عدالت کو یہی الفاظ لکھے تھے۔ "اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔" اسے گرفتار کرنے والے ڈی ایس پی جالندھر انٹیلی جنس، گپتا نے کہا تھا۔ "مجھے آج پہلی بار اپنے ڈی، ایس، پی ہونے کا احساس ہوا ہے۔" جالندھر کے اخبار "پرتاب" مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء نے لکھا تھا۔ "محمد حسین جاسوس کی گرفتاری پر جالندھر کی مقامی انٹیلی جنس جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ بھارتی افواج کے راز کس طرح پاکستان پہنچتے ہیں۔"

محمد حسین کو ستمبر ۱۹۶۲ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری جالندھر میں اسی کے قائم کردہ "پلاسٹک کے کارخانے" سے عمل میں آئی تھی۔ اس کے متعلق چھ مہینے تک اخباروں کو مکمل مواد ملتا رہا۔ بھارت کے تمام بڑے بڑے اخبار نمایاں طور پر خبریں شائع کرتے رہے۔ آخر سنٹرل گورنمنٹ کو ایک حکم کے ذریعے اخبارات کو اس کے کارنامو کی مسلسل اشاعت سے روکنا پڑا۔ کیونکہ بقول اس وقت کے ڈیفنس سیکرٹری کے اس میں پردہ نشینوں کے نام بھی آتے تھے۔

محمد حسین ۱۹۶۰ء کے اوائل میں بھارت گیا اور ستمبر ۱۹۶۲ء میں پکڑا گیا۔ بلکہ پکڑوا دیا۔ ستمبر ۱۹۷۴ء میں وہ رہا ہو کر پاکستان واپس آگیا ہے۔ جس شخص نے تیرہ سال جاسوسی کے الزام میں بھارت کی قید کاٹی ہو۔ اسے دل سے اتارنے کے لیے کم از کم

تیرہ صدیاں تو گزارنی چاہیے تھیں۔ لیکن ہم اسے دل میں جگہ ہی نہیں دی۔ قیامِ پاکستان سے ہی بھارت کی کانگرس قیادت نے پاکستان کو جس طرح ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیے تھے۔ وہ ایک کھلا راز ہے۔ اس کی کڑیاں آپ "حکایت" میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دشمن کے مکروہ عزائم سے خبردار۔ اور آگاہ رہا جائے اس کے لیے دشمن کی ایک ایک لمحے کی خبر درکار تھی۔ تاکہ قبل اس کے کہ دشمن بڑھ کر ہمیں نگل لے، ہم خود آگے بڑھ کر اس کا گلہ دبا دیں۔ اس مقصد کے لیے محمد حسین کو ۱۹۶۰ء میں بھارت بھیجا گیا۔ اُس نے بھارتی وزارت دفاع کے کئی ایک اہم راز اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان پہنچا دیے۔ اس ولولہ انگیز کہانی کا یہ حصہ کہ اُس نے یہ راز کس طرح پاکستان پہنچائے۔ ایک ایسا راز ہے۔ جس سے پاکستان کی تاریخ ہمیشہ بے خبر رہے گی۔ ایسے راز مصلحتاً" بتائے نہیں جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جاسوس یا کمانڈو پورے بریگیڈ جتنا کام کر دیتا ہے۔ محمد حسین کے متعلق صرف یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو بن کر انڈین پاسپورٹ پر پاکستان آیا تھا۔ ان دنوں ہندو سندھ میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں محمد حسین ایک مخبر کی اطلاع پر جالندھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری قاضی پورہ میں ہوئی تھی۔ جہاں اس نے پلاسٹک کی اشیاء بنانے کا ایک کارخانہ قائم کر رکھا تھا۔

تفتیش کے جن جن مراحل سے اسے گزارا گیا وہ وہی بیان کر سکتا ہے۔ میں نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب پہلی بار اسے بھارت کی نابھہ جیل میں دیکھا اور اس کے متعلق باتیں سنیں تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ دشمن کی دی ہوئی مختلف ذہنی اور جسمانی اذیتوں نے اسے بہت لاغر کر دیا تھا۔ لیکن کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں اس امر کی غماز تھیں کہ یہ شخص ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے ہی حوصلہ دینا شروع کر دیا اور کہا۔ "گھبرانا نہیں بس اب ہم جلد ہی رہا ہو جائیں گے۔ میں ہکا بکا اس کا منہ دیکھے جا رہا تھا کہ ۹ سال قید کاٹ کر بھی وہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ بھارت کی جیل میں ہر پاکستانی قیدی کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ جانے کتنے

پاکستانیوں کو اس نے جیل میں قرآن پڑھنا سکھایا، نماز پڑھنا سیکھائی۔ اُردو، ہندی اور گورمکھی سکھائی اور ان کو کتنے ہی خطرناک اور اذیت ناک مراحل سے بخیر و خوبی گزار لے گیا۔

اس پر سب سے پہلے تعزیرات ہند کی دفعات ۲۰/۲۴/۳ اور انڈین نارسیز ایکٹ کی دفعہ تین کے تحت مقدمہ چلا گیا۔ جالندھر کی عدالت نے اس جرم میں دو سال قید کی سزا سنائی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ جالندھر سے رہا ہو گیا۔ لیکن وہیں نظر بند کر دیا گیا۔ پردیس کا دکھ ہی کیا کم تھا۔ اسے مسلسل جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ انٹیلی جنس نے اسے جیل میں ہی مروانے کی کوشش کی تھی۔ ایک سکھ بدمعاش سے اس پر حملہ کروایا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد شاملِ حال تھی کہ وہ چاقو کے حملے سے صاف بچ گیا۔ یہ کچھ تو ہو ہی رہا تھا کہ قدرت نے اُسے اس کڑے امتحان میں بھی ڈالا کہ اس کی والدہ اس کے غم میں انتقال کر گئیں۔ محمد حسین نے یہ صدمہ اپنی ٹھوس شخصیت میں جذب کر لیا۔ اور اپنے فرائض میں محو رہا۔ اب اس کا فرض یہی رہ گیا تھا کہ قید و بند میں دشمن کی اذیتیں برداشت کرے اور اسے کچھ نہ بتائے۔ اس کے متعلق ڈپٹی جیلر اے۔ سی پال جو بھارت کی مشہور فلم "دو آنکھیں بارہ ہاتھ" کا کہانی نگار اور مشہور افسانہ نگار بھی ہے، نے کہا تھا۔ "محمد حسین کے اعصاب پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔"

۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ محمد حسین دشمن کی نظر بندی یعنی ظالمانہ قید میں تھا۔ جنگ کے بعد جالندھر کی سیشن کورٹ میں اس کے خلاف جاسوسی کا مقدمہ چلا گیا۔ رتن لال گرگ اے ڈی ایم جالندھر کی عدالت سے یہ کیس کرتار سنگھ ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں گیا تھا۔ جہاں پر اس وقت کے ہوم منسٹر گلزاری لال نندہ آفس سیکرٹری پی ایل گپتا عدالت کے نام اس کا یہ خصوصی حکم "اسے دفعات ۲/۵/۱ کے تحت ضرور سزا دی جائے" لے کر آیا تھا۔ محمد حسین کو پندرہ سال کی سزا دی گئی۔ لیکن اپیل پر کیس ہائی کورٹ میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کی سماعت انڈیا کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے بھائی جگجیت سنگھ بیدی نے کی۔ حصہ [illegible] مال یہ تھی کہ محمد حسین کے خلاف حکومت کے پاس

کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ زبان سے وہ کچھ نہیں مانا تھا۔ صرف ایک مفروضہ کی بنا پر اسے جاسوس ثابت کیا جا رہا تھا۔ اس عدالت میں پنجاب گورنمنٹ کے سٹیٹ کونسلر نے اس پر جو سب سے بڑا الزام لگایا وہ یہ تھا کہ اس کے بہت سارے دوست ہندو ہیں۔ یہ خود پاکستانی ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ انڈیا میں اس کا دو سال سے مستقل قیام ہے۔ اس لیے جاسوس ہے۔

جج کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے سزا دے تو کس جرم میں۔ اُس نے سٹیٹ کونسلر سے کہا تھا۔ "میرے ۹۶ فیصد دوست مسلمان ہیں۔ میں انڈین ہوں ایک معزز عدالت کا جج ہوں اور ۹۰ فیصد دوست پاکستانی ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں غدار اور جاسوس ہوں؟" سرکاری وکیل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ہائی کورٹ نے محمد حسین کو بری کر دیا۔ اسی اثنا میں انفارمیشن منسٹر مسز اندرا گاندھی کا حکم نامہ حکومت پنجاب کے نام آ گیا کہ اس پاکستانی کو ضرور سزا دی جائے۔ چنانچہ محمد حسین کو ڈیفینس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد فوراً محمد حسین کو اطلاع ملی کہ اس کی جوان بہن بیوہ ہو گئی ہے بھائی ایک ہی تھا۔ جو ابھی کمانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ سارا بوجھ بوڑھے باپ کے کندھوں پر آن پڑا۔ جو بیٹے کی رہائی کے لیے دن رات اربابِ اختیار کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔

۱۹۶۷ء میں نظر بندی ختم کر کے اس پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۸۲ کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا۔ یعنی وہ ہندو بن کر پاکستان گیا تھا۔ قانون کی صریحاً دھجیاں اڑا کر اسے ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ جبکہ زیادہ سے زیادہ سزا اس دفعہ کے تحت ۶ ماہ اور جرمانہ ۵۰۰ روپے تھا۔ اس کے بعد کئی دور آئے کبھی اسے تین ماہ کی سزا ملتی کبھی چھ ماہ کی۔ کبھی کوئی دفعہ عائد کر دی جاتی کبھی کوئی دفعہ۔ ذہنی طور اسے بہت جھٹکے دیے گئے۔ کئی دفعہ اسے رہائی کے لیے سرحد پر لے جا کر اور پاکستان کا جھنڈا دکھا کر واپس لے گئے۔ حکومت حیران تھی کہ ابھی تک وہ شخص زندہ ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں اسے تین پاکستانی قیدیوں الطاف شاہ، گلزار اور مجید کے ساتھ اس طرح رہا کیا گیا کہ جیل

کے باہر ایک ٹرک مسلح گارد کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ چاروں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور ٹرک نامعلوم سمت کو روانہ ہو گیا۔ اس دوران جب انہوں نے آپس میں بات کرنے کی کوشش کی تو انہیں سختی سے منع کر دیا گیا۔ کافی دیر ٹرک کو ایک جگہ کھڑا کیا گیا۔ یہاں سے میں باقی کہانی آپ کو محمد حسین کی زبانی ہی سناتا ہوں۔ "مختلف قسم کی آوازوں نے مجھے احساس دلایا کہ یہ کوئی چھاؤنی ہے یا چھاؤنی قسم کی کوئی جگہ۔ ٹرک رک گیا۔ کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک گونج دار آواز بلند ہوئی۔ تمہیں اب سے پانچ منٹ بعد گولی مار دی جائے۔ پانچ منٹ آپس میں بات چیت کر سکتے ہو۔ مرنے جینے کے کئی مراحل سے میں گزر چکا تھا۔ لیکن ایسے موقع پر صرف یہ سوچ کر پریشان ہو جایا کرتا تھا کہ میری لاش کو پاکستانی مٹی نصیب نہیں ہو گی۔ ابھی تک اس اُمید پر زندہ تھے کہ دفنائے اپنے وطن میں جائیں گے۔

آواز سنائی دی۔ "گلزار مسیح!" اور اسے نیچے اتار لیا گیا۔ خدا حافظ۔ اس نے بمشکل لفظ ادا کیے۔ ایک آدھ منٹ بعد تین فائروں کی آواز سنائی دی۔ "گیا" الطاف شاہ کے منہ سے نکلا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" ہم تینوں نے پڑھا۔ دو منٹ الطاف شاہ کی باری آئی۔ اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر۔ پھر ملیں گے اگر خدا ملایا۔ اس نے پُرسکون آواز میں شعر پڑھا اور سوئے مقتل چل دیا۔ تیسری بار تین فائر ہوئے۔ میں اپنی باری کا منتظر تھا کہ اچانک ٹرک چل پڑا۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی اور مجھے ایک جیپ میں منتقل کر دیا گیا۔ جیپ انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں بالکل سکون بیٹھا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرے ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔

"تمہارے لیے کوئی اور جگہ منتخب کی گئی ہے۔" حسین کو اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔ محمد حسین خاموش رہا۔

"یہ لوگ ایسے وقت میں نجانے چپ کیوں سادھ لیتے ہیں۔ پچھلی دفعہ بھی اس انسان نے مرنے تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا، اس افسر نے کہا۔ یعنی اس سے پہلے بھی وہ یہ کام کئی دفعہ کر چکے تھے اور ان کی دانست میں مرنے سے پہلے مسلمان کو گڑگڑا کر

اپنی جان کی بھیک مانگنی چاہیے تھی۔ جیپ ایک سرحدی چوکی پر رُک گئی۔ شام کا وقت ہو چکا تھا اور مغرب کی اذان کی آواز پاکستانی پوسٹ کی طرف سے آ رہی تھی۔ محمد حسین کی آنکھیں باندھ دی گئیں۔ ساری رات وہ انڈین پکٹ کے ایک کمرے میں بندموت کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن پاکستانی سرحدی چوکی سے صبح کی اذان سنائی دینے لگی۔ محمد حسین گولی مارنے کے بجائے واپس لے گئے۔ یہ ذہنی اذیت دینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسے راجہ تال کمپنی ہیڈکوارٹر میں لے گئے اور ایک قصائی قسم کے بھارتی ڈی ایس پی (بارڈر سیکورٹی فورس) بھلر کے سپرد کر دیا۔

"کون ہے؟" بھلر نے بڑے اکھڑ سے لہجے میں ڈیوٹی سنتری سے پوچھا۔

"جناب پاکستانی جاسوس محمد حسین ہے۔"

"اوے تو محمد حسین ہے؟" اس نے محمد حسین کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا — "سانپ سے ڈسوا کر مار دو۔"

محمد حسین واپس جیل میں چلا گیا۔ جہاں معلوم ہوا کہ وہ محض ڈھونگ تھا۔ یہ اسے انتہا درجے کی ذہنی اذیت پہنچانے کی ایک اور ناکام کوشش تھی۔ پھر گلزار اور الطاف کو اجنالے اور مجید کو کھیم کرن اور محمد حسین کو راجہ تال پہنچا دیا گیا۔ سب کو ایک دوسرے کے متعلق یہی کچھ بتایا گیا کہ اسے مار دیا گیا ہے۔ لیکن سب زندہ تھے۔ یہ بھی ذہنی اذیت کا ایک طریقہ تھا کہ گولیاں چلا کر سب پر موت کا خوف طاری کیا جائے۔

اگست ۷۰ء میں محمد حسین کو بوڑھے باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ چھ سال اس بوڑھے آدمی نے رفیقۂ حیات کا صدمہ برداشت کیا تھا اور آٹھ سال سے اس کی آنکھیں بیٹے کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ اُدھر سے لڑکی بیوہ ہو گئی۔ یہ صدمے کب تک برداشت ہوتے۔ آخر ایک روز یہ آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ اب جوان بیوہ بہن دو بچوں اور ایک بھائی کے ساتھ جو کسی قابل ہو گیا تھا۔ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی کہ اطلاع ملی۔ "مکان بھی چھن گیا ہے۔" یہ انعام تھے جو قدرت اور قوم کی طرف سے نوازے جا رہے تھے۔

"دیکھا!" محمد حسین نے مجھے بھارت کی ایک جیل میں ۱۹۷۱ء میں کہا تھا "یہ میرا

اعتماد پن کی انتہا ہے کہ میں زندہ ہوں اور ملک و قوم کے لیے جہاد کر رہا ہوں۔" پھر وہ ۷۱ء تک ہمارے ساتھ ہی مختلف جگہوں میں پستا رہا کبھی نظر بند کبھی رہائی۔ کبھی حوالاتی کبھی قیدی۔ بس وہ تو پتھر کا انسان بن چکا تھا۔ پھر ایک روز وہ ہمارے ساتھ رہا ہو کر پاکستان آ گیا۔

سات دن تک ہم اس کا گھر ڈھونڈتے رہے۔ آٹھویں روز گھر ملا۔ وہ بھی اُجڑا ہوا اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ گھر تو گردشِ زمانہ کی نذر ہو چکا تھا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں وہ بہن اپنا بیمار وجود اور دو بچوں کا بوجھ لیے سسک سسک کر زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ مسلسل حادثات نے چھوٹے بھائی کو نوعمری میں ہی پختہ آدمی بنا دیا تھا۔

آج محمد حسین کو رہا ہوئے تیرہ ماہ ہونے کو ہیں لیکن ہنوز گھر کی حالت وہی ہے۔ وہ ایک خوشحال گھر چھوڑ کر ملکی خدمت کو گیا تھا۔ جان کی بازی لگائی تھی۔ آج واپس آیا ہے تو ہم نے اسے یہ کچھ دیا ہے۔ وہ ابھی تک بیمار ہے اور حیران بھی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

دلّا مینٹل

یہ کہانی ایک پاکستانی جاسوس کی ہے۔

اگر آپ مشرقی پنجاب (بھارت) کے کسی جیل خانے میں بھی جائیں۔ جہاں جاسوسوں کو قید میں رکھا جاتا اور ان سے ان کے پورے رنگ (گروہ) کی نشاندہی کرانے کے لیے انہیں درندوں کی طرح چیرا پھاڑا جاتا ہے۔ وہاں آپ "دلّا مینٹل" کا نام ضرور سنیں گے یہ اصل نام عبداللہ ہے جو سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کی پولیس کے ریکارڈ میں دلّا بدمعاش بستہ الف کے نام سے درج ہے۔ اسے "دلا مینٹل" کا خطاب بھارتی پولیس، انٹیلی جنس اور جیل خانے کے سٹاف اور نامی گرامی جرائم پیشہ قیدیوں نے دیا تھا۔ مینٹل سے ان کی مراد مینٹل کیس یعنی پاگل تھی۔ دلّا جاسوسی کے فن میں پاگل پن کی حد تک دلیر تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بھارتی فوج نے سیالکوٹ سرحد پر جسڑ کے مقام پر حملہ کیا۔ یہ ایک دھوکہ تھا۔ ان کا بڑا حملہ شمال کی جانب سے سامبا کی طرف سے آرہا تھا۔ یہ ان کے ٹینک ڈویژن کی یلغار تھی۔ جو ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح آئی۔ اس سے پہلے دشمن پاک فوج کو یہ جھانسہ دینا چاہتا تھا کہ وہ جسڑ کی طرف سے حملہ کرے گا تاکہ پاک فوج اپنا دفاع اس طرف منتقل کر دے۔ آج کے دور میں جاسوسی یعنی انٹیلی جنس اور کمانڈو اپریشن کے بغیر جنگ جیتنا ممکن نہیں۔ کمانڈو اپریشن کے بعد لڑاکا گشتی پارٹیوں (فائٹنگ پٹرول) اور ٹینک ہنٹنگ (ٹینک شکار) پارٹیوں کا نمبر آتا ہے "حکایت" میں کئی بار ان کی تشریح کی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ان پارٹیوں کے جوان کس طرح دشمن کے مورچوں کے علاقے میں اندر یا عقب میں چلے جاتے ہیں اور دل میں یہ ٹھان کر تباہی مچاتے ہیں کہ وہ زندہ واپس

نہیں آئیں گے۔ ذرا تصور فرمایئے کہ دو تین ہزار نفری کی فوج کے مورچوں میں دس یا بارہ جوانوں کا گھس جانا اور تباہی بپا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ صرف تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جسڑ پر حملے سے پہلے پاک فوج کی انٹیلی جنس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ جسڑ کے سامنے دشمن کا فوجی اجتماع کہاں ہے۔ جسڑ کے قریب دریا کا پل ہے۔ جس کے سامنے کھینا نام کا ایک بھارتی گاؤں ہے اس سے کچھ آگے سے ایک سڑک شکارپور سے بٹالہ کو جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف بھارت کے پگٹانے، ردسے، پکھیوں وغیرہ نام کے گاؤں آباد ہیں۔ یہ تمام گاؤں تھانہ ڈیرہ بابا نانک میں ہیں اور ان کی تحصیل بٹالہ ہے ان دیہات کے علاقے میں بھارتی فوج کا اجتماع تھا۔ جسے جسڑ کے حملے کو کمک دینی تھی۔ یا سیالکوٹ کی سرحد پر کسی اور مقام پر حملہ کرنا تھا۔ ڈیرہ بابا نانک سے بذریعہ ریل گاڑی امرتسر جائیں تو راستے میں رتڑ شتڑ نام ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن آتا ہے۔ اس کے قریب دشمن نے ایمونیشن کا ذخیرہ رکھا تھا۔ دشمن کی جنگی طاقت پاک فوج کی نسبت پانچ گنا سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ صرف افرادی قوت سے کریں تو سیالکوٹ، چونڈہ اور جسڑ سیکٹروں میں دشمن کی پچاس نفری نے حملہ کیا تھا۔ جسے روکنے کے لیے پاک فوج کی کل نفری نو ہزار تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانوں کا تناسب بھی یہی تھا۔ ایسی صورت حال میں ضرورت محسوس کی گئی کہ کمانڈو اپریشن سے دشمن کو تیاری کی حالت میں درہم برہم کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے چند ایک جانباز دشمن کے بریگیڈ (غالباً اس سے کہیں زیادہ فورس) پر حملہ کرنے کے لیے جائیں اور مطلوبہ نتائج حاصل کریں۔

پاک فوج کی شجاعت کا یہ پہلو ڈھکا چھپا رہتا ہے۔ اس کی تفصیلات سے ہماری تاریخ ہمیشہ بے خبر رہے گی۔ کیونکہ تفصیلات جنگی راز ہیں۔ ایک کمانڈو پارٹی منتخب کی گئی جس کے ارکان کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس میں کون کون تھے اور وہ کہاں کہاں کے رہنے والے تھے۔ ہم یہی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان کی دیہاتی ماؤں کے جوان بیٹے تھے اور وہ صرف

پانچ تھے۔ انہیں ایسے علاقے سے گزر کر دشمن کے عقب میں جانا تھا۔ جہاں دشمن کی فوج پھیلی ہوئی تھی اور جہاں مشین گنوں اور دیگر تمام ہتھیاروں نے فضا میں آگ کا جال تان رکھا تھا۔ دونوں طرف کے توپ خانے گولہ باری کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس علاقے سے واقفیت نہیں تھی۔ راہنمائی کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بھارت کے اس علاقے کے ایک ایک انچ سے واقف ہونے کے علاوہ جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ اسے پارٹی کو تارگیٹ تک لے جانا تھا اور اگر کوئی جانباز زندہ رہ جائے تو اسے واپس لانا تھا۔

یہ ایک ایسی ضرورت تھی جو پوری نہ ہوتی تو کمانڈو پارٹی کو بھیجنے کا مطلب صرف یہ رہ جاتا کہ راستے میں بھٹک جائے اور دشمن کے ہاتھوں ختم ہو جائے۔ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک ایسا شخص سامنے آیا جو بستہ الف کا بدمعاش (غالباً اب بھی بستہ الف میں ہی ہے) اور سمگلنگ بھی کرتا تھا۔ وہ معاشرے کے بدنام ترین افراد میں سے تھا۔ یہ تھا دُلّا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسے کہاں بھیجا جا رہا ہے۔ راستے میں دریائے راوی بھی حائل تھا جو ستمبر کے پہلے ہفتے میں سیلابی کیفیت میں تھا۔ دریا کے پار دشمن تھا اور اس کے پیچھے کا علاقہ بھی دشمن کا تھا۔ دُلّے کا زندہ رہنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ ان پانچ کمانڈو جانبازوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو اس جوانی کے عالم میں پاکستان پر قربان ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ رات گہری ہوئی تو وہ انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ اُس نے کچھ فاصلہ دریا کے ساتھ ساتھ طے کیا اور ایک جگہ سے دریا پار کرایا۔ ان سوالوں کے جواب کہ اس جگہ کا نام کیا تھا اور دریا کس طرح پار کیا گیا۔ کبھی بھی نہیں ملیں گے۔ میں نے جب اس سے ان سوالوں کے جواب مانگے تو اس نے کہا تم نے بھی بھارت میں جاسوسی کی ہے۔ بھارت کی جیلوں میں قید بھی کاٹ آئے ہو۔ کیا تم راز کی یہ باتیں کسی کو بتا دو گے؟

اُس نے پارٹی کو دریا پار کرایا اور پارٹی کو کہیں چھپا کر خود اگلے علاقے کو دیکھنے گیا۔ وہاں ایک اور خطرہ نظر آیا۔ اس تمام علاقے میں سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا جنگل ہے۔

بلا کہتے ہیں۔ دُلّا جانبازوں کو اس جنگل میں سے گزار رہا تھا جہاں دشمن کی فوج نہیں تھی۔ مگر سرکنڈوں میں خنزیر، گیدڑ اور ایسے ہی جانور رہتے تھے۔ کمانڈو جوان تو آواز پیدا کیے بغیر احتیاط سے چلنا جانتے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی چھپے ہوئے جانوروں کے ڈر کر بھاگنے کی آوازوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ روشنی راؤنڈ فائر ہوتے ہیں اور اگر قریب کوئی مشین گن پوسٹ ہو تو وہاں سے مشین گنوں کا اندھا دھند فائر شروع ہو جاتا ہے۔

کمانڈو پارٹی کو دُلّا اس خطرے سے بھی نکال کر لے گیا اور انہیں بخیر و خوبی تارگیٹ تک پہنچا دیا۔ دُلّے کی ایک طرف کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب کمانڈو جانبازوں کو اپنا کام کرنا تھا انہوں نے دشمن کے اجتماع کا اندازہ کیا۔ ٹینک دیکھے اور پہلا راؤنڈ فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیے۔ لیکن ان کی روشنی ہمارے کمانڈو جوانوں کے ہی کام آئی۔ وہ تو دشمن کو نظر نہ آئے۔ انہیں کام کے تارگیٹ نظر آ گئے۔ انہوں نے بہت تباہی بپا کی۔ دشمن نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ نکل آئے اور دلّا انہیں قریب کے ایک گاؤں میں لے گیا۔ جہاں اُس کے میل جول کے ہم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ اس نے دن بھر انہیں وہیں چھپائے رکھا اور رات کو اسی طرح واپس پاکستان میں لے آیا جس طرح لے گیا تھا۔ دُلّے کے بغیر یہ مشن کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

جنگِ ستمبر کے سترہ دنوں میں دُلّا ایسی متعدد پارٹیوں کے ساتھ گائیڈ بن کر گیا۔ اس کے بعد مشن کشمیر کے ہیں جہاں اس نے ایک بار انڈین آرمی کے ایک میجر کو اغوا کیا اور پاک فوج کے حوالے کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ انٹیلی جنس کے لیے کام کرتا رہا اور بھارت میں پکڑا گیا۔ جاسوسی کے الزام میں پکڑے ہوئے پاکستانیوں کے لیے امرتسر کا انٹیروگیشن سنٹر (تفتیش کا مرکز) جہنم سے کم نہیں۔ جاسوسوں کی تفتیش میں ایک ہی سوال پر زور دیا جاتا ہے کہ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں ہیں۔ یعنی پورے رنگ کی نشاندہی کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تمام ممالک جانتے ہیں کہ جاسوس اکیلا نہیں ہوتا۔ ایک منظم گروہ جس کا آپس میں رابطہ ہوتا ہے کام کرتا ہے اور یہ گروہ دشمن ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایک جاسوس گرفتار ہو کر سارے

گروہ کی نشاندہی کردے تو پورا رنگ گرفتار ہو کر بیکار ہو جاتا ہے۔ جاسوس کا ایک کمال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن ملک میں داخل ہوتا ہے اور عقل سے کام لے کر اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ حالانکہ وہ دشمن آبادی کے ہجوم میں گھومتا پھرتا ہے۔ اس کی بہادری اور مردانگی کا امتحان اُس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ پکڑا جاتا ہے۔ دشمن کی ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس اس کے ساتھ پیار و محبت کی صرف اتنی بات کرتی ہے کہ اپنا گروہ اور اپنا مشن بتا دو اور عیش کرو۔ اگر وہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دے تو اسے عیش نہیں کرائی جاتی۔ اسے کسی نہ کسی بہانے قید و بند میں رکھا جاتا ہے اور اپنے ملک کے خلاف غداری پر اکسایا جاتا ہے۔ لالچ دیئے جاتے ہیں اور ضرورت پڑے تو تشدد بھی کیا جاتا ہے۔

غرض تفتیش وہ مرحلہ ہے جو دین و ایمان کی بڑی سخت آزمائش کا مرحلہ ہے۔ ہماری انٹیلی جنس کے جو افراد بھارت کی قید سے فرار ہو کر یا کسی معاہدے کے تحت واپس آئے ہیں۔ ان کے جسم گواہی دیتے ہیں کہ وہ بھیڑیوں کی کھچاروں سے نکل کر آئے ہیں۔ تشدد کے ایسے ایسے نشان نظر آتے ہیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض بینائی سے، طاقت گویائی سے، کانوں سے اور بعض دماغی لحاظ سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے ہیں۔ یہ ثبوت ہے ان کے جذبۂ حب الوطنی اور فرض شناسی کا۔ جسموں کا یہ حشر کرا کے بھی انہوں نے دشمن کو ایسی بات نہیں بتائی جس سے ان کے رنگ کو اور ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا اور وہ جانباز جو دشمن کی غیر انسانی اذیتوں سے یا فرار کی کوشش میں فائرنگ سے مر گئے ہیں وہ ہماری تاریخ کے گمنام ہیرو ہیں۔

دُلّا انہی سرفروشوں میں سے ہے۔ اس کے تمام مشن ایک تو طوالت کی وجہ سے بیان نہیں کیے جا سکتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جنگی راز کے زمرے میں آتے ہیں۔ جن سے کبھی بھی پردہ نہیں اُٹھ سکے گا۔ اسے قید اور تفتیش میں وہی اذیتیں دی گئیں جو ہر جاسوس کو دی جاتی ہیں مگر اس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا کہ جاسوس میں نہیں ہوں۔

معلوم ہوا ہے کہ یہ واحد آدمی ہے۔ جسے امرتسر انٹیروگیشن سنٹر میں سب سے زیادہ لمبے عرصے کے لیے رکھا گیا تھا۔ ہندو افسر حیران تھے کہ گوشت پوست کا یہ انسان اتنا زیادہ تشدد اور اتنی ظالم اذیتیں کس طرح برداشت کر رہا ہے۔ اس سے راز اگلوانے کا یہ طریقہ بھی آزمایا گیا کہ اس کے منہ پر غلاظت باندھ دی جاتی۔ کچھ دیر بعد غلاظت ہٹا کر اس سے پھر وہی سوال پوچھا جاتا لیکن دُلّے کا جواب وہی ہوتا کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ قید میں اس کے ساتھ کچھ سکھ قیدی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں ایک دو اس کے رنگ کے افراد تھے۔ وہ دُلّے کو اس وقت دیکھتے تھے جب اسے اذیت رسانی کے بعد (اکثر غشی کی حالت میں) قید میں لا پھینکتے تھے تو اُسے ہاتھ جوڑ کر کہتے تھے۔ "دُلّے! اس طرح کب تک زندہ رہو گے۔ ہمارا نام بتا دو کہ دو یہ میرے ساتھی ہیں۔ ہم سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔"

"میں پاکستانی ہوں میرے دوستو!" — دُلّے کا ہر بار یہی جواب ہوتا تھا۔ "دھوکہ نہیں دوں گا۔ اور اس نے کسی کو دھوکہ نہیں۔ اپنے ملک کو بھی نہیں، اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں۔ تفتیش کے دوران اسے دستاویزی ثبوت دکھا کر کہا جاتا کہ اتنا تسلیم کر لو کہ یہ دستاویزات صحیح ہیں۔ اس کے جواب میں اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلتے تھے۔ "میں ان پڑھ ہوں۔" یہ ہے بھی حقیقت کہ وہ اَن پڑھ ہے مگر ان طالب علموں کا عالم ہے جنہوں نے عمریں کتابوں میں گھال دی ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ہٹ کا انجام موت یا ہمیشہ کی قید یا عمر بھر کی جسمانی معذوری ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا جسم اور جان پاکستان ہے اور پاکستان ہی کے کام آئیں گے۔ اس کے جذبے اور قوتِ برداشت کو دیکھ کر بھارت کے درندہ صفت افسروں نے اسے "دُلّا مینٹل" کا خطاب دیا تھا۔

آخر بھارتی ہار گئے اور اسے تفتیش کے مرحلے سے نکال کر جیل میں ڈال۔ پھر اسے مشرقی پنجاب کی مختلف جیلوں میں تبدیل کیا گیا جن میں نابھہ جیل جیسا ظالم قید خانہ بھی شامل ہے۔ ایسے قیدیوں کو بھارتی کسی باقاعدہ مقدمے کے بغیر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔

اور ان سے سزا یافتہ قیدیوں کی طرح مشقت کراتے ہیں۔ بعض قیدی مشقت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ عالمی قانون کے خلاف ہے۔ اس انکار پر انہیں اذیتیں دی جاتی ہیں اور ایسی تنگ و تاریک اور غلیظ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں حیوان بھی نہیں رہ سکتے۔ ڈلاّ بھی مشقت سے انکار کرنے والوں میں سے تھا۔ اس سے مشقت کرانے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا۔ جو بھارتی بربریت کی فہرست میں تھا۔ مگر وتے نے مشقت نہ کی اور کہا کہ میں تمہارا سزا یافتہ قیدی نہیں ہوں۔

وہ نابھہ جیل میں ہی تھا۔ جب سقوط مشرقی پاکستان کی خبر آئی۔ یہ خبر سنانے والے بھارتی اور بھارتیوں کے اخبار تھے۔ وتے نے جیل میں اودھم برپا کر دیا اور نعرے لگا لگا کر کہا۔ "ساری دنیا آکر کہے کہ پاکستان کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں تو بھی نہیں مانوں گا۔ میری فوج ہتھیار نہیں ڈال سکتی۔" اسے جب جیل کے ہندو عملے نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ خبر صحیح ہے۔ تو اس نے کہا۔ "تم بزدل ہندو! مجھ سے یہ نہیں کہلوا سکتے کہ میں کون ہوں۔ تم مجھ سے مشقت نہیں کرا سکتے۔ تم میں اتنی ہمت کہاں کہ میری فوج سے ہتھیار ڈلوا لو۔" مگر حقیقت اپنے آپ کو تسلیم کروا لیا کرتی ہے۔ وتے کو ماننا پڑا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ پھر بھی اس نے کہا کہ میری فوج کے ساتھ کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ اس کے دل میں اپنی فوج کی جو عقیدت تھی وہ کم نہ ہوئی اور آج بھی کم نہیں ہوئی۔

نابھہ سے اسے امرتسر جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہ بھی بھارت کا ایک بڑا ہی سخت جیل خانہ ہے جہاں سے فرار ناممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ حفاظتی انتظامات بہت مستحکم ہیں۔ کسی پاکستانی قیدی کا فرار تو اور زیادہ ناممکن ہے۔ کیونکہ پاکستانیوں کو جیل خانے کے اس حصے میں رکھا جاتا ہے جو جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ ہے۔ وہاں قیدیوں کو بیڑیاں ڈال کر رکھا جاتا ہے۔ جن سے فرار کی کوشش کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان دنوں امرتسر جیل میں پاکستانی اور بھارت کے ان مسلمان قیدیوں کو جن

(جاسوسی کا الزام ہوتا ہے) کو مشقت کرانے کے لیے جیل کے کارخانے (مشقت کے احاطے) میں لے جایا جاتا تھا۔ اور ان سے قیدیوں کی بیرکوں کی صفائی بھی کرائی جاتی تھی۔ ڈلاّ مشقت سے جواب دے چکا تھا اور جیل خانے کا سٹاف اس کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ ڈلاّ بیکار بیٹھنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ اس نے جیل سے فرار کی سکیم تیار کر لی۔ یہ ایسی سکیم تھی، جس میں عقل و دانش اور غیر معمولی دلیری شامل تھی۔

وتے نے کچھ ایسے اوصاف پیدا کر رکھے ہیں جو اس کی بہت مدد کرتے تھے۔ ایک ہے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی، وہ ہنسوڑ طبیعت کا مالک ہے۔ قید کے دوران اتنی ذہنی انسانی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کے باوجود وہ ان اوصاف سے دست بردار نہیں ہوا وہ دشمن کا دل موہ لیتا تھا۔ جیل خانے کے وارڈر اور قیدی اس کے ان اوصاف کی بدولت اس کے مرید بن گئے تھے۔ دوسرا وصف یہ کہ اپنے آپ کو ایسے مرض کا مریض بنا لیتا تھا جو ڈاکٹروں بہانہ ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر بھی چکرا جاتے تھے۔ اپنے آپ کو بخار بھی چڑھا لیا کرتا تھا جو فی الواقع بخار ہوتا تھا۔ اس نے یہ گر مجھے بھی سکھایا تھا جو میں نے قید کے دوران کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ وہ بلیڈ سے ٹانگ پر ذرا سا زخم کرتا اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ ساری ٹانگ سوج جاتی تھی۔ خون کی قے کرنے کے فن کا وہ ماہر تھا۔ وہ عام طور اپنے آپ کو آنکھوں کی ایک بیماری میں مبتلا رکھتا تھا جسے "اندھراتا" کہتے ہیں۔ اس سے دن کو کم نظر آتا ہے اور رات کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

امرتسر جیل سے فرار کی سکیم سمجھنے سے پہلے جیل کا نقشہ سمجھنا ضروری ہے۔ باہر کی دیوار پانچ فٹ اونچی ہے۔ جیل کے بڑے گیٹ سے داخل ہوں۔ تو دائیں طرف کی بڑی دیوار کے ساتھ اندر کی طرف ایک نالہ دیوار کے متوازی بہتا ہے۔ نالے سے آگے دیوار کے متوازی چونتیس کوٹھڑیاں ہیں۔ ان کے ساتھ ایک جگہ خالی ہے۔ جہاں خاصا چوڑا اور گہرا گڑھا ہے اس میں سارے جیل خانے کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہیت الخلا کے سامنے، کچھ دور ایک سڑک زیر تعمیر تھی جو دراصل ایک فٹ اونچی پٹڑی سی

بنائی جارہی تھی۔ اسی سڑک نے فرار کی سکیم میں بہت مدد کی۔ دُلّے نے کوڑے کرکٹ کے گڑھے میں سرنگ کی کھدائی شروع کی۔ اسے چھپائے رکھنے کا انتظام یہ کیا کہ جیل خانے کے اس حصّے میں جو سنتری ہوتے تھے۔ انہیں دُلّے کے کچھ ساتھی تاش کھیلنے کے لیے بٹھا لیتے تھے۔ اس موقع پر دلے کی بذلہ سنجی نے بہت کام کیا۔ کھدائی کے لیے اوزار مل گئے۔ جو زیرِ تعمیر سڑک سے حاصل کیے گئے۔ سرنگ کا مشکل اور خطرناک پہلو وہ مٹی ہوتی ہے۔ جو اندر سے نکلتی ہے۔ ان لوگوں نے تھوڑی تھوڑی اٹھا کر زیرِ تعمیر سڑک پر پھینکنی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر تمام زمین پر لپائی ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے کچھ مٹی لپائی میں کھپا دی اور یہ خطرناک عمل جاری رکھا۔

یہ ایک دو دنوں میں ختم ہونے والا کام تو نہیں تھا۔ رفتار سست تھی۔ ہر لمحہ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ اور پکڑے جانے کے نتائج سے سب آگاہ تھے۔ تاہم کام جاری رہا۔ جیل کا کوئی وارڈر وغیرہ آجاتا تھا تو پاکستانی قیدی دوڑ کر اس کا استقبال کرتے۔ اس کی مٹھی چاپی کرتے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر تاش میں مگن کر لیتے۔ دُلّا تمام کام کی نگرانی کر رہا تھا آخر وہ دن آیا کہ سرنگ جیل کی بڑی دیوار کے نیچے جا پہنچی۔ ۲۵ دسمبر کی رات فرار کے لیے طے پائی۔ رات کو قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بند ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوٹھڑیوں سے نکلنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ یہ انتظام پاکستان کے قیدی لوہار نے کر دیا۔ وہ جیل کے لوہار خانے میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایک چابی تیار کی جو ہر ایک کوٹھڑی کے تالے میں لگ سکتی تھی مگر اسے خود کوٹھڑی سے باہر ہونا چاہیے تھا۔ وہ بھی تو کوٹھڑی میں ہی بند ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی سلاخیں اس طرح کاٹ لیں کہ دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کٹی ہوئی ہیں۔ فرار کی رات سے پہلے تمام تالے دن کے وقت جعلی چابی سے کھول کر دیکھ لیے گئے تھے۔ چابی کامیاب تھی۔ رات کو صرف ایک سنتری پہرے پر ہوتا تھا۔ جو تین گھنٹوں بعد بدل جاتا تھا۔ فرار کا وقت بارہ بجے سے تین بجے تک ڈیوٹی

والے سنتری کے پہرے کا مقرر کیا گیا۔ سنتری کو قابو کرنے کے لیے لاہور کے رہنے والے ایک قیدی محمد حسین اور میانوالی کے رہنے والے قیدی سپاہی حمید اللہ خان کو منتخب کیا گیا۔ بھاگنے والے قیدیوں کو دُلّے نے پانچ پانچ کے گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک گروپ کا کمانڈر مقرر کیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کون سا گروپ کس مقام سے سرحد پار کرے گا۔

۲۵ دسمبر کا دن سکیم کے مطابق قیدیوں کے لیے قید کا آخری دن تھا۔ اس رات انہیں اس لمبی سرنگ سے نکل جانا تھا۔ جو انہوں نے بڑی کامیابی سے کھود دی۔ اور چھپا رکھی تھی۔ یہ کرسمس کا دن تھا۔ عیسائی قیدیوں نے کرسمس منانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ انہوں نے مسلمان قیدیوں کو اپنی خوشیوں میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ مسلمان ان کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ اچانک گنتی کا حکم آگیا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام قیدی اپنی اپنی جگہوں پر پہلے جائیں۔ معلوم ہوا کہ باہر سے ڈی آئی جی آیا ہے۔ اس کے ساتھ جیل کے تمام افسر سیدھے کوڑے کرکٹ کے گڑھے تک آئے۔ کوڑا کرکٹ ہٹایا گیا تو اندر سے سرنگ برآمد ہوئی۔ سرنگ میں گئے تو یہ بڑی کامیابی سے آگے یعنی باہر تک چلی گئی تھی۔ وہاں سے بند تھی۔ فرار ہونے والوں کو فرار کے وقت اسے کھولنا اور نکل جانا تھا۔ دُلّا اور اس کے ساتھی پکڑ لیے گئے۔ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کیا حشر کیا گیا ہوگا۔ یہ مخبری آستین کے سانپوں نے کی تھی۔ فرار ہونے والوں میں کوئی ایمان فروش بھی تھا۔ اُس نے اس وقت مخبری کی جب فرار کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ بھارتی ڈی آئی جی نے سرنگ تو فرار سے پہلے ہی پکڑ لی۔ لیکن اس نے سرنگ کھودنے اور اسے چھپائے رکھنے والوں کو اُن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ——— "مسلمانوں میں کوئی بدروح داخل ہو گئی ہے۔ یہ جنّوں کا کام ہے، انسانوں کا نہیں"

دُلّا اذیتوں کے ایک اور دَور میں داخل ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسے

رہائی کا جھانسہ دے کر امرتسر کے تھانے رام باغ میں لے گئے۔ پاکستانی قیدیوں کو رہائی کی خوشخبری سنا کر بھی ایک ذہنی جھٹکا دیا جاتا تھا۔ بھارتیوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ پاکستانی قیدیوں پر مختلف دفعات کے تحت فرد جرم عائد کی جاتی ہے۔ انہیں بغیر مقدمے کے قید میں رکھا جاتا ہے۔ پھر رہائی کا ناٹک کھیلا جاتا ہے۔ انہیں رہائی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے اور کسی تھانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ حوالات میں بند رہتے ہیں۔ انہیں ہر روز رہائی کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اس طرح ذہنی اذیت دے دے کر قیدی کو سرحد کی طرف لے جاتے ہیں اور کسی جگہ اسے قتل کر کے لاش غائب کر دی جاتی ہے یا پیچھے سے کوئی اطلاع لے کے آجاتا ہے کہ قیدی کو واپس لے آؤ۔ کیونکہ اس کے خلاف ایک اور مقدمہ نکل آیا ہے۔ چنانچہ اسے واپس لے جا کر تشدد اور اذیت کے انہی مراحل میں جہاں سے وہ گزر کر آتا ہے ایک بار پھر گزارا جاتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۲ء میں دلّے کو نابھہ جیل سے رہائی کی خوشخبری سنا کر امرتسر لے گئے جہاں اسے رام باغ تھانے کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ تھانہ امرتسر کے گنجان آباد حصے میں ہے۔ میں بھی اس تھانے میں رہ چکا ہوں۔ مجھے دلّے کے بعد وہاں لے جایا گیا تھا۔ اس تھانے کا ایک سکھ سپاہی میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھے دلّے کی ایک ایسی کہانی جسے میں من گھڑت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بالکل سچ نکلی۔ دلّے کو جب رام باغ تھانے کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت وہ برسوں کا مریض لگتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ بتایا کہ اسے اندھراتا ہو گیا ہے۔ ایک آدھ دن بعد اس نے خون کی قے شروع کر دی اور ادھ موا ہو گیا۔ وہ ہلنے کے قابل بھی نہیں لگتا تھا۔ رہائی کی خبر سنا کر پاؤں سے بیڑیاں اتار لی جاتی ہیں۔ تھانے میں دلّا بیڑیوں کے بغیر تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ تھانے کا عملہ اس سے بے پروا ہو گیا۔ اس حالت میں جبکہ وہ مرنے والا تھا اس کے فرار کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔

ایک روز تھانے میں سفیدی شروع ہو گئی۔ دلّا تھانیدار کی میز کے قریب فرش پر لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ لڑائی جھگڑے کا ایک کیس آگیا۔ چالیس پچاس آدمی جو اس کیس میں ملوث تھے اندر چلے گئے اور تھانے دار کو گھیر لیا۔ تھانے دار نے ان کی رپورٹ سنی۔ جو کاغذی کارروائی کرنی تھی مکمل کی اور جب اُن سے فارغ ہوا تو دلّا وہاں نہیں تھا۔ اس نے اس خیال سے اُسے نہ ڈھونڈا کہ یہیں کہیں پڑا ہو گا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ تین چار روز بعد مر جائے گا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کو پتہ چلا کہ اس کا اوور کوٹ (برانڈی) غائب ہے۔ اس کی وردی کی ایک پتلون وہاں پڑی تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ اس کے بعد انکشاف ہوا کہ محرر کی پگڑی اور ایک سپاہی کی وردی کی قمیض غائب ہے ـــــ اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ دلّا بھی تھانے سے غائب ہے۔

تھانے دار کو یقین نہیں آرہا تھا کہ نزاع کی حالت میں کراہتا ہوا مریض فرار ہو گیا ہے۔ ان دنوں بارڈر سیکورٹی فورس کا ایس پی ایک ظالم بھارتی بھلر تھا جو اجنالہ اور امرتسر سیکٹر کا انچارج تھا۔ اس نے فوری طور پر سرحد کی ناکہ بندی کر دی اور اپنی فورس کے ہزاروں افراد سرحد پر پھیلا دیے۔ پولیس ہوم گارڈ اور سی آئی ڈی دلّے کو امرتسر کے اندر ڈھونڈ رہی تھی مگر ناکہ بندی اور تلاش محض بیکار تھی۔ دلّا پاکستان میں داخل ہو چکا تھا۔

اس کی خون کی قے، بخار اور نزع کی حالت اس کی اداکاری کا کمال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جس رہائی کے لیے رام باغ تھانے میں لائے ہیں۔ وہ اسے کبھی نہیں ملے گی۔ اسے سرحد پر لے جا کر قتل کر دیا جائے گا یا پھر کسی نئے مقدمے کے بہانے جیل خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ دلّے جیسے پاکستانی کو بھارتی رہا کر دیتے۔ اس نے اپنی رہائی کا بندوبست خود ہی کر لیا۔ تھانے سے اس نے پولیس والوں کے جو کپڑے اُڑائے تھے۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پولیس کی وردی میں فرار ہوا ہے۔

یہ کہانی اکیلے دتے کی نہیں، یہ ہمارے معاشرے کے بہت سے ایسے افراد کی کہانی ہے۔ جنہیں ہم جرائم پیشہ اور سمگلر کہتے ہیں۔ انہوں نے کمانڈو پارٹیوں کی رہنمائی کی۔ امیٹیلی جنس کا کام آسان کیا اور پکڑے گئے تو دشمن سے کہلوایا کہ مسلمانوں میں کوئی بدروح داخل ہوگئی ہے، یہ کام جنوں کا ہے انسانوں کا نہیں۔ اگر ہم ان لوگوں کو استعمال میں لائیں تو یہ قوم کی بہت بڑی قوت ثابت ہوسکتے ہیں۔

وہ امر ہوگیا

اس نے مجھے اپنا اصلی نام رشید بتایا تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اُس کا اصلی نام یہی تھا۔ البتہ میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں واحد آدمی ہوں جسے رشید کا اعتماد حاصل ہوا تھا۔ میں نے بھارت کے جیل خانوں میں اُس کے ساتھ چھ مہینے گزارے ہیں۔ بھارتی پولیس کے ریکارڈ میں اُس کے کئی نام اب بھی موجود ہیں۔ جن میں مجھے چار یاد رہ گئے ہیں۔ سوشیل پانڈے، جگتار سنگھ، راج پال اور گورومیت سنگھ۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اُس کے یہ نام ظاہر نہ کرتا اور اُس کا اصلی نام (اگر رشید ہی تھا) کبھی کسی کو نہ بتاتا۔ وہ سرحدوں کا بھیدی تھا۔ ادھر نکل جانا اور اُدھر کی خبریں اور راز اُدھر لے آنا اُس کی زندگی کا مشن تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ سرحد پار کر رہا تھا۔ دیکھ لیا گیا۔ اُسے للکارا گیا۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر دشمن کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے اُسے بھاگنے نہ دیا۔ اس طرح اُس نے اپنا یہ عہد پورا کر دیا کہ زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

وہ پاکستان کے اُس سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا جو بھارت اور مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں سے ملتا ہے۔ اُس نے زیادہ تر وقت شہر میں گزارا تھا۔ یہ شہر کا اثر تھا کہ اُس نے میٹرک پاس کر لی تھی۔ ورنہ اُس کی خاندانی تاریخ کچھ اور تھی۔ اس کا باپ پیشہ ور ہلد تھا۔ یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو رشید کے باپ نے قسم کھالی کہ پاکستان میں چوری نہیں کرے گا۔ لیکن اُس نے چوری سے توبہ نہ کی۔ اس کام کے لیے وہ سرحد پار چلا جاتا اور بھارتیوں کے مویشی کھول لاتا تھا۔ اگر موقع ملے تو

کسی آبادی میں چوری یا ڈکیتی کی واردات بھی کر آتا تھا۔ رشید میٹرک کا سرٹیفکیٹ لے کر گاؤں چلا گیا۔ اُس کے باپ کو دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اُس کا بیٹا تعلیم یافتہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کے کام کا نہیں رہا تھا۔ لیکن خون نے اپنا اثر دکھایا۔ ایک روز رشید نے اپنے چچا کے ساتھ سرحد پار کی اور سکھوں کی دو بھینسیں کھول لایا۔ اُس کے باپ کو بہت خوشی ہوئی کہ اُس کا بیٹا "راہ راست" پر آ گیا ہے۔ اُس کے بعد اُس نے سرحد پار کرنا اور ہندوؤں اور سکھوں کو چوری یا دیگر طریقوں سے نقصان پہنچانا زندگی کا واحد مقصد بنا لیا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ چور نہیں بننا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف انتقام کا جو جذبہ بھرا ہوا تھا۔ اُس نے اسے چور بنایا۔ وہ سرحد سے بیس میل دُور بھارت کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اُس کے خاندان کو وہاں سے بھاگ کر پاکستان آنا پڑا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس کا گھر لُوٹ لیا اور اُس کی بہن کو اُس کے سامنے بے آبرو کیا تھا۔ رشید اپنے باپ اور ماں کے ساتھ بہت بُری حالت میں پاکستان تک پہنچا تھا۔ بہن کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے وہ پاگل ہوا رہتا اور انتقام کے طریقے سوچتے رہتا تھا۔ بھارتی کافروں نے آزادی کے بعد پاکستان تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ رشید کا خاندان پاکستان میں سرحد کے ساتھ ہی آباد ہو گیا تھا۔ سکھ اکثر اِدھر آ کر ڈھور ڈنگر چوری کر کے لے جاتے تھے۔

اس خاندان نے بھارتیوں کی اس دیدہ دلیری کا تدارک یوں کیا کہ سرحد پار کر کے بھارت میں داخل ہو جاتے اور وہاں سے مویشی چوری کر کے لے آتے۔ رشید کا باپ آزادی سے پہلے بھارت میں بھی پیشہ ور چور تھا۔ اُس کے لیے چوری کوئی نئی واردات نہیں تھی۔ البتہ سرحد پار کرنا مشکل کام تھا۔ دونوں طرف سرحدی دستوں کی گشت ہوتی ہے۔ اصل خطرہ بھارت کے سرحدی پہرہ داروں کی طرف سے تھا۔ انہیں حکم ملا ہوا تھا کہ سرحد پر کوئی مشکوک آدمی للکارنے پر بھاگنے کی کوشش کرے تو اُسے گولی مار دو۔

رشید کا باپ اور چچا سرحد پار کرنے کے ماہر ہو گئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھارت

سے مویشی کھول لانا انتقامی کارروائی تھی۔ جو آگے چل کر ان کا پیشہ بن گئی۔ دو چار بار بھارت کے سرحدی دستے کے جوانوں نے انہیں دیکھ لیا۔ اور تعاقب کیا۔ لیکن یہ لوگ نکل آئے۔ بعد میں انہوں نے کہیں سے ریوالور اور سٹین گنیں لے لیں تاکہ بوقت ضرورت مقابلہ کیا جا سکے۔ ایسا ایک موقعہ آ ہی گیا۔ رشید اور اس کا باپ بھارت میں کافی دُور نکل گئے۔ علاقہ ایسا تھا کہ وہ راستہ بھول گئے اور واپس آتے وہ بھارت کی ایک سرحدی چوکی کے قریب جا نکلے۔ سنتری نے انہیں للکارا۔ سنتری کی للکار پر انہوں نے چھپنے اور بھاگنے کی کوشش کی۔ چوکی سے اُن پر گولیاں برسنے لگیں۔ رشید اور اُس کے باپ کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ انہوں نے جوابی فائر کیا اور نکلنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔

دشمن انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اچانک موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ روشنی راؤنڈ بھی فائر ہوتے رہے تھے۔ جن کی روشنی سے بچنا بہت مشکل تھا۔ بارش نے دونوں کو خاصا فائدہ دیا۔ وہ قریب ہی سرکنڈوں کے جنگل میں چلے گئے۔ دشمن کو بارش نے روک لیا۔ باپ بیٹا سرکنڈوں سے نکلے۔ دشمن اندھا دھند فائر کر رہا تھا۔ ایک بھولی بھٹکی گولی رشید کے باپ کے سینے سے پار ہو گئی۔ وہ گر پڑا۔ رشید کے لیے مشکل پیدا ہو گئی۔ اُس نے باپ کو کندھوں پر اُٹھایا اور چل پڑا۔ گولیاں اُس کے ارد گرد اُڑتی رہیں۔ رشید نکل آیا۔ سرحد کے پار آنے تک اُس کا باپ زندہ تھا۔ مگر گھر پہنچے تو باپ مر چکا تھا۔

اپنے باپ کے پیشے کو یا انتقام کی مسلسل کوشش کو زندہ رکھنے کے لیے رشید رہ گیا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کے اندھیرے میں بھارت کی فوج ہمارے سرحدی علاقے میں داخل ہو گئی۔ ہندوؤں نے بزدلی کا یہ مظاہرہ کیا کہ سوئے ہوئے دیہاتیوں پر حملہ بول دیا۔ عورتوں کو انہوں نے پکڑ لیا۔ یہ حملہ چونکہ سوتے وقت ہوا تھا۔ اس لیے دشمن کا مقابلہ نہ کیا جا سکا۔ رشید کے گاؤں پر دوسری جگہوں کی

نسبت زیادہ ہی قیامت ٹوٹی۔ اُس کے دو بھائی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ نکل بھاگے اُن کی ایک بہن تھی جو انہیں نظر نہ آئی۔ بھائی سمجھے کہ وہ اُن سے پہلے نکل گئی ہو گی — نفسا نفسی اور شور شرابے میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

پیچھے محفوظ علاقے میں آکر رشید کو احساس ہوا کہ اُس کی بہن کو ہندو لے گئے ہیں۔ اُس کے خاندان کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت میں اُس کی ایک بہن کو بے آبرو کیا گیا تھا۔ اب اُس کی ایک اور بہن کو ہندو اُس کے ملک میں آکر اُس کے گھر سے اٹھا لے گئے تھے۔ اُس نے کسی طرح معلوم کر لیا کہ سرحد پار اغوا کی ہوئی پاکستانی لڑکیاں کسی جگہ بند کر رکھی ہیں۔ رشید نے مجھے تفصیل سے نہیں سنایا تھا کہ اسے یہ اطلاع کس نے دی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اطلاع دینے والے وہ سمگلر یا جرائم پیشہ لوگ ہوں گے جو دونوں ملکوں کی خبر رکھتے ہیں اور ان کے تعلقات دونوں ملکوں میں ہوتے ہیں۔

رشید کو ایک گاؤں کا نام بتایا گیا اور یہ بھی کہ اُس گاؤں کے "چیخ گھر" میں پاکستان سے اغوا کیے ہوئے مردوں کو الگ اور عورتوں کو الگ بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ ایک رات رشید نے اپنے جیسے چند نوجوانوں کو ساتھ لیا اور بھارت کے اُس گاؤں تک پہنچنے کے لیے چل پڑا۔ غالباً جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فوجیں دونوں طرف مورچہ بند تھیں اس صورتِ حال میں سرحد پار کرنا محال بھی تھا اور خطرناک بھی۔ لیکن یہ لوگ سرحد کے بھیدی تھے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ کس مقام پر فوجیں نہیں ہیں۔ رشید کے بھائی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ اس پارٹی کے پاس بارہ بور کی تین شکاری بندوقیں تھیں اور ایک سٹین گن، چاقو اور خنجر وغیرہ سب کے پاس تھے۔

یہ پارٹی بھارت کے اس گاؤں میں پہنچ گئی۔ بھارت کی فوج کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی غیر فوجی آدمی تجربہ کار کمانڈو جوانوں کی طرح اس گاؤں تک پہنچ جائیں گے۔ اس گاؤں میں کوئی خزانہ یا گولہ بارود کا ذخیرہ تو نہیں تھا۔ جس کی حفاظت کے لیے وہاں فوج رکھی جاتی۔ وہاں نہتے پاکستانی دیہاتی اور اُن کی بے بس ا

مجبور خواتین قید تھیں۔ ان کے لیے وہاں تھوڑے سے فوجی اور چند ایک عیش پرست افسر تھے۔ رشید نے دیکھا کہ گاؤں جنگ کی وجہ سے خالی تھا۔ اُس نے اپنے ایک بھائی کو ساتھ لیا۔ دوسروں کو ادھر ادھر کھڑا کیا اور چیخ گھر کی باہر والی دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ اندر کچھ روشنی تھی۔ اُس نے دو بھارتی فوجیوں کو دیکھا جو شراب میں بدمست تھے اور ایک لڑکی کو نوچ رہے تھے۔ رشید اور اُس کے بھائی پلک جھپکتے اُن پر جھپٹے اور چاقوؤں سے انہیں ختم کر دیا۔ ایک جگہ انہیں ایک لڑکی کی لاش پڑی نظر آئی۔ اسے انہوں نے پہچان لیا۔ یہ اُن کے گاؤں کی لڑکی تھی۔

وہاں تین چار اور فوجی تھے۔ انہیں رشید اور اُس کے بھائی نے آسانی سے ختم کر دیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ کمرے میں گئے۔ وہاں سولہ سترہ لڑکیاں تھیں۔ ان میں رشید کے گاؤں کے امام مسجد کی بیٹی بھی تھی۔ اُس لڑکی نے رشید کو بتایا کہ اُس کی بہن یہیں تھی۔ لیکن بھارتی فوجی چند ایک لڑکیوں کو یہاں سے لے گئے تھے۔ جن میں اُن کی بہن بھی تھی۔ ان سولہ سترہ لڑکیوں کو یہ جوان وہاں سے نکال لائے۔ سب کی حالت بُری تھی۔ تاہم وہ انہیں کسی محفوظ راستے سے پاکستان کی سرحد میں لے آئے اور پاک فوج کی کسی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کر دیا تاکہ اس کارنامے کو سرکاری حیثیت حاصل ہو جائے۔

یہ ایسا کارنامہ تھا جسے سرکاری طور پر کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ رشید کو انٹیلی جنس کے رہبر کے طور پر فرائض سونپ دیے گئے۔ یہ ایک ایسا محاذ ہے جس پر لڑنے والوں کے نام اور کارنامے تاریخ میں نہیں آیا کرتے۔ یہ جانباز اپنی فوج کی آنکھیں اور کان ہوتے ہیں۔ رشید نے اپنے فن کو ملک و ملت کے دفاع کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ایک بار وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک آدمی کو سرحد پار بھارتی علاقے میں لے جا کر واپس لا رہا تھا۔ جنگ کے بعد دونوں طرف سرحدی دستے پہلے سے زیادہ چوکنے ہو گئے تھے۔ رشید کے پاس ریوالور، چند گولیاں اور ایک چاقو تھا۔

سرحد بمشکل ایک میل دُور رہ گئی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس کے نرغے میں آگئے۔ آگے ایک نہر تھی۔ ان دونوں کو للکارا گیا۔ انہوں نے بھاگنے کی ترکیب کی۔ اُن پر فائر کھول دیا گیا۔ رشید کو یہ بھی معلوم تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے بھی بھارت کی سیکورٹی فورس موجود ہے جو اتنی زیادہ فائرنگ سے ہوشیار اور تیار ہو چکی ہو گی۔

رشید کو اپنے اُس ساتھی کا غم تھا جسے وہ ساتھ لا رہا تھا۔ اسے وہ اپنی امانت سمجھتا تھا۔ اُس نے ریوالور کے چند راؤنڈ فائر کیے اور دشمن کی فائرنگ میں نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ دونوں نے نہر پار کر لی اور رینگنے لگے۔ وہاں بھی خطرہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ رشید کو اپنے سامنے کوئی کھڑا نظر آیا۔ فاصلہ دو قدم ہو گا۔ اُس نے اندھیرے میں دیکھا لیا کہ وہ بھارتی سپاہی تھا۔ سپاہی فوراً پیچھے کو مڑا لیکن رشید تیز تھا۔ اُس نے جھپٹ کر سپاہی کو پکڑ لیا اور اُس کی کنپٹی پر ریوالور کا بٹ مارا۔ وہ گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کی نشانہ ہی کا خطرہ تھا۔ رشید اور اُس کے ساتھی نے سپاہی کو بے ہوش کر کے پھینک دیا۔ اُس کی سٹین گن اور ایمونیشن لے لیا۔ وہ جوابی فائر کرنے کے بجائے سرحد کی طرف چل پڑے جو ایک فرلانگ دُور رہ گئی تھی۔ رشید کے ساتھی کے کندھے میں گولی لگی۔ مگر اُس نے حوصلہ قائم رکھا۔ دونوں سرحد میں داخل ہو گئے۔

رشید سے بھارت کی پولیس بھی آگاہ ہو چکی تھی۔ مخبری تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ کسی نے ڈبل گیم کھیلی اور ایک شام اُس وقت امرتسر پولیس کو اطلاع کر دی گئی جب رشید اپنے ایک سکھ دوست کے گھر امرتسر شہر میں کہیں بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس اچانک آگئی۔ رشید کے پاس سٹین گن تھی۔ اُسے بھی اطلاع مل گئی کہ پولیس آگئی ہے۔ اُس نے بالائی منزل سے دیکھا۔ پولیس گھیرا مکمل کر چکی تھی۔ رشید نے اپنے سکھ میزبان کو خبردار کیا جو نیچے صحن میں کھڑا تھا۔ سکھ رائفل اٹھا کر اوپر چلا گیا۔ اُس نے اپنے گھر والوں کو بھی ہوشیار کر دیا۔ یہ خاندان جرائم پیشہ تھا۔ سکھ کی بیٹی اور ماں دروازہ

بند کر کے وہیں کھڑی رہیں تاکہ پولیس دروازہ کھٹکھٹائے تو اُسے چند منٹ وہیں باتوں میں لگایا جا سکے۔

فوراً بعد پولیس نے دستک دی۔ اس اثنا میں رشید اور سکھ ساتھ والے مکان کی چھت پر کُود گئے۔ وہاں سے اگلی چھت پر اور اسی طرح چھتوں کے اوپر اوپر نکل گئے اور وہاں سے سڑک پر کود گئے۔ پولیس وہاں بھی موجود تھی۔ آگے بجلی کے لائٹ اور اس سے آگے نہر تھی۔ سکھ رشید کو اپنے پیچھے پیچھے لاتا پولیس کی نظریں بچا کر لے گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پولیس سکھ کے مکان میں داخل ہو کر چھت پر گئی۔ وہاں سے دوسرے مکانوں کی چھتوں پر گئی۔ غالباً کسی کی نشاندہی پر پولیس اُن کے تعاقب میں نہر تک پہنچ گئی۔ رشید اور سکھ نہر میں نہ کودے بجائے دوسری طرف نکل گئے۔ انہیں ایک ٹیوب ویل کے متعلق معلوم تھا۔ جہاں سکھ کا ایک سمگلر ساتھی موجود رہتا تھا۔ اُس کے پاس دو گھوڑے تھے۔ اُس نے ایک گھوڑا رشید کو دے دیا۔ رشید بھارت کی سیکورٹی فورس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آیا۔

وہ چونکہ اپنے فرض کا پکا تھا۔ اس لیے اُس نے مجھے ایسی کوئی بات نہ سنائی جو جاسوسی سے تعلق رکھتی ہو۔ جاسوس کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھید کسی کو نہ دے خواہ وہ اپنا کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ میں چونکہ خود اسی میدان کا کھلاڑی رہ چکا ہوں اور بھارت کے جیل خانوں میں کچھ عرصہ گزار آیا ہوں۔ اس لیے میں دلوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے انٹیلی جنس کے لیے حیران کن کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ وہ جب بھارت میں کسی مخبر کی اطلاع پر پکڑا گیا تو اُسے اُسی جیل خانے میں لایا گیا تھا۔ جہاں میں قید تھا۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ بھارت کی سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جنس کے کئی افسر اُسے دیکھنے آئے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس اور سیکورٹی فورس کا گھیراؤ توڑ کر نکل جانے والا پاکستانی یہی تھا۔

اُسے جن اذیتوں میں ڈالا گیا۔ وہ گھوڑے جیسے طاقتور جانور بھی برداشت نہیں

کرسکتا۔ اُس سے دو سوال پوچھے جارہے تھے۔ "اب تک کون کون سی راز کی بات بھارت سے لے جاچکے ہو اور بھارت میں تمہارے ساتھی کون کون اور کہاں کہاں ہیں۔" وہ بے ہوش ہوجاتا تھا۔ اُس پر نزع کا عالم بھی طاری ہوتا تھا۔ مگر وہ زبان نہیں کھولتا تھا۔

ایک روز ایک ہندو ایس۔ پی نے اُس کے متعلق کہا تھا۔ "یہ شخص مر نہیں سکتا مرگیا تو امر ہوجائے گا۔" اور ایک روز وہ مر ہی گیا۔ ہندوؤں کی قید سے وہ آزاد ہوچکا تھا۔ ایک روز سرحد کے قریب کسی بھارتی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

منیر افراڈیا

اُس سے پہلی ملاقات نابھہ جیل (بھارت) میں ہوئی تھی۔ پردیس میں ہم وطن ایک دوسرے کو سگا بھائی سمجھتے ہیں اور جب دو ہم وطن دشمن کی جیل میں اکٹھے ہو جائیں تو وہ خون کے رشتے میں منسلک ہوجاتے ہیں۔

مَیں اس وقت پاکستان انٹیلی جنس میں تھا۔ ایک جاسوسی مشن پر بھارت گیا تھا۔ اس سے پہلے میں کئی مشن کامیابی سے پورے کر آیا تھا۔ لیکن اس مشن پر حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے کہ میں پکڑا گیا۔ پکڑے جانا بھی اس کام کا ایک حصّہ ہے۔ جس کے لیے مَیں ذہنی طور پر تیار تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے وہ اذیتیں دی جائیں گی۔ جن کے صرف تصوّر سے ہی ایک عام شہری کانپنے لگ جائے۔ مَیں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

ایک روز ایک خوش شکل، خوش طبع جواں سال قیدی میرے پاس آبیٹھا۔ اُس نے اپنا نام منیر بتایا اور کہنے لگا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اُسے کسی نے میرے متعلق بتایا تھا کہ میں جاسوسی کے الزام میں پکڑا گیا ہوں۔ اُس نے کچھ خوشی کا اظہار کیا۔ مَیں چوکنا ہوگیا کیونکہ بعض باتیں جو جاسوسوں سے ایذا رسانی سے نہیں اگلوائی جاسکتیں۔ وہ اس طرح کے آدمیوں کے ذریعے معلوم کرلی جاتی ہیں۔

منیر خاصا گھاگ معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سمجھ گیا کہنے لگا کہ مَیں آپ سے کوئی راز کی بات معلوم نہیں کروں گا۔ صرف پاکستان کی محبت نے مجھے آپ کے پاس لا بٹھایا ہے۔

مَیں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا ہے؟

"نہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں بڑا پاپی ہوں۔ لیکن اب بغیر کسی جرم کے پکڑا گیا ہوں۔ مَیں کوئی شریف آدمی نہیں۔ میں خاصا لکھا پڑھا ہوں۔ لیکن حالات نے مجھے اس طرف دھکیل دیا ہے۔ میرا میدان کچھ اور ہے۔ اب ایک دوست کے ذریعہ یہ خیال آیا کہ سمگلنگ کا کاروبار بھی شروع کیا جائے۔ ہوا یوں کہ میرے دوست کی پارٹی مجھے ساتھ لے آئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور ان کے پاس مال کیا ہے۔ مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ ہم نے بارڈر بڑی آسانی سے پار کر لیا اور بھارت میں دُور تک آ گئے۔ کسی نے ہمیں للکارا۔ اس کے ساتھ ایک گولی فائر ہوئی۔ میرے ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مَیں اکیلا بیوقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ بھارت کی پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے مارا پیٹا۔ مَیں نے انہیں صاف بات بتا دی اور کہا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہ لوگ کیا لا رہے تھے۔ مَیں بالکل نیا آدمی ہوں اور یہ بارڈر کراس کرنے کا جرم پہلی دفعہ کیا ہے۔ مجھے تین چار جگہوں پر لے گئے۔ ہر جگہ مجھے مارا پیٹا گیا۔ میں نے ہر جگہ یہی بات بڑے صاف الفاظ میں بتائی۔

ان لوگوں کو بہرحال یقین ہو گیا کہ مَیں نے اس جرم میں شامل ہوتے ہوئے یہ جرم نہیں کیا۔ لیکن وہ اتنا سمجھ گئے کہ مَیں کوئی کم عقل آدمی نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں جو شاید بھارت کی انٹیلی جنس کا دفتر تھا۔ میری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ایک ہندو میجر نے مجھے کہا کہ میں پاکستان واپس چلا جاؤں۔ باقاعدہ سمگلنگ کروں لیکن مجھے جاسوسی کرنی پڑے گی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے تھوڑے دنوں کی ٹریننگ دیں گے۔

"مَیں نے اُسے کہا کہ جس طرح میں ہر جگہ اپنا سچا اور ایک ہی بیان دے رہا ہوں۔ اسی طرح مَیں آپ کو سچ سچ بتا دیتا ہوں کہ مَیں کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو جاؤں۔ اپنے ملک کو دھوکا نہیں دوں گا۔ مَیں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں پاکستان میں مجرمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن مَیں یہ نہیں بھول سکتا کہ وہ میرا وطن ہے.....

مَیں کسی ہندو سے بھلائی کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ میجر میری صاف گوئی سے

متاثر ہوا کہ اُس نے مجھے کہا کہ تمہارے خلاف اس کے سوا اور کوئی الزام نہیں ہے کہ تم نے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کی ہے لیکن میں تمہیں چھڑا لوں گا اور واپس پاکستان بھجوا دوں گا۔۔۔

"مجھے میجر کی نیت پر شک ہوا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اذیتیں دینے کے بجائے آپ کیوں نہیں مجھے سزائے قید سنا دیتے؟ میں کس طرح یقین کروں کہ آپ مجھ پر اتنی مہربانی بلاوجہ کر رہے ہیں۔ اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا کہ پاکستان نے مجھ پر جو مہربانی کی ہے میں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں شدید زخمی حالت میں ہمارے ملک کا جنگی قیدی بن گیا تھا۔ پاکستانیوں نے میرا علاج اور میری دیکھ بھال اتنے پیار سے کی۔ جیسے میں پاکستان آرمی کا افسر ہوں۔ ورنہ میں تو مر گیا تھا۔ مَیں بالکل صحیح سلامت اور پہلے سے زیادہ تندرست ہو کر اپنے ملک میں آیا ہوں۔ تمہیں تھوڑے دن جیل کی حوالات میں رہنا پڑے گا۔ میری رپورٹ اوپر جائے گی اور وہاں سے تمہاری رہائی کا حکم آ جائے گا۔

"اب میں حکم کا انتظار کر رہا ہوں۔ میجسٹریٹ نے مجھے چھ ماہ بارڈر کراس کرنے کی سزا دی ہے اور میرا چالان یہاں آ گیا ہے آپ کے متعلق پتہ چلا کہ آپ جاسوسی میں گرفتار ہوئے ہیں تو بڑے شوق سے آپ سے ملنے آ گیا۔"

اتنے میں بارک کا سنتری آ گیا۔ اُس نے منیر کو بھگا دیا۔ کیونکہ میرے جرم کے قیدیوں سے دوسرے قیدی زیادہ مل ملا نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد منیر کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخر ایک دن وہ بڑا خوش خوش آیا اور کہنے لگا کہ وہ پاکستان جا رہا ہے۔

اس کے بعد میرے خلاف تفتیشیں ہوتی رہیں۔ مقدمہ چلتا رہا۔ تین چار سال اسی طرح جیل سے کورٹ اور کورٹ سے جیل تک آنے جانے میں گزر گئے۔ بالآخر قیدیوں کے تبادلے میں ہم واپس آ گئے۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد کی بات ہے کہ مَیں مال روڈ کی فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میرے کندھے پر کسی کا ہاتھ آ پڑا۔

میں نے بدک کر دیکھا۔ ایک خوش پوش آدمی نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں اُسے نہ پہچان سکا۔ لیکن جب اُس نے بات کی تو اتنی مانوس آواز نے پہچان آسان کر دی — وہ منیر تھا۔

وہ مجھے قریب ہی ایک ہوٹل میں لے گیا۔ میری ذات میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ پوچھتا تھا کہ پھر کسی مشن پر کب جاؤں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس کام سے فارغ ہو چکا ہوں اور اب اپنا ہی کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈنا ہے۔

"طارق بھائی!" اُس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا — "کیا تم نے یہ شکست قبول کر لی ہے۔ جو ہمیں مشرقی پاکستان میں ہوئی ہے؟ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔"

میں نے اُسے رسمی سا جواب دیا لیکن میں سوچ یہ رہا تھا کہ اس شخص کو اپنے ملک کی فتح اور شکست کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو خود کہتا تھا کہ میں پاکستان میں مجرمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ یہ شک بھی تھا کہ یہ شخص میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ کہیں بھارتی جاسوس تو نہیں بن گیا؟ میں براہِ راست اس سے ایسی بات پوچھ نہیں سکتا تھا میں نے بھی آخر جاسوسی کی تھی۔ ٹریننگ لی تھی۔ تجربہ حاصل کیا تھا۔ میں نے اس تجربے کے داؤ پیچ کھیلتے ہوئے اُسے اپنا پکا یار بنا لیا۔ جب ہم رخصت ہوئے تو اُس نے مجھے اپنے گھر کا پتہ دے کر کہا کہ کل رات کا کھانا میں اُس کے گھر کھاؤں گا۔

اگلی شام میں اُس کے گھر پہنچ گیا۔ میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ اُسے ٹھونک بجا کر دیکھوں گا کہ اُس شخص کی اصلیت کیا ہے۔ اُس نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ وہ سانولے رنگ کی ایک عام سی جوان لڑکی تھی اور وہ بنگالن تھی۔

"طارق بھائی!" منیر نے کہا۔ "یہ لڑکی بنگلہ دیشی نہیں یہ مشرقی پاکستانی ہے

اس کی ذات میں مشرقی پاکستان نظر آتا ہے۔"

اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ منیر نے پاکستان کے متعلق پھر وہی جذباتی سی باتیں کیں۔ جیسے وہ پہلے کرتا رہا تھا۔ لیکن میں شک میں پڑا رہا۔

اس کے بعد ہماری تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز میں نے پریشان ہو کر اُسے کہا۔ "منیر! جس طرح تم نے انڈین انٹیلی جنس کے سامنے بالکل سچا بیان دیا تھا اسی طرح مجھے بھی سچ سچ بتا دو کہ تم ہو کیا؟"

ایسی چند اور باتیں کر کے اُس نے مجھے کہا کہ آؤ ذرا ادھر باغ میں چل کے بیٹھتے ہیں۔ باغ میں اُس نے جا کر کہا کہ تم نے اچھا کیا ہے جو مجھ سے پوچھ لیا ہے کہ میں کیا ہوں۔

"میں ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ میرے والد ریلوے میں کلرک تھے۔ اتنی محدود آمدنی میں بھی انہوں نے ہم پانچ بہن بھائیوں کو تعلیم دلائی۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں سب سے بڑا تھا۔ میں جب تھرڈ ایئر میں تھا تو ایک روز میں نے اپنے امی اور ابا کو بڑی پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ امی کہنے لگی کہ بیٹا! تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری بہن جوان ہو گئی ہے۔ رشتوں کے پیغام آتے ہیں۔ لیکن ہم کسی کے آگے ہاں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جہیز بنانا تو دور کی بات ہے۔ ہم بارات کو کھانا بھی کھلانے کے قابل نہیں۔ تمہاری اس بہن کے بعد دوسری بہن جوانی کو پہنچ رہی ہے۔

"طارق بھائی! ایسے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے میرے اندر کوئی فالتو رگ ڈال دی ہے یا شاید میں بہت حساس ہوں۔ دونوں بہنیں میرے اعصاب پر غالب آ گئیں۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ پڑھائی چھوڑ دوں گا اور کوئی نوکری تلاش کروں گا۔ میں اپنے ماں باپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ امی ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں تعلیم ادھوری چھوڑ دوں۔ لیکن میرے اندر اتنا پختہ عزم ہے کہ اسے تم ڈھیٹ پن

بھی کہہ سکتے ہو۔ مَیں اگلے روز کالج جانے کے بجائے نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہو
اسی شام سے ٹائپنگ بھی سیکھنی شروع کردی ....

"کئی دنوں تک میرا معمول یہ بنا رہا کہ درخواست لکھتی اور کسی دفتر میں جاکر دے
دیتی اور وہاں سے ٹکا سا جواب لے کر واپس آجاتا ... طارق بھائی ! اگر مَیں تمہیں
یہ بتانے لگوں کہ مجھے کیا کیا جواب ملے اور میں نے کیا کیا دیکھا تو تم کہو گے کہ میر جھوٹ
بولتا ہے۔"

اُس نے وہ تمام محکمے گنوائے جہاں جہاں اُس نے درخواست دی تھی۔ بعض
دفتروں سے تو اُسے یہ جواب ملا کہ کم از کم کسی وزیر کی سفارش لاؤ۔ دو تین محکموں
سے اُسے یہ جواب ملا — "پندرہ ہزار روپیہ نقد لاؤ اور آکر کرسی پر
بیٹھ جاؤ۔"

میر بہت ہی پریشان ہوا۔ اُس نے کہا کہ وہ تو پندرہ روپے بھی دینے کے
قابل نہیں۔ اسے بڑے پیار سے کہا گیا کہ پندرہ ہزار تم دو مہینوں میں پورے کر لو گے
یہاں نوکریوں کی بولی بولی جاتی ہے۔ یہاں سے میر کا دماغ پھر گیا۔ دماغ تو پھرنا ہی
تھا۔ اُس نے آخری دفتر میں جاکر فی الواقعہ روتے ہوئے کہا کہ مجھے چپڑاسی ہی رکھ
لو۔ مجھے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ محکمے اس افسر نے میر سے کہا —
"دیکھو بھئی، میں تو شادی شدہ ہوں۔ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ شادی نہیں
کر سکتا۔"

"طارق بھائی ! مَیں نے کبھی کسی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اُس روز
مَیں قتل پر بھی تیار ہو گیا۔ لیکن اچانک دونوں بہنیں اور بوڑھے ماں باپ میری آنکھوں
کے سامنے آگئے۔ مَیں نے اپنے خون کا گھونٹ بھر لیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے
پتہ نہیں چل رہا تھا کہ مَیں زمین پر چل رہا ہوں یا آسمان پر۔ مَیں تو یہی کہتا ہوں کہ مجھے
جیسوں کی مدد خدا ضرور کرتا ہے۔ جس طرح اُس روز میں نے تمہیں راہ جاتے کندھے
پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔ اسی طرح میرے کندھے پر ہاتھ پڑا۔ مَیں نے دیکھا وہ میرا

سیکنڈ ایئر کا ایک کلاس فیلو تھا۔ سیکنڈ ایئر ہی میں وہ کالج سے بھاگ گیا تھا۔ میری طرح
وہ بھی درمیانے درجے کے گھرانے کا لڑکا تھا۔ لیکن مَیں اُس کا سوٹ دیکھ کر حیران
رہ گیا۔ مَیں نے پوچھا کہ یہ سوٹ کہاں سے اڑایا ہے؟ اُس نے کہا کہ ابھی تم مجھ سے یہ بھی
پوچھو گے کہ وہ کار کہاں سے اڑائی ہے۔

"اُس نے مجھے اپنی کار دکھائی اور وہ مجھے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں
لے گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ مَیں نے اُسے یہی ساری کہانی سُنا
دی جو تمہیں سُنائی ہے۔ اُس نے کہا کہ تم بیوقوف ہو۔ اگر تم سٹوڈنٹ لیڈر بن جاتے تو
تمہارے وارے نیارے ہو جاتے۔ جس سیاسی پارٹی کے ساتھ تم لگ جاتے۔ وہ
پیسوں سے تمہاری جیبیں بھر دیتی۔ اُس نے مجھے کہا کہ تم جہاں بھی گئے۔ تمہارے
ساتھ مجرمانہ بات کی گئی کیا تم سمجھے نہیں کہ شرافت سے یہاں کوئی کام نہیں
بنتا ہے"

اس آدمی نے میر کو اپنے ساتھ لگا لیا وہ جانتا تھا کہ میر میں ایک خاص قسم کی
ذہانت ہے۔ اُن ہی دنوں حکم آیا تھا کہ سو روپے اور پچاس روپے کے نوٹ بنکوں
میں جمع کروا دیے جائیں۔ یہ شخص میر کو ایک بنک کے سامنے لے گیا۔ وہاں لمبی
لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ نوٹ تبدیل کروانے آئے تھے۔ اُس شخص نے
میر کو بتایا کہ کچھ لوگ سورج نکلنے سے پہلے یہاں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ
ایسے ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ دنوں سے آرہے ہیں۔ سارا دن قطار میں کھڑے ہو کر
گزار جاتے ہیں۔ ان کی باری نہیں آتی۔

یہ شخص میر کو ایک قطار کے آخر میں لے گیا اور ایک سفید ریش بزرگ سے پوچھا
کہ اُن کے پاس کتنے نوٹ ہیں۔ بزرگ نے بتایا کہ سو سو اور پچاس پچاس کے نوٹ
ملا کر کل بارہ سو روپے ہیں۔ میر کے سابق کلاس فیلو نے اُس بزرگ سے کہا کہ آپ
کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔ یہ ایک ہزار روپیہ مجھ سے لے لیں اور بارہ سو میرے
حوالے کریں۔ بزرگ نے پریشان یا حیران ہونے کے بجائے دعائیں دیں اور کہنے لگے کہ

اس عمر میں میں چار روز سے آرہا ہوں۔ وہ بزرگ قطار سے نکل آئے۔ بارہ سو روپیہ ان کے حوالے کیا اور منیر کے دوست نے ایک ہزار روپیہ دس دس کے نوٹوں کی شکل میں اسے دے دیا۔ وہ بزرگ دعائیں دیتے چلے گئے۔

منیر کا دوست اسے بنک کے اندر لے گیا۔ ایک کلرک کے آگے سو سوا اور پچاس پچاس کے نوٹ رکھے۔ کلرک نے دو منٹ میں دس دس کے نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔ باہر آکر اس نے منیر کو بتایا کہ کلرک نے اپنے پچاس روپے کاٹ لیے ہیں۔

"طارق بھائی!" اس نے کہا۔ "جتنے دن یہ نوٹ تبدیل ہوتے رہے۔ میں دو تین ہزار روز کماتا رہا۔ میرے اس دوست نے مجھے ایک روز دعوت دی کہ چلو تمہیں بہشت بھی دکھاتے ہیں۔ وہ مجھے طوائفوں کے بازار میں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں یہ جرم اپنی عیاشی کے لیے نہیں کر رہا۔ میری جیب میں یہ ساری رقم حرام کی ہے۔ لیکن میں اسے حرام کاموں میں ضائع نہیں کروں گا۔ میں تمہیں سچی بات بتاتا ہوں کہ شراب اور طوائف بازی تو دور کی بات ہے۔ میں سگریٹ تک نہیں پیتا.....

"اس دوست نے جس کا میں نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ایک اور راستہ بتا دیا۔ اس نے مجھے کہا کہ ملٹری کورٹوں کا ایک میجر ہے۔ میں ایک آدمی کو تمہارے پاس لاؤں گا اور اسے یہ بتاؤں گا کہ تم اس میجر کے چچازاد بھائی ہو اور وہ میجر تمہارے اشاروں پر ناچتا ہے۔ پھر میں تمہیں اس شخص کے سامنے کہوں گا کہ ان پر ایک کیس بن گیا ہے جو تمہارے رشتہ دار میجر کے پاس ہے۔ تم مجھ پر اور اس پر غصہ جھاڑنا کہ تم ایسا غلط کام نہیں کرو گے۔ پھر میں تمہاری منتیں کروں گا اور آخر میں تمہیں دو تین ہزار روپے دوں گا۔ تم یہ نوٹ پھینک دینا اور کہنا میں پانچ ہزار سے کم نہیں لوں گا....

"مختصر یہ کہ اگلے ہی روز پانچ ہزار روپے میری جیب میں آ گئے۔ سائل کے جانے کے بعد میں نے اڑھائی ہزار روپے اپنے دوست کو دے دیے۔ سائل کو ہم نے

پوری تسلی دی کہ وہ بری ہو جائے گا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ بری ہوا بھی تھا یا نہیں۔ میں تو کسی میجر کو جانتا پہچانتا نہیں تھا....

"میں نے دونوں بہنوں کی شادی کر دی اور جہیز ایسا دیا کہ لوگ حسد کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میرے ابا امی اور بہنیں مجھے لعنت ملامت کرتی رہیں کہ میں کہیں ہاتھ مار رہا ہوں۔ میں انہیں جھوٹی قسمیں کھا کر بتاتا تھا کہ میں میوہ منڈی اور سبزی منڈی میں دلالی کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میرے اندر ایک فالتو رگ تھی۔ وہ بیدار ہوئی تو میں استاد بن گیا۔ ملٹری کورٹوں کے چھ سات ملزموں سے میں نے مجموعی طور پر پچپن ہزار روپیہ اینٹھا۔ آخر ایک بار پکڑا گیا اور ایک سال سزائے قید ہوئی اور آٹھویں مہینے میں جیل سے نکل آیا لیکن اب میں ایسے تھا۔ جیسے میں سکول سے نکل کر یونیورسٹی میں گیا۔ اور آخری ڈگری حاصل کر کے نکلا۔ تم نے خود جیلوں میں دیکھا ہے کہ جیل جرائم کی یونیورسٹی ہے۔ وہاں مجھے بھی استاد مل گئے اور انہوں نے ایسے ایسے ہاتھ سکھائے کہ میں حیران رہ گیا۔

"میں نے جیب تراشی، اٹھائی گیری، ڈکیتی وغیرہ کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے جعلسازی اور دھوکہ دہی زیادہ پسند آئی۔ میں جب جیل سے نکل کر آیا تو ایک پٹرول پمپ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ایک کار کا پٹرول پمپ میں آکر رکی۔ ایک لڑکا پٹرول ڈالنے لگا۔ وہ اپنے میں مگن تھا۔ کار والا اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ اس کے آگے کیا اور پوچھا۔ "کتنا ڈلوا رہے ہیں صاحب؟" اس نے کہا چار گیلن۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دس دس کے کچھ نوٹ مجھے پٹرول پمپ کا آدمی سمجھ کر میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

"ان دنوں سیمنٹ نہیں ملتا تھا۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ ان کے پاس پیسہ تھا بلکہ لاتو پیسہ تھا۔ لیکن انہیں سیمنٹ نہیں ملتا تھا۔ یہ فراڈ اپنی جان پہچان کے لوگوں کے ساتھ چلتا ہے۔ میری جان پہچان خاصی ہو چکی تھی۔ میں کسی ایک آدمی کو پھانس کر اس سے سیمنٹ کی پوری قیمت وصول کر لیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سیمنٹ تو اسے ملتا نہیں تھا اور میرا کمال یہ تھا کہ اسے مطمئن رکھوں کہ سیمنٹ مل جائے گا۔ اس کاروبار میں گالیاں کھانی پڑتی تھیں۔

طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ جتنی گالیاں منہ پر مجھے ملتی ہیں ویسی ہی گالیاں اُس فرضی آدمی کو دے دینا جسے مَیں ظاہر کرتا تھا کہ اُسے رقم دے دی ہے۔

"گالیاں کھا کھا کر میں مکمل طور پر ڈھیٹ ہو گیا۔ جیل میں ایک اور فراڈ کی بھی تربیت حاصل کی تھی۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ عدالتوں میں ملزموں کا جو ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے لائے جاتے ہیں۔ کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ ان میں اکثر پردیسی ہوتے ہیں یا اُن کے تعلقات محدود ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ضمانت پر رہا نہیں ہو سکتے۔ ایک مدت سے بوگس ضمانت کا کاروبار چل رہا ہے جو کراچی میں سب سے زیادہ ہے۔ ملزم کے ساتھ سودا بازی کر لی جاتی ہے اور جائیداد کے جعلی کاغذات اور رجسٹریاں وغیرہ عدالت میں پیش کر کے مجھ جیسا کوئی فراڈ یا ملزم کو ضمانت پر رہا کروا دیتا ہے۔

"میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ ملزم کی حیثیت کے مطابق اُس سے فیس کمیشن لے لی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کاروبار کو یوں آگے چلایا جاتا ہے کہ دوسرے نمبر سے پہلے بوگس ضامن ملزم کو جا کر کہتا ہے کہ میرے کاغذات جعلی ثابت ہو گئے ہیں۔ میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں کہ تمہاری ضمانت منسوخ کروا کے کہیں بھاگ جاؤں۔ ملزم دوبارہ جیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مقدمے کئی کئی سال چلتے ہیں۔ وہ ہاتھ جوڑتا ہے اور موید رقم پیش کرتا ہے۔ اس طرح بوگس ضامن بلیک میلنگ جاری رکھتے ہیں۔

میں نے اس کاروبار سے بھی خوب کمایا اور یہ رقم چھوٹے بھائیوں کی تعلیم پر خرچ کرتا رہا۔ مجھے پتہ چلا کہ جعلی افیم اور چرس بھی بنائی جا سکتی ہے۔ جو دوسرے ملکوں کو سمگل کی جاتی ہے۔ مجرموں کی دُنیا میں میرا ایک مقام بن چکا تھا۔ ان لوگوں سے پتہ چلا کہ جعلی افیم چرس وغیرہ کس طرح بنائی جاتی ہے۔ مَیں نے کچھ مقدار بڑی محنت کر کے تیار کر لی لیکن میں سمگلنگ کے ہنر سے بالکل ناواقف تھا۔ میرے ایک دو دوستوں نے ایک پارٹی کے ساتھ تعارف کروا دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ بھی کھلاڑی تھے۔ میرے جعلی مال پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ وہاں سے جب میں واپس آیا تو میرے ابا امّی مجھ سے بیگانے ہو چکے تھے۔ ابّا نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ تم اس گھر میں رہو گے

تو ہمیں تمہیں اپنا بیٹا ہرگز نہیں سمجھوں گا۔ تمہارے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کروں گا اور اگر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ پھر میں بہنوں کے گھر گیا۔ انہوں نے مجھے رو رو کر کہا کہ تم کس دنیا میں چلے گئے ہو۔ دونوں بہنوئیوں نے مجھے اپنے گھر رہنے کی پیش کش کی لیکن مَیں اپنے قابو سے نکل چکا تھا.....

میں اب کہیں بھی جا کر آباد ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اپنی وہ جڑ نہیں کاٹ سکتا تھا جو میرے گھرانے میں تھی۔ مَیں گھر سے رشتہ نہ توڑ سکا۔ مجھے گھر گئے ہوئے دو تین دن ہو گئے تھے۔ ایک دوست ملا۔ اُس نے مجھے بڑا شرمسار کیا کہ لوگ تمہارے باپ کی بے عزتی کر رہے ہیں اور تم عیش موج کر رہے ہو۔ مَیں یہ سُن کر بڑا پریشان ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ مالک مکان نے کوئی غنڈہ بھیجا تھا۔ جس نے میرے باپ کی بے عزتی کی اور یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ دو دن کے اندر مکان خالی کر دو یا موجودہ کرایے سے دوگنا کرایہ دو، ورنہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔

"میں بھاگم بھاگ اپنے گھر گیا۔ ابا سے پوچھا کہ وہ کون تھا۔ ابّا نے مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ تم اگر حلالی ہوتے تو آج میری بے عزتی نہ ہوتی۔ باپوں کو بیٹوں پر ناز ہوتا ہے۔ میں دو دن گھر رہا۔ ابّا سے کوئی بات نہ کی۔ تیسرے دن وہی غنڈہ ہمارے گھر آیا۔ میں باہر نکلا۔ وہ شاید مجھے جانتا پہچانتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک گیا۔ مَیں نے اسے کہا کہ مالک مکان سے تم نے کتنے پیسے لیے ہیں۔ اُس نے کوئی ان چار سو روپے کی رقم سنائی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ تم یہ پسند کرو گے کہ تین چار سو روپوں کے پیچھے تمہاری کوئی ٹانگ یا بازو ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جائے؟ وہ بھی آخر غنڈہ تھا۔ کچھ تو تو مَیں مَیں ہوئی اور وہ چلا گیا۔ میری بھی یاری ایسے ہی غنڈوں کے ساتھ تھی۔ مَیں نے چار پانچ غنڈے ساتھ لیے۔ پہلے اُس غنڈے کے گھر گیا اور اُسے باہر بلا کر مارنے پیٹنے کے بجائے زبانی کہا کہ آئندہ میرے گھر کا رخ نہ کرے۔ وہاں سے میں ان غنڈوں کو ساتھ لے کر مالک مکان کے گھر گیا۔

اس شخص کا مَیں کوئی ادب لحاظ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے گلی میں کھڑے ہو کر اُسے گالیاں دے کر للکارا۔ وہ باہر آیا اور اندر بھاگ گیا۔ محلے کے لوگ جمع ہو گئے مَیں نے انہیں بتایا کہ اس شخص نے کیا حرکت کی ہے اور مَیں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ مَیں نے محلے والوں سے کہا کہ اسے باہر نکالو اور یہ وعدہ کرے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

باہر آنے کے بجائے اُس نے ہمیں اندر بلا لیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ میری اور بے عزتی نہ کرو۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ مَیں نے اُسے کہا کہ اُسے ایک پیسہ فالتو کرایہ نہیں ملے گا اور اُس نے غنڈے بھیجے یا مقدمہ دائر کیا تو اُس کا گھر اُسی رات لُٹ جائے گا۔ مَیں نے یہ بھی کہا کہ وہ کرایہ لینے بھی وہاں نہ جائے۔ کرایہ اسے یہیں مل جایا کرے گا۔ مَیں نے گھر جا کر ابا سے کہا کہ آئندہ وہ کسی کو کرایہ نہ دے۔ میں خود کرایہ پہنچایا کروں گا۔

"اس مالک مکان کو ٹھکانے لگا کر ہم واپس آ رہے تھے۔ تو میرے ایک غنڈے دوست نے کہا کہ یہ کاروبار بڑا اچھا ہے۔ تین چار سو روپیہ وصول کرو۔ کسی شریف کرایہ دار کو دھمکیاں دو۔ مکان خالی کروالو۔ مَیں نے کبھی غنڈہ گردی نہیں کی تھی۔ لیکن یہ کاروبار مجھے پسند آیا۔ مَیں نے چند دنوں میں چار پانچ مالکان مکان ڈھونڈ نکالے۔ ہر ایک کے ساتھ کچھ اس طرح کی باتیں کیں کہ آپ کتنا کرایہ لے رہے ہیں؟ انہوں نے جو کرایہ بتایا۔ مَیں نے اس سے دوگنا کرایہ بتا کر کہا کہ آپ مکان خالی کروالیں۔ ہم آپ کو بڑا موٹا کرایہ دار لا دیں گے۔ ہر مالک مکان نے یہی مشکل بتائی کہ کرایہ دار مکان خالی نہیں کرتے۔ میں پانچ ہزار بتا کر کہتا کہ یہ رقم دے دو۔ اور پرسوں تک مکان خالی لے لو....

"مالک مکان تو چاہتے ہی ہیں کہ ہر مہینے کرایہ بڑھایا جائے۔ بعض پرانے کرایہ داروں کو کئی کئی ہزار روپیہ پیش کرتے ہیں کہ وہ مکان خالی کر دیں۔ میری پیش کش انہیں بڑی اچھی لگتی اور صرف ایک مہینے میں مَیں نے کرایہ داروں کو غنڈوں سے

ارا دھمکا کر پانچ مکان خالی کروا لیے اور پچیس ہزار روپیہ مل گیا۔ میرے ساتھ تین غنڈے تھے۔ یہ رقم ہم چاروں نے تقسیم کر لی۔

"اتنے بڑے شہر میں ہزارہا مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ میں اسی کو کاروبار بنانا چاہتا تھا۔ ایک روز ایک مالک مکان نے مجھے کہا کہ دس بارہ سال سے میرے ایک مکان میں بنگالی خاندان رہتا ہے۔ وہ غریب سے لوگ ہیں۔ کرایہ نہیں بڑھاتے اور مکان بھی نہیں چھوڑتے۔ اُس نے کہا کہ آپ تین ہزار روپے لے لیں۔ اور وہ مکان خالی کروا دیں۔ مَیں اُن کا پتہ لے کر وہاں گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کتنے پانی میں ہیں اور کیا غنڈہ گردی کی ضرورت ہے یا نہیں چھوٹا سا مکان تھا۔ مَیں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھا سا بنگالی باہر آیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم مکان کیوں نہیں خالی کرتے۔ میں کل شام تک تمہیں یہاں نہ دیکھوں....

بوڑھے نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ مجھے چارپائی پر بٹھا کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے پھر اُس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور اُس کی آنکھوں سے بنگال کی ندیوں کی طرح آنسو بہنے لگے۔ اُس نے کہا کہ چھوٹی سی دکان ہے جو میرے کنبے کو بڑی مشکل سے روٹی کھلا سکتی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت میرے سر پر یہ ہے کہ میری ایک بیٹی جوان ہے۔ مَیں اسے صرف زندہ رکھ سکتا ہوں۔ اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ میں جاتا ہوں مجھے تھوڑا عرصہ اور اسی کرایے پر رہنے دو۔ شاید بیٹی کا ہاتھ کسی کے قابل دینے کے قابل ہو جاؤں۔

"میں نے اُسے کہا کہ تم اپنے وطن کیوں نہیں گئے؟ اب تو تمہارا اپنا وطن بن ہے۔ اُس نے میری ٹانگ پر اپنا ہاتھ اس طرح دبایا جیسے اُس کی انگلیاں ے گوشت میں اُتر جائیں گی۔ اُس نے جذبات سے کانپتی آواز میں کہا کہ میرا وطن ہے۔ میری اور میرے خاندان کی قبریں اسی مٹی میں بنیں گی۔ تم جسے بنگلہ دیش کہتے

ہو وہ میرا دیش نہیں - وہ دیش ہندو نے بنایا ہے۔
اگر تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو تو میں پھر بھی اسی مٹی پر تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا
اُس نے پھر میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا کہ مجھے پردیسی سمجھ کر نہ دھتکارو میری
جوان بیٹی کے حال پر رحم کرو ....

"جس طرح پاکستان کے ایک افسر نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ
شادی نہیں کر سکتا تو میرے اندر جو آتش فشاں پھٹ پڑا تھا - وہی پھر پھٹ پڑا میں
نے بوڑھے بنگالی سے پوچھا - کہاں ہے تمہاری بیٹی ؟ اس نے آواز دی اور ایک
سانولی سی لڑکی کمرے میں آئی - وہ کوئی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں تھی - لیکن مجھے
اُس کی آنکھوں میں مشرقی پاکستان کی لاش اور اُس کے باپ کی غربت نظر آ رہی تھی
مَیں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر بوڑھے سے کہا کہ میں تمہاری بیٹی کو بیاہ لے جاؤں گا ...

"بوڑھے کا سانولا رنگ لال ہو گیا - وہ سمجھا شاید میں کوئی بدمعاشی کی بات کر
رہا ہوں یا اُس کی غریبی پر طنز کر رہا ہوں - میں نے بہت سی باتیں کہہ سن کر اُس کے
وہم اور شک شبے دُور کر دیے - پانچ چھ دنوں بعد میرا اُس کی بیٹی کے ساتھ نکاح
ہو گیا میں نے اُس مکان کے مالک سے کہا کہ آئندہ اس بوڑھے کو پریشان نہ کرے - جب میری
مالی پوزیشن بہتر ہو گی تو میں خود ہی کرایہ بڑھا دوں گا -

"بوڑھے کی ایک چھوٹی سی منیاری کی دکان تھی - میرے پاس کافی رقم تھی - مَیں نے
ایک بڑی دکان کرایے پر لے لی اور بوڑھے کو جو میرا سسر بن چکا تھا - اپنے ساتھ
لگا لیا - اللہ نے کرم کیا کہ میری صرف ایک نیکی پر میرے گناہ معاف کر دیے اور میرا
کاروبار چل نکلا - اب بڑی خوشحالی کی زندگی گزر رہی ہے اور مَیں شریفوں کی زندگی میں
واپس آ گیا ہوں ۔"

⁂

شانتی اور شیطان

میں جب بھارت میں قید کاٹ رہا تھا - تو اُمید نہیں تھی کہ قید مکمل ہونے پر
وطن واپس چلا جاؤں گا - یہی حال باقی پاکستانیوں کا تھا - جو وہاں قید تھے - ہم کوشش
کرتے تھے کہ اپنے آپ کو زیادہ تر مصروف رکھیں - جیل میں سارے دن کے لیے
کام تو ہوتا نہیں تھا - ہم جب فارغ بیٹھتے تو ایک دوسرے کو جھوٹے سچے واقعات
اور کہانیاں سنانے لگتے تھے - نا بھہ جیل ان دنوں پاکستانیوں کے سنٹر کی حیثیت رکھتی
تھی - مشرقی پنجاب میں کوئی پاکستانی جہاں بھی گرفتار ہوتا اور اُسے سزا ہو جاتی تو اُسے
نابھہ جیل میں بھیج دیا جاتا تھا - اس طرح بھارتی مسلمان بھی جب پنجاب میں گرفتار ہوتے
تو انہیں بھی زیادہ تر اسی جیل میں بھیجا جاتا تھا - خصوصاً عادی مجرموں کے لیے تو یہی
جیل مخصوص تھی -

ایک روز ہم لوگوں سے جیل کے "چکر" میں مشقت لی جا رہی تھی - "چکر" جیل
کے عین درمیان اُس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں انچارج حوالدار بیٹھتا ہے اور عموماً نئے
قیدی سب سے پہلے یہیں آتے ہیں

نمبردار (پرانا قیدی) مکھن سنگھ جو لدھیانے کا رہنے والا تھا اور ایک ہندو
بدمعاش کو قتل کر کے بیس سال قید کاٹ رہا تھا - اس جیل میں آتے ہی میرا دوست
بن گیا - اُن دنوں اُس کی ڈیوٹی چکر میں تھی - ہمارے سامنے قیدیوں کی قطار لگی
ہوئی تھی -

مکھن سنگھ نے مجھے کہا : "میاں ! شانتی دیوی والا نذیر آ گیا ہے ۔"

شانتی دیوی ایک کروڑ پتی ہندو لالے کی بیوی تھی۔ جسے کوئی مسلمان بھگا کر
لے گیا تھا۔ اور اُس کی خبریں اخباروں میں جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع ہو رہی تھیں
اس کی ایک وجہ تو شانتی دیوی کا حُسن تھا اور دوسری وجہ یہ کہ اُس کا کروڑ پتی خاوند لالہ
تھا۔ اتنی زیادہ تشہیر کی وجہ ہندو اخباروں کا مسلمانوں کے خلاف تعصب تھا۔ وہ
لوگ ایسی خبریں جن میں کوئی ہندو یا سکھ عورت کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ جائے
یا بیاہ کر لے، اتنی اُچھالا کرتے تھے کہ اُس پر مقامی ہندو آبادی میں اشتعال پیدا
ہو جاتا اور وہ مسلمان آبادیوں پر حملے شروع کر دیا کرتے تھے۔

نذیر اب شانتی دیوی کے اغوا میں تین سال قید لے کر آیا تھا۔ اُس کے آنے
سے پہلے ہی اس کے افسانے جیل میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن مَیں اُس کی زبانی
سارے واقعات سننے کے لیے بے چین تھا۔ جیل کا چکر ایسی جگہ ہے۔ جہاں ہر وقت
کسی نہ کسی افسر کی آمد کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس لیے قیدی ایک دوسرے سے
بات کرتے ہوئے خاصے محتاط رہتے تھے۔ مَیں نے سرسری نظر سے نذیر کا جائزہ لیا
اور اپنے کام میں مگن رہا۔

دوسرے ہی روز نذیر کو مشقت دے کر ہمارے ساتھ جیل کے احاطے میں
بھیج دیا گیا۔ مسلمان ہونے کے ناطے ظاہر ہے۔ ہمیں اس سے ہمدردی تھی۔ اگلے
دو چار روز میں میری اُس سے
چھننے لگی اور ایک روز جب مَیں نے اُس سے شانتی دیوی کے اغوا کی کہانی پوچھی
تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"طارق بھائی!" اُس نے کہا۔ "اگر تم یہ کہو کہ مجھے یہ قید شانتی دیوی کے اغوا
کے الزام میں ملی ہے تو مَیں نہیں مانتا۔ میرے بھائی! شانتی دیوی تو میرے گلے
پڑ گئی تھی۔ ورنہ یہ کوئی ایسا جُرم نہیں تھا۔ میری تو ساری زندگی جرم کرتے ہی گزری
آج تک جیل کا منہ نہیں دیکھا تھا، اب یہ گھر بھی دیکھ لیا۔"

اُس نے مجھے جو کہانی سنائی وہ اپنے الفاظ میں آپ کو سُنا دیتا ہوں۔ اس

کی خبریں اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ لیکن اصل کہانی نذیر سے معلوم ہوئی۔ ہندو
اخباروں کو تو مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کا بہانہ ہاتھ آیا تھا۔ لیکن حقیقت
کچھ اور تھی۔

اس کہانی کا آغاز لُدھیانہ کے ایک امیر کبیر محلّے سے ہوا جہاں ایک دولت مند لالہ
دوارکا داس نے ایک نوجوان بیوہ شانتی دیوی سے شادی کر رکھی تھی۔ شانتی کوئی غریب
یا گری پڑی عورت نہیں تھی کہ وہ دوارکا داس جیسے کے ساتھ بیاہ دی جاتی۔ اس کی
وجہ یہ تھی کہ وہ بیوہ ہو کر گھر آ بیٹھی تھی۔ اور ہندو عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اُس سے
کوئی بھی بیاہ نہیں کرتا، نہ ہی وہ بے چاری خود شادی کر سکتی ہے۔ اس سے اُس کا دھرم
بھرشٹ ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شانتی دیوی نے دوارکا داس کے ساتھ شادی پر صرف اس لیے ہاں کی تھی کہ
اس کی نظر دوارکا داس پر نہیں بلکہ اُس کے نوجوان بیٹے کیلاش پر تھی۔ اس نوجوان
کے ساتھ شانتی دیوی کی ملاقات پہلے کہیں ہو چکی تھی۔ اُس کی ڈیل ڈول کچھ ایسی تھی
کہ شانتی دیوی کی پہلی ملاقات میں اُس پر مست ہو گئی تھی۔ دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے
کے ہاں آنا جانا تو تھا ہی
شانتی دیوی کے حسن و جوانی کو
دیکھ کر دوارکا داس نے اُس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کی طرف سے پیغام
ملنے پر شانتی نے ہاں کر دی۔ شانتی کے ماں باپ نے تو شکر کیا ہو گا کہ ان کی بیوہ بیٹی
بیاہی گئی ہے۔

شانتی بیاہ کر کے دوارکا داس کے گھر آئی تو اُسے کھل کر اپنی ہوس پوری کرنے
کا موقعہ مل گیا۔ لالے کا بیٹا کیلاش ڈیل ڈول کا تو بڑا دلکش اور مضبوط تھا۔ لیکن ذہنی
طور پر بڑا ہی کمزور تھا۔ وہ جلد ہی شانتی کے قابو آ گیا اور شانتی نے اس سے
غلط تعلقات استوار کر لیے۔ دُنیا کی نظروں میں وہ ماں بیٹا تھے۔

کیلاش اس بُری طرح شانتی کے شکنجے میں پھنس چکا تھا کہ شانتی کے ہاتھ میں
کھلونا بن گیا۔ ان کا یہ گھناؤنا کھیل جاری تھا کہ اچانک ایک بجلی لالہ دوارکا داس نے

یہ کہہ کر شانتی پر گرادی کہ وہ کیلاش کی شادی کرنے والا ہے اور اُس نے رشتہ پسند کر لیا ہے۔ کیلاش نے تو یہی سمجھا تھا کہ اب اُس کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا شانتی نے بظاہر اس خبر پر بڑی خوشی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور "اپنے بیٹے" کی شادی کی تیاری میں مگن ہو گئی۔

کیلاش کی منگنی ہوئی اور اُس کے فوراً ہی بعد شادی ہو گئی اور کامنی، کیلاش کی دلہن بن کر آ گئی۔ کامنی کے آجانے سے کیلاش کی دلچسپی شانتی سے کم ہونے لگی اور اب وہ زیادہ تر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ شانتی کو تنہائی میں ملنے کا موقعہ ہی نہ دے۔

اس صورتِ حال نے شانتی پر جھنجھلاہٹ طاری کر دی لیکن وہ تھی بڑی موشیار عورت۔ بجائے کوئی جذباتی قدم اُٹھانے کے اُس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیا اور ایک منصوبہ دل میں طے کرنے کے بعد اُس پر عمل پیرا ہو گئی۔ اُس نے پہلے تو کامنی کو سنبھالا اور حیلے بہانوں سے اُس کے کان کیلاش کے خلاف بھرنے شروع کر دیے۔ اُس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ ان دنوں کو اکٹھے بیٹھنے اور میاں بیوی کے تعلقات برقرار رکھنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ وہ گھرانہ شہر کا لکھ پتی گھرانہ سمجھا جاتا تھا اور آئے روز کوئی نہ کوئی پارٹی اگر ان کے ہاں نہ ہوتی تو وہ کسی پارٹی میں چلے جاتے۔ شانتی نے کامنی سے بڑی گہری دوستی کر لی اور اکثر اُسے اپنے ساتھ رکھتی۔ اپنے ساتھ اُسے مختلف پارٹیوں میں لے جاتی اور رات کو اتنی دیر گئے واپس آتی کہ کیلاش سو چکا ہوتا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو شانتی کامنی کو اپنے کمرے میں باتیں کرنے کے بہانے لے جاتی اور رات کو دونوں وہیں سو جاتیں۔

اس دوران اُس نے کوشش کی کہ کامنی کے گرد امیر کبیر نوجوانوں کا جمگھٹا لگا رہے۔ ان نوجوانوں کی رال یوں بھی نوجوان اور حسین عورتوں پر ٹپکتی رہتی تھی اور وہ کامنی جیسی خوبصورت اور امیر عورتوں کے متلاشی رہتے تھے۔

شانتی کو اس مقصد میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی اور اُس نے کوشش

کر کے کامنی کو بھی ایک نوجوان کی طرف متوجہ کر دیا۔ دوسری طرف اُس نے کیلاش کے کان بھرنے شروع کیے اور اُسے بتایا کہ کامنی کا ماضی ٹھیک نہیں۔ نہ ہی وہ اُس میں کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔ اُس کی باتوں پر ممکن تھا کیلاش کو یقین نہ آتا۔ کیونکہ وہ خود کوئی بہت اچھی عورت نہیں تھی لیکن ہندو معاشرے میں ایک دوسرے کی ماں بہن سے ناجائز تعلقات معمول کی بات ہے اور یہ کوئی غیر معمولی حرکت نہیں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ کیلاش اُس کے کہنے میں آ گیا۔ پھر شانتی نے ایک اور داؤ کھیلا۔ ایک روز کامنی اور اُس نوجوان کو کسی بہانے سے ایک جگہ اکٹھا کر کے کیلاش کو وہاں لے گئی۔ اُس نے دونوں کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو اُس کا شک یقین میں بدل گیا۔

شانتی کی سکیم کامیاب رہی اور دونوں کو اُس نے ایسے شاندار طریقے سے بے وقوف بنایا کہ ایک روز کیلاش نے شراب کے نشے میں کامنی کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ کامنی کوئی غریب گھر کی لڑکی تو تھی نہیں کہ خاموش رہتی۔ وہ بھی امیر کبیر گھرانے کی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کے بھائی خاصے بدمعاش قسم کے تھے۔ لیکن ایسے ویسے بدمعاش نہیں تھے جو کوئی غلط دھندہ کریں۔ وہ صرف لڑنے والے بدمعاش تھے اور آئے روز کسی نہ کسی کو پیٹتے رہتے تھے۔ کامنی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اُس نے اپنے بھائیوں کو ساری کہانی سنا دی۔ لڑکے عقلمند تھے۔ وہ جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے کیلاش سے ملاقات کے بعد اندازہ لگا لیا کہ اصل شرارت کی جڑ شانتی ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر شانتی کے ماضی کی تحقیقات کی تو اُس کے بہت سے کالے کرتوت اُن کے علم میں آئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس کا پہلا خاوند بھی بڑے پُراسرار حالات میں مرا تھا۔ جن لوگوں کے درپردہ تعلقات کبھی شانتی دیوی سے رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شانتی حیوانی جذبات سے مغلوب رہنے والی شیطان صفت عورت ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد سوائے عیش موج کرنے کے اور کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے کیلاش کو

بھی ڈرا دھمکا کر اُن کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا پتہ لگا لیا۔ کامنی کے بھائیوں نے شانتی کے بوڑھے خاوند لالہ دوارکا داس کو شانتی دیوی کے بارے میں کچھ بتانا فضول سمجھا۔ اس سے کئی قباحتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک تو کیلاش کی بدنامی ہوتی جو ان کا بہرحال بہنوئی تھا اور خود لالہ دوارکا داس اس بُری طرح شانتی کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ اُن کی کسی بات پر یقین ہی نہ کرتا۔

کامنی کے بھائیوں نے اس صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک رات انہوں نے کسی بہانے سے شانتی دیوی کو گھر سے باہر بُلایا اور اُسے اغوا کر کے اپنے ایک بدمعاش دوست کے ٹھکانے پر لے گئے۔ اُسے انہوں نے شانتی کو سنبھالنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ شانتی دیوی کی پُراسرار گمشدگی پر لالہ دوارکا داس چکرا کر رہ گیا۔ پہلے تو وہ اس خوف سے پولیس کے پاس نہ گیا کہ اس طرح اُس کی اپنی بدنامی ہو گی پھر جب اُس نے دیکھا کہ اب شانتی کے غائب ہونے پر لوگوں نے کہانیاں تراشنی شروع کر دی ہیں۔ تو اُس نے پولیس سے رجوع کرنا چاہا۔ لیکن اُس سے پہلے ہی کامنی کے بھائی اُس تک پہنچ گئے۔

انہوں نے لالے سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی پگڑی اپنے ہاتھوں نہ اچھالے۔ اُس کی بیوی کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنے ایک سابقہ آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ جعلی ثبوت بھی اُسے دکھا دیے اور جھوٹی سچی گواہیاں بھی پیش کر دیں۔ ان گواہوں نے حلف اُٹھا کر کہا کہ شانتی دیوی کامنی بڑا ہی گھناؤنا رہا ہے۔

اس دوران کامنی کے بھائیوں نے لالہ دوارکا داس کو یہ خبر بھی دی کہ انہوں نے شانتی دیوی کا پتہ لگا لیا ہے اور وہ اُسے بہت جلد اُس کے سامنے پیش کرنے والے ہیں۔ اگلے ہی روز وہ شانتی کو لے کر آ گئے۔ اب شانتی نے لاکھ چیخ چلا کر اپنی بے گناہی کی دُہائی دی لیکن لالہ اُس کی کوئی بات سُننے پر تیار نہ تھا۔ کیونکہ کامنی کے بھائیوں نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اُس کے بیٹے اور بہو کی زندگی میں زہر

گھولنے والی یہی شانتی دیوی ہے اور اُس نے کیلاش کو بلیک میل کر کے اُس سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ کامنی کو راستے کا روڑہ سمجھ کر اُس نے ایک سازش کے تحت یہاں سے بھگایا ہے اور وہ صرف لالہ کی جائداد کے لالچ میں اُس کی بیوی بنی ہوئی ہے۔

شانتی کی چیخ و پکار پر توجہ دیے بغیر لالہ دوارکا داس نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ شانتی دیوی اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اُس کی نظر دوارکا داس کی کروڑوں کی جائداد پر تھی۔ اُس نے یہ بات تو جان لی تھی کہ اس سب کچھ کے پیچھے کامنی کے بھائیوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن وہ اپنی لاکھ کوشش کے باوجود اُن کا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس نے ہندوؤں کی روائتی کمزوری یعنی ضعیف الاعتقادی کا سہارا لیا اور یہیں پر اُس کی ملاقات نذیر سے ہوئی۔

نذیر دہلی کا بگڑا ہوا امیرزادہ تھا اور بچپن ہی میں غلط ماحول نے اُسے گندی صحبت میں بٹھا دیا تھا۔ باپ نے جیسے تیسے اُسے ایف۔ اے کروا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے تو چوری چکاری ہی کرتا تھا۔ اب پیشہ ور فراڈیا بن گیا۔ اس سلسلے میں اس نے محفوظ ترین راستہ یہ اپنایا کہ پڑھے لکھے گیانی دھیانی جوگی کا روپ دھار کر امیر ہندوؤں کی آبادیوں میں ڈیرہ جمانا شروع کر دیا۔ اس کا یہ بزنس خوب چمک اٹھا اس سلسلے میں نذیر نے باقاعدہ ایک گروہ ترتیب دے رکھا تھا جو اُس کے نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہی اُس کے کشف و کمالات کے چرچے وہاں کر دیتا جن سے متاثر ہو کر امیر گھرانوں کی ہندو عورتیں اُس کے گرد جمع ہونے لگتیں۔

شانتی دیوی کے محلے میں اُس کی آمد حال ہی میں ہوئی تھی اور اُس کی شہرت کے افسانے شانتی کے کانوں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ ایک روز وہ نذیر کے پاس اپنا دُکھڑا سنانے آ گئی۔

اُس کی جسمانی ساخت کو اور اُسے زیورات سے لدا پھندا دیکھ کر نہ صرف نذیر بلکہ اُس کے چیلے چانٹوں کے منہ میں بھی

مایا، ماں اور ممتا

معاشرہ اور جرائم میرے پسندیدہ موضوع ہیں، کہانیوں کی تلاش میں مجھے ایسی ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ میں اُن دنوں ایسے ہی ایک فیچر کی تیاری کے لیے درگاہوں اور خانقاہوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ ایک روز پاکستان کے ایک دُور دراز مقام کی خانقاہ پر گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہاں بے اولاد لوگ اولاد حاصل کرنے جاتے ہیں۔ مشہور تھا کہ یہاں پر حاضری دینے، نیاز چڑھانے اور منت وغیرہ ماننے سے بے اولاد کو اولاد مل جاتی ہے۔ میں جب وہاں گیا تو ارد گرد اور دُور دراز کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ مزار ایک قبر کے ارد گرد چار دیواری اور اوپر چھت ڈال کر اور اس پر رنگ برنگ کے جھنڈے اور کپڑوں کی بنی ہوئی بچوں کے کھیلنے والی گڑیوں سے بنایا گیا تھا۔

یہاں جو کوئی آتا — وہ نیاز بانٹتا۔ مزار پر رکھے ہوئے لوہے کے گلے میں پیسے ڈالتا اور مزار کی دیواروں سے کپڑے کی گڑیا باندھ کر اپنی منت پوری کرتا۔

ابھی میں مزار سے کچھ فاصلے پر اُس جگہ کھڑا تھا۔ جہاں لنگر وغیرہ کا انتظام ہے۔ مجھے درمیانی عمر کی ایک عورت دکھائی دی۔ کپڑوں اور شکل و صورت سے وہ کوئی امیر عورت دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا رنگ روپ اور خدوخال دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ یہ عورت جوانی میں حسین رہی ہے۔ اُس نے ہاتھ میں جھاڑو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے قریب چلی آئی۔

"ملے گی اولاد.... بیٹا ملے گا بیٹا!" اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری گود ہری ہو جائے گی۔ بابا سب کو اولاد دیتے ہیں۔"

خانقاہ کا ایک خادم جو دُور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہمارے پاس آیا اور اس عورت سے بولا۔ "چلو، اپنا کام کرو، نہیں تو باجی غصے ہو جائیں گے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بابو جی! بے چاری کا مغز پھر گیا ہے۔ آپ اندر چلے جائیں اور حاضری دیں۔"

میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ عورت باجی کے غصے کا سنتے ہی وہاں سے چلی گئی۔ وہ بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اُس کا انداز مجھے نارمل نظر نہیں آ رہا تھا معاشرے کا صحیح عکس انہی لوگوں کی آنکھوں میں چمکتا ہے جو نارمل نہیں ہوتے اور جنہیں ہم پاگل کہتے ہیں۔ میں نے اس عورت کے متعلق تین چار مردوں اور عورتوں سے پوچھا۔ میں ایسے ہی کرداروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ یہ میری ریسرچ کی ایک کڑی ہے۔ جو چار دیواری کی دنیا کی ایک کہانی ہے۔ میرا تجسس بڑھنے لگا۔ اس کا نام کچھ اور بتایا گیا تھا۔ میں اُسے شاہدہ کہوں گا۔

شاہدہ ایک درمیانی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ لڑکی کو خدا نے رنگ و روپ پر کشش دے دیا تھا۔ پیدا ہوتے ہی سارے خاندان میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت سمجھی جانے لگی۔ شاہدہ کا باپ ایماندار آدمی تھا۔ وہ ایسے محکمے میں کام کرتا تھا۔ جہاں کے چپڑاسی بھی لکھ پتی کہلاتے ہیں۔ لیکن وہ بے چارہ مشکل ہی گھر کا خرچ چلا رہا تھا۔

شاہدہ کی ماں درمیانے طبقے کی اُن عورتوں جیسی تھی۔ جنہیں جگہ جگہ گھومنے اور خود کو نمایاں کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں اس نے شاہدہ کو اُس کی خوبصورتی کا احساس دلایا اور اُس کی خوبصورتی کو چار دیواری کی دُنیا میں اپنا رتبہ بڑھانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ خاندان میں اور خاندان کے باہر "ہر دوسرے تیسرے روز کسی نہ کسی تقریب کے بہانے اسے سجا سنوار کر اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ لیکن وہ اپنی خوبصورتی کو بھی بنایاں رکھتی تھی۔ جواب ماند

پڑتی جارہی تھی۔ وہ میک اپ کے ذریعے اپنی اصلی عمر کو دھوکہ دیتی رہتی تھی۔

وہ اپنے آپ کی باجی کہلوا کر بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ دوسری طرف خاندان کے لوگ تھے۔ وہ بھی شاہدہ کے حسن کی تعریفیں کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہدہ اپنی ذات کے خول میں قید ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو حسن کی ملکہ سمجھنا شروع کر دیا اور وہ نمائش پسند ہو گئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ قدرتی امر ہے کہ لڑکی اپنی ماں کی شخصیت اور کردار کا عکس ہوتی ہے۔

شاہدہ کا باپ چونکہ ایماندار ملازم تھا۔ اس لیے دفتر کے لوگ اکثر کام اسی کے سر تھوپ دیا کرتے تھے۔ وہ دفتر ہی میں نہیں گھر پر بھی فائلوں ہی میں مغز ماری کرتا رہتا تھا اور اسے اتنی فرصت نہیں ہوتی تھی کہ اپنی بیوی کے لچھنوں پر نظر رکھ سکتا۔ جب اسے تھوڑا بہت احساس ہوا کہ اس کی بیوی نے اس کی بیٹی کو نمائش کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ تو اس نے ایک دو مرتبہ دبی زبان سے اسے منع کیا اور اس حرکت کے سنگین نتائج کا احساس بھی دلایا لیکن جواب میں اسے بیوی کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ وہ اپنے آپ کو احمق سمجھنے لگا اور خاموش ہو گیا۔

شاہدہ نے لڑکپن سے جوانی کی سرحد میں قدم رکھ لیا۔ لڑکی چونکہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ اس کے علاوہ ماں کے اثرات اور آئے دن مختلف محفلوں میں بن ٹھن کر آنے جانے کی وجہ سے اسے ناز و ادا اور باتیں کرنے کا فن بھی آگیا تھا، اس چیز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ درمیانے قسم کے گھرانوں کی یہ بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں جو یا تو ان کا گھر بھر دے یا پھر خوبصورت ہو۔ جوان و دلہے اپنی خوبصورت دلہنوں کو محض نمائش کے لیے ساتھ لیے پھرتے اور فخر کرتے ہیں، دلہن خواہ پھوہڑ ہی ہو۔

شاہدہ میں پہلی خوبی تو نہیں تھی۔ لیکن دوسری خوبی توقع سے بڑھ کر تھی۔ اس کے

رشتے کے امیدواروں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز نئے سے نیا رشتہ آنے لگا اور شاہدہ کی ماں کے ہاتھ ایک بزنس آگیا۔ اس نے جب اپنی لڑکی کی اتنی مانگ دیکھی تو اس نے اسے کھلنے پلینے اور موج اڑانے کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ رشتے مانگنے والوں کے ہاں پہلے تو دعوتیں وغیرہ کھاتی۔ ان سے تحفے وصول کرتی اور بعد میں کسی بہانے سے انکار کر دیتی۔ اس نے اس کام میں اپنی بیٹی کو بھی خاصا طاق کر رکھا تھا۔ شاہدہ بھی اپنی ماں کی طرح رشتہ مانگنے کے لیے ہر آنے والے کے ساتھ گھل مل جاتی اور اس کی ماں اپنا کاروبار شروع کر دیتی۔ دوسری طرف شاہدہ لڑکے کی بہنوں وغیرہ کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے زبانی کلامی تعلقات گانٹھ لیتی اور ان لوگوں کو جواب ملنے سے پہلے پہلے لڑکے سے دو چار اچھے خاصے تحفے اینٹھ لیتی۔

ماں بیٹی اس کاروبار میں اتنی ماہر اور دلیر ہو گئیں کہ ماں اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی کے ساتھ شاہدہ کی باقاعدہ منگنی بھی کر دیتی۔ جب وہ دیکھتی کہ رشتہ مانگنے والے اس کے اور اس کی بیٹی کے جال میں بری طرح پھنس چکے ہیں تو وہ ان سے کہہ دیتی کہ ہم کچھ دینے کے قابل نہیں۔ دوسری طرف رشتہ مانگنے والے جو اپنے لڑکے کے اصرار سے تنگ آچکے ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ شاہدہ کے تیر نظر کا شکار ہو چکا ہوتا تھا۔ فوراً اسی بات پر صبر شکر کرتے کہ لڑکی کی ماں مان تو گئی۔ لڑکے والوں سے منگنی پر سونے کی انگوٹھی ایک آدھ زیور اور اچھے بھلے کپڑے وصول کر کے وہ ڈیڑھ دو مہینے منگنی برقرار رکھتی۔ اس کے بعد کسی بہانے توڑ دیتی اصل میں اسے کسی ایسے لڑکے کی تلاش تھی۔ جسے وہ ایک طرح کا گھر داماد بنا کر رکھے اور جو نہ صرف اس کی بیٹی کے بلکہ اس کے بھی بناؤ سنگار کا خرچ سنبھالے رکھے اور اس کی ذہنی عیاشی کا سامان میسر آتا رہے۔

شاہدہ کا باپ اپنے گھر میں یہ کاروباری ڈرامے دیکھتا رہا۔ آخر کب تک برداشت کرتا۔ ایک روز اس نے مرد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک انتہائی ایماندار اور شریف لڑکے کو جو اس کے دفتر ہی میں کلرک تھا اور اس کی بیوی کا دور کا رشتہ دار

بھی تھا اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لڑکے کے گھر والوں نے کئی مرتبہ اُس سے شاہدہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگا تھا۔ شاہدہ کا باپ اپنی حیثیت کو پہچانتا تھا اور اُسے اپنا ایمان عزیز تھا۔ اُس روز جب شام کے وقت ماں بیٹی بن ٹھن کر کہیں جا رہی تھیں تو باپ نے انہیں روک لیا۔

پہلے تو شاہدہ اور اس کی ماں حیران رہ گئیں کہ اُس کو اتنی ہمت کیسے ہوئی؟ لیکن آج اُس کے تیور بالکل ہی بدلے ہوئے تھے۔ اُس نے شاہدہ کو بڑی درشتی سے باہر جانے سے روکا اور اس کی ماں کی چیخ و پکار کی پرواہ کیے بغیر اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر اُس نے آئندہ کسی کو بھی اس مسئلے پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو وہ اُس کو کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ شاہدہ کی ماں کی ایک نہ چلی۔

شاہدہ کی ماں نے بڑا شور و غل مچایا۔ اپنی بیٹی کے ساتھ گھر سے نکل جانے کی دھمکیاں بھی دیں۔ لیکن اُس کے خاوند نے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔ جب شاہدہ کی منگنی اُس نوجوان سے جس کا نام انور تھا ہو رہی تھی تو اُس کی ماں نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اُس نے انور کی ماں کی اتنی بے عزتی کی کہ بے چاری بیوہ عورت بے بسی سے رو پڑی۔ لیکن شاہدہ کے باپ نے انہیں پہلے ہی پکا کر رکھا تھا۔ اُس نے ہفتے کے اندر اندر شاہدہ کا نکاح بھی انور سے پڑھوا دیا اور ایک مہینے بعد کی رخصتی کی تاریخ دے دی۔

یہ پورا مہینہ شاہدہ کی ماں نے گھر میں اودھم بپا کیے رکھا۔ لیکن اُس کے خاوند نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔ شاہدہ اور اُس کی ماں نے بادلِ نخواستہ اس شادی کو قبول کر لیا اور وہ ایک مہینے بعد دلہن بن کر انور کے گھر چلی گئی۔ انور کے گھر میں اُس کے علاوہ دوسرا واحد فرد اس کی بیوہ ماں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا گزارہ چلتا رہا ورنہ جو ہنگامہ شاہدہ نے اپنی ماں کے سکھانے پڑھانے پر شادی کے پہلے ہی دن سے شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد انور کے لیے اُسے اپنی بیوی بنا کر رکھنا ممکن نظر

نہیں آتا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ شاہدہ نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور وہ وقت بھی آگیا جب شادی کے ایک سال کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بیٹا عطا کیا۔ اس دوران شاہدہ کی ماں کی مسلسل کوشش رہی کہ اس کی بیٹی کا گھر بسنے نہ پائے۔ اُس نے بیٹی کی رخصتی کے بعد اپنے خاوند سے کہا تھا۔ "دیکھتی ہوں کس طرح اس کا گھر بستا ہے۔"

"خدا کا خوف کرو اور ایسی باتیں مُنہ سے نہ نکالو۔" شاہدہ کے والد نے کہا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ کسی شریف گھرانے کی بہو بن کر جا رہی ہے۔ تم نے اسے بازاری مال بنا کر رکھ دیا تھا۔

جس دفتر میں انور کام کرتا تھا وہاں کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں چلتا تھا لیکن انور اور اُس کے سُسر کے متعلق ہر شخص قسم کھانے کو تیار تھا کہ یہ لوگ بالکل حرام نہیں کھاتے۔ شاہدہ کا دماغ اُس کی ماں نے خراب کر رکھا تھا۔ اُسے بچپن ہی سے اُس نے اونچے اونچے محلوں میں بسنے کے خواب دکھانے شروع کر دیے تھے اور اُس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اُس کا جنم کسی معمولی گھر میں بیاہنے کے لیے نہیں ہوا۔ وہ کسی راجے مہاراجے کی بیوی بن کر جائے گی۔ اُس نے ماں کی مرضی کے خلاف شادی تو کر لی تھی۔ لیکن اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے پکڑ کر لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ کہاں وہ روز روز کی دعوتیں اور سیر سپاٹے، کہاں یہ چولہا جھونکنا۔ شاہدہ کے ذہن میں یہی بات سمانے لگی کہ بس وہ بھی اپنی ماں کی طرح ساری زندگی بچے جننے اور خاوند کی خدمت کرتے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزار دے گی۔ اُس نے پہلے پہل تو انور کو دوسرے لوگوں کی طرح رشوت لینے اور مزے کی زندگی گزارنے پر اُکسایا۔ لیکن جب دیکھا کہ اس پر ان باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوتا تو بالآخر وہ یہ سب کچھ کہنے سے باز آگئی۔ اب اُس پر ہر وقت خوامخواہ کی ایک جھنجھلاہٹ سوار رہتی تھی۔

ٹھیکیدار تاج دین نے انور کو اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ پہلے پہل تو اُس نے انور کو رشوت دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو اُس نے براہِ راست افسروں سے معاملہ گانٹھ لیا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں انور کی ایمانداری کی بہت عزت کرتا تھا اور دونوں کے درمیان ایک طرح کے دوستانہ مراسم بھی قائم تھے۔ تاج دین کا آنا جانا انور کے گھر میں شادی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ شادی کے بعد تو اس کی آمد و رفت اور بھی بڑھ گئی اور اس کی وجہ تھی شاہدہ۔

تاج دین بھی آخر گوشت پوست کا انسان تھا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح شاہدہ کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جب بھی ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ انور کے ہاں جاتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ پھل اور مٹھائی وغیرہ ضرور ساتھ لے جاتا۔ پہلے پہل تو انور نے اس بات کا بُرا منایا لیکن تاج دین کی ضد کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ تاج دین کہتا تھا کہ میں تمہارے پاس ٹھیکیدار بن کر نہیں ایک بھائی اور دوست بن کر آتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی سگا بھائی ہوتا تو کیا تم اس کی لائی ہوئی شے قبول نہ کرتے؟

یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں سے اُس نے انور کو مطمئن رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ انور اور اس کی ماں سے جسے اس نے اپنی ماں بنا رکھا تھا، ملنے آیا کرتا تھا پھر آہستہ آہستہ نوبت آگئی کہ وہ صرف اور صرف شاہدہ کے لیے وہاں آنے لگا۔ اُس نے چکنی چپڑی باتوں اور تحفے تحائف کے ذریعے شاہدہ کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ انور اور شاہدہ کو اپنے ساتھ کار میں سیر کرانے لے جاتا اور انور کے نہ نہ کرنے کے باوجود نہیں شاپنگ بھی کروا دیتا۔ انور کو نہ کرنے کا موقعہ بھی کم نصیب ہوتا۔ اُس کی بیوی فوراً شکریہ کہہ کر تحفہ وصول کر لیتی۔ ایک روز انور نے شاہدہ سے دبی زبان میں کہا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تاج دین تمہیں شاپنگ کروائے۔

اُس کے مُنہ سے یہ بات نکلنے کی دیر تھی کہ شاہدہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ "تمہیں خود

کچھ لا کر دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر خدا نے کوئی خوشی کا سامان پیدا کیا ہے تو اُس میں بھی کیڑے نکالنے لگے ہو۔ تم میرے اور تاج دین کے تعلقات پر حسد کر رہے ہو۔ وہ تم سے زیادہ نیک اور مخلص ہے۔"

اور اُس نے انور کو وہ وہ سنائیں کہ بے چارہ شریف آدمی کان پکڑ کر رہ گیا۔

آہستہ آہستہ وہ وقت بھی آیا۔ جب تاج دین نے موقعہ ملتے ہی شاہدہ کو ذو معنی فقرے بھی کہنے شروع کر دیے۔ پھر وہ کبھی کبھی انور کی غیر موجودگی میں گھر آنے لگا۔ شاہدہ کی ساس نے ایک دفعہ جب بہو کو اس بات سے منع کیا کہ وہ اپنے خاوند کی غیر موجودگی میں غیر مردوں سے نہ ملا کرے تو اُسے شاہدہ نے ایسی بے نقط سنائیں کہ آئندہ کے لیے بوڑھی عورت نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ تاج دین پہلے تو اُسے "بھابی، بھابی" کہا کرتا تھا۔ پھر اُس نے انور کی غیر موجودگی میں اُسے شاہدہ کہنا شروع کر دیا۔

تاج دین آہستہ آہستہ اُس کے ذہن میں زہر گھولنے لگا۔ اُس نے شاہدہ کو احساس دلانا شروع کر دیا کہ انور اس کے قابل نہیں اسے تو کسی محل میں رہنا چاہیے، کسی بادشاہ کی ملکہ بن کر۔ شاہدہ کے ذہن نے پہلی مرتبہ اپنے مطلب کی باتیں سنی تھیں۔ وہ فوراً پھسل گئی۔ دونوں میں ایک ذہنی رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس کہانی کا راوی ملانے والوں نے مجھے ایک عجیب بات بتائی کہ اُن کے تعلقات جسمانی نہیں تھے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ تاج دین کے دل میں محبت تھی۔ مگر شاہدہ کو تاج دین کے روپ میں وہ آدمی مل گیا تھا جو اُسے شہزادی بنا کر رکھے گا۔ ماں نے اُسے یہ خواب دکھائے تھے۔ جو انور نے تباہ کر دیے تھے۔ تاج دین نے اُسے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک کوٹھی بنوا کر اُس کے نام لگوانے کو تیار ہے۔ وہ شاہدہ کی خاطر پہلی بیوی کو طلاق دینے پر راضی ہو گیا۔ دونوں کی دوستی رنگ لائی اور ایک روز شاہدہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ اُس نے تاج دین سے کہہ دیا کہ وہ انور کو چھوڑ کر دوسری بننے کے لیے تیار ہے۔ لیکن تھی بہرحال چالاک ماں کی بیٹی پہلے اُس

لے تاج دین سے اپنے مستقبل کی ضمانت طلب کی۔

تاج دین نے فوراً اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ایک روز اپنی کوٹھی کاغذات بھی اُس کے حوالے کر دیے۔ اب شاہدہ کو اُس کی بات پر مکمل یقین اُس روز جب شاہدہ نے انور سے طلاق دینے کے لیے کہا تو وہ بھونچ رہ گیا۔

"شاہدہ! پاگل نہ بنو۔" انور نے اُسے کہا۔ "مَیں جانتا ہوں تم اپنی ماں اور تاج دین کے ورغلانے میں آگئی ہو۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔"

"مَیں نے سب سوچ سمجھ لیا ہے۔" شاہدہ نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا "مَیں ہمیشہ کے لیے اس جہنم کا ایندھن بننے کو تیار نہیں۔"

انور نے پھر بھی اس کی بات پر کان نہ دھرے تو شاہدہ نے مرد کی کمزوری پر اُس کی غیرت پر حملہ کیا اور بولی ـــــ "انور! یہ بچہ تمہارا نہیں۔ یہ تاج دین کا بچہ ہے۔"

انور نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اُس نے شاہدہ سے کہا۔ "جو عورت اتنی گر سکتی ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کی کہلانے کا حق ہی نہیں رکھتی۔ اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ لیکن یاد رکھو اس بچے کو بالکل بھول جانا اور کبھی اس کا نام بھی بھولے سے زبان پر نہ لانا ... تمہیں پرسوں تک باقاعدہ طلاق مل جائے گی ... میں جانتا ہوں تم طلاق لینے لیے یہ جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ بچہ میرا ہے۔ بچہ ایک سلگ ہو گیا ہے۔ کسی کو دکھا لو۔ یہ بچہ میرا ہے۔"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اُس وقت شاہدہ کے دل و دماغ میں بٹھیکا تاج دین کے دکھائے ہوئے خوابوں کے سوا اور کوئی شے سما ہی نہیں رہی تھی۔ ا بیٹے تک کو بھول چکی تھی۔ اُس نے اگلی بات کرنے سے پہلے اپنے کپڑے ایک میں رکھے اور جانے کو تیار ہو گئی۔ انور کی بوڑھی ماں نے اُس کی منتیں کیں۔ ہاتھ لیکن شاہدہ کا دل نہ پسیجا۔ وہ روتے بلکتے بچے کو چھوڑ کر چلی گئی اور سیدھی گھر

اس کی حمایتی ماں اُس کی منتظر تھی۔ شاہدہ نے تاج دین کا تعارف اپنی ماں سے کروا رکھا تھا اور منصوبہ تینوں نے مل کر طے کیا تھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ وہ بالکل نہ گھبرائے اور اپنی بات پر پکی رہے۔

شام کو جب شاہدہ کا والد کام سے واپس آیا تو اُس کی ماں نے اپنی طرف سے ٹسوے بہاتے ہوئے انور کے ظلم و ستم کی جعلی کہانی اُسے سنا دی اور بتایا کہ انور نے اُس کی بیٹی کو طلاق دے کر گھر سے دھکے دے کر نکال دیا ہے۔ اُس کے باپ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ ماں کے چپ ہوتے ہی شاہدہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور باپ پر یہ ظاہر کیا۔ جیسے وہ وہاں سے بمشکل جان بچا کر بھاگی ہے۔ باپ سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اُس نے خود اصلیت جاننے کے لیے انور کے پاس جانا ضروری سمجھا۔ وہاں جا کر جب اُسے صحیح حالات کا علم ہوا تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر انور سے درخواست کی کہ وہ اس کی بیٹی کو معاف کر دے۔

"چاچا جان!" انور نے کہا: "بے شک یہ بچہ میرا ہے اور اس نے محض مجھے طیش دلانے کے لیے کہا ہے کہ یہ تاج دین کی اولاد ہے۔ لیکن ایسی گھٹیا ذہنیت کی عورت کو مَیں اپنی بیوی نہیں مان سکتا۔"

اس کے بعد اُس کی ماں نے شاہدہ کے باپ کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ انور نے اُسے کہا کہ اب بھی اگر وہ اپنی بیٹی کو ضمانت کر لیں تو مَیں اُسے معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مَیں کل اس کا انتظار کروں گا۔ اگر وہ کل نہ آئی تو پرسوں طلاق بھیج دوں گا۔ باپ پُر اُمید ہو کر گھر پہنچا تو اس کی بیوی اور بیٹی غائب تھیں۔ دونوں ماں بیٹی کو ٹھیکیدار تاج دین اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیر کروانے لے گیا تھا اور گھر میں بچے بھوکے باپ کی راہ دیکھ رہے تھے اس نے آج تک جس روگ کو اندر ہی اندر پالا تھا۔ اب وہ پھٹ گیا۔ اس حادثے نے تو اُس پر بجلی گرا دی اور شاہدہ کے باپ پر پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ محلے دار اُسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔

ڈاکٹر نے شاہدہ کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ اگر ایک دو اور اسی شدید نوعیت کے دورے اسے پڑے تو وہ مر جائے گا۔ لیکن ماں کی آنکھوں پر تو ہوس کی پٹی بندھی

تھی ۔اُس نے اپنی بیٹی کو حوصلہ دیے رکھا۔ بلکہ اُس کی زبانی یہ بھی کہلوا دیا کہ اس شوہر تو مردانہ صفات سے بالکل محروم ہے۔جب یہ بات انور تک پہنچی تو اس فوراً طلاق لکھ کر بھیج دی۔

ایامِ عدت تو ایک شرعی پابندی تھی۔جس روز ہی پوری ہوئی شاہدہ نے تاج سے نکاح پڑھا لیا۔ باپ نے محض بچوں کی خاطر اس گھر میں رہنا قبول کیا۔اُس نے لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر میں مر جاؤں تو میری بیوی اور بیٹی کو میرے جنازے کو بھی ہاتھ نہ لگانے دینا۔

تاج دین نے جو کہا پورا کر دکھایا۔اُس نے نہ صرف ایک کوٹھی شاہدہ کے نام کر دی بلکہ وہ ہنی مون منانے کے لیے اُسے مری اور سوات بھی لے گیا۔اس نے شاہدہ کو واقعی ایک شہزادی بنا کر رکھا تھا۔لیکن اُس نے سہاگ کی پہلی رات ہی شاہدہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اُس سے بچہ پیدا نہیں ہونے دے گا۔

"مجھے تمہارے سراپے سے عشق ہے شاہدہ!" اُس نے کہا۔"میں نہیں چاہتا کہ بچے پیدا کرنے سے تمہارا جسم بے ڈھنگا ہو جائے۔ میں تمہیں اپنے متعلق بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔جس طرح تمہیں روپے پیسے اور عیش و عشرت سے پیار ہے۔اسی طرح مجھے اپنے رومانوں سے عشق ہے۔میں رومان پسند انسان ہوں۔تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔میں تمہیں بڑی لمبی عمر تک جوان رکھوں گا۔بچہ پیدا نہیں ہونے دوں گا، ورنہ تمہارا حسن اور میرا من مرجھا جائے گا۔"

شاہدہ تو خود بھی مستقبل کے ایسے ہی سنہرے خوابوں میں کھوئی رہتی تھی۔اُس کے لاشعور میں وہی شاہدہ گھوم رہی تھی۔جس کا دماغ اُس کی ماں نے اُس کے حسن کی تعریفیں کر کر کے آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔اُس نے تاج دین کے خیال سے مکمل اتفاق کیا کہ وہ پہلے روز سے ہی خاندانی منصوبہ بندی کے پابند ہو گئے۔

انور نے اپنی ماں کے بے حد مجبور کرنے پر اپنے بچے کی پرورش کی خاطر دوسری شادی کر لی۔ خدا نے اس مرتبہ اُسے خوش شکل ہی نہیں نیک سیرت بیوی بھی عطا کی تھی اُس نے ننھے وحید کی پرورش اپنی سگی اولاد کی طرح کی اور کبھی اپنی اولاد اور اُس

میں فرق روا نہ رکھا۔اس نے خلوص اور خدمت سے انور کے تمام غم بھلا دیے اور اُس کی ماں کو بالکل ماں کی طرح جانا۔

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا اور آٹھ دس سال گزرتے پتہ ہی نہ چلا۔اس دوران شاہدہ کو اُس کے خاوند نے زندگی کی ہر آسائش بہم پہنچائی لیکن کبھی کبھی ایک بے نام سی تلاش شاہدہ کو بے چین کر دیتی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگتا۔ جیسے اُس کے جسم سے کوئی ٹکڑا الگ ہو چکا تھا۔ پھر اسے یہ کمی شدت سے ڈسنے لگی۔ وہ ابھی تک اس جذبے کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے تاج دین اُسے اچھا تو لگتا ہے لیکن پہلی سی بات نہیں۔پھر کیا ہے؟ شاہدہ نہ جان سکی۔

تاج دین حیران تھا کہ شاہدہ نے ماحول اور زندگی کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی نظر آنے لگی۔ اس کے رویے میں یہ تبدیلی بظاہر آہستہ آہستہ لیکن بڑی شدت سے وقوع پذیر ہو رہی تھی۔اب یوں ہونے لگا کہ تاج دین اُسے فلم وغیرہ دیکھنے کے لیے لے جانا چاہتا۔لیکن عین وقت پر وہ کوئی بہانہ کر کے انکار کر دیتی۔کبھی اُس کے سر میں درد ہونے لگتا اور کبھی اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔

ایک روز جب تاج دین بڑی چاہت سے اُس کے لیے ایک بڑی خوبصورت ساڑھی لے کر آیا اور اُسے کہا کہ وہ ساڑھی پہن کر اس کے ساتھ ایک شادی میں شرکت نے چلے تو شاہدہ نے وہ ساڑھی ڈبے سمیت پرے پھینک دی اور خود بے دم سی ہو کر صوفے پر گر پڑی۔

"خیریت تو ہے شاہدہ!" کیا بات ہے؟ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟" ٹھیکیدار تاج دین نے اُس کے نزدیک بیٹھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

جواب میں شاہدہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔تاج دین حیرت سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا۔اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شاہدہ کو کیسے تسلی دے۔اُس کے دل کی بات کیسے سمجھے۔اُس نے شاہدہ سے کہا کہ وہ کوئی فرمائش کرے وہ دنیا کے کسی بھی ملک سے وہ چیز منگوا کر حاضر کرے گا۔

"میری فرمائش پوری کروگے؟" شاہدہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغ
بولی۔ "تم جو ساڑھی لائے ہو وہ مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ لیکن اب جی چا
ہے کہ میرے کپڑوں کی بجائے تم چھوٹے چھوٹے فراک، ننھے ننھے بوٹ
کھلونے لایا کرو۔"

"وہ کس لیے؟" تاج دین نے پوچھا۔

"اپنے بچے کے لیے۔" شاہدہ نے کہا۔ "میں یہی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ میں
سمجھی ہوں کہ بچے کے بغیر عورت نامکمل ہے۔ یہ عورت کے جسم کی اور اس کی فطرت کی
ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر عورت زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے
بیٹے سے ملوا دو۔ وہ اب گیارہ سال کا ہو گیا ہے۔"

شاہدہ کی اس بات نے ٹھیکیدار کو چکرا کر رکھ دیا۔ اس نے شاہدہ سے کہا کہ
یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ نہ اس کا بیٹا اسے ماں تسلیم کرے گا نہ ہی انور اسے ملنے
کی اجازت دے گا۔

تاج دین نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن وہ شاہدہ کو منع نہ کر سکا۔ اس کا اب
معمول ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے وحید کو چوری چھپے سکول سے آتے جاتے دیکھنے لگی
وہ اکیلی اس کی چھٹی کے وقت سکول کے نزدیک پہنچ جاتی اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر
بے بسی سے واپس لوٹ آتی۔ اس نے اپنے خاندان کی تقریبات میں اسے دیکھ
رکھا تھا۔ لیکن انور نے اس بات کی خاص احتیاط رکھی تھی کہ کبھی اس کا اور وحید کا
براہِ راست سامنا نہ ہو سکے۔ اس نے جلد ہی پتہ چلا لیا کہ اس کا بیٹا کہاں پڑھتا ہے
اور اس کے آنے جانے کے اوقات کیا ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ آتی اور روتی
شاہدہ کا دل چاہتا کہ دوڑ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔ لیکن وہ دل مسوس
کر رہ جاتی۔ کیونکہ کوئی قانونی یا اخلاقی ضابطہ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں
دیتا تھا۔ اس نے خود اپنے بیٹے کو دھتکارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے
خاوند سے تقاضا شروع کر دیا کہ اب وہ اولاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تاج دین
کو اس کی حرکات کا علم تھا۔ لیکن وہ اسے وحید کو دیکھنے سے روک نہیں سکتا تھا

اس نے ماہرینِ نفسیات سے شاہدہ کا معائنہ کروایا تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ اپنی بیوی
کو پانا چاہتا ہے تو اس کے بطن سے بچہ پیدا کرے۔

تاج دین نے شاہدہ کو اُن مصنوعی طریقوں سے آزاد کر دیا جو وہ خاندانی منصوبہ
بندی کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن دو تین سال تک اُن کی مراد بر نہ آئی۔
انوں کی تشویش بڑھی تو انہوں نے ماہر ڈاکٹروں کا رُخ کیا۔ جنہوں نے شاہدہ کے
ل معائنے کے بعد تاج دین کو بتایا کہ دس بارہ سال تک مصنوعی طریقوں اور برتھ
کنٹرول کی گولیوں کے مسلسل استعمال نے اُس کی بیوی کا تولیدی نظام درہم برہم
کر دیا ہے اور ان گولیوں کا ذہن پر بھی اثر ہے۔ اتنی لمبی خاندانی منصوبہ بندی کا
کوئی ڈاکٹر بھی مشورہ نہیں دیتا۔

ٹھیکیدار تاج دین کی ہدایت پر ڈاکٹروں نے اس بات کا علم شاہدہ کو نہ ہونے
دیا۔ وہ امیر آدمی تھا۔ اُس نے شاہدہ کو بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لیکن مقصد
میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ایک ایک کر کے ملک کے قریباً سب ہی ڈاکٹروں نے
معذوری ظاہر کر دی۔

شاہدہ اپنے بیٹے کو چھپ چھپ کر دیکھتی رہی اور وہ جوان ہو گیا۔ اب
شاہدہ کے سارے بل نکل چکے تھے، دندان مر گئے تھے اور اُسے اب احساس
ہوا تھا کہ اسے اس حال تک ماں نے پہنچایا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کو دشمن سمجھنے
لگی اور اُس سے قطع تعلق کر لیا۔

ایک روز شاہدہ کو اطلاع ملی کہ اُس کے بیٹے کی نسبت کسی جگہ طے ہو گئی
ہے۔ اس خبر نے اسے تڑپا کر رکھ دیا کہ اتنے اہم موقع پر بھی وہ اپنے بیٹے
سے دُور ہے۔ اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اپنے بیٹے کو ملنے کا فیصلہ
کر لیا اور ایک جگہ اُسے جا ملی۔

"وحید!" اُس نے بے قراری سے بانہیں پھیلا دیں، "تم میرے بیٹے ہو
میں تمہاری ماں ہوں۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میں نے تمہیں کھو کر بڑے دُکھ

پائے ہیں بیٹا ؟" وہ نجانے کیا کیا کہتی رہی۔ لیکن وحید اپنی جگہ پتھر کا بُت بن کر کھڑا رہا۔

"مَیں تمہیں بہت دیر سے جانتا ہوں۔" نوجوان وحید نے حقارت سے کہا "لیکن کسی کو پیدا کر دینے ہی سے کوئی عورت اُس کی ماں نہیں بن جاتی۔ میری ماں وہ ہے۔ جس نے مجھے پالا پوسا اور کبھی تمہاری کمی کا احساس نہ ہونے دیا.... جاؤ چلی جاؤ۔ تمہیں دولت اور عیش و عشرت کی ضرورت تھی وہ تمہیں مل گیا۔ آئندہ مجھے کبھی ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ مَیں تو اُس وقت بھی تمہارا ہی بیٹا تھا۔ جب تم مجھے پھینک کر چلی گئی تھیں اور تم نے مجھے حرامی قرار دیا تھا۔ مجھے میرے ابّا نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

شاہدہ کی بانہیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں اور وحید اُسے ٹھکرا کر چلا گیا۔ اس حادثے نے تو اُسے مخبوط الحواس کر دیا۔ وہ مریض بن کر رہ گئی۔ ٹھیکیدار تاج دین نے اُس کے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب وہ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گیا تو اُس نے پیروں، فقیروں اور خانقاہوں کا رُخ کیا کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے بتایا کہ شاہدہ کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس سے کوئی بچّہ پیدا کیا جائے۔

جس مزار پر وہ مجھے ملی تھی۔ وہاں بھی اُس کا خاوند اُسے لے کر آیا تھا لیکن اچانک اس کا دماغ پھر گیا۔ اُس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اب وہ یہاں بولائی پھرتی تھی اور ہر آنے جانے والے کو اولاد ملنے کی خوشخبری دے رہی تھی۔ اس کی کہانی سنانے والے نے مجھے آخر میں کہا۔ "بابو جی! اس کے خاوند نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ وہ یہاں بھی مسلسل آتا رہا۔ لیکن پچھلے دو سال سے وہ نہیں آیا۔ یہ پگلی یہیں جھاڑو دیتی رہتی ہے.... آخر کوئی پاگل عورت کا خاوند کب تک بن کر رہ سکتا ہے۔"

چرسی

گزشتہ ماہ ایک صاحب ہمارے دفتر میں آئے میرے اندازے کے مطابق اُن کی عمر ۶۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ایک سچّی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ یہ میری اپنی کہانی ہے۔ جسے آپ اپنے معاشرے کی کہانی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مَیں خود پڑھا لکھا ہوں۔ یہ کہانی کئی بار لکھی اور پھاڑ کر پھینکی ہے۔ کیونکہ کہانی لکھنا ایک فن ہے۔ جو آپ ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔

"میں ایک ضروری بات آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "یہ کہانی سنانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم بوڑھے اپنی نوجوان نسل کو گمراہ، بداخلاق اور نجانے کیا کیا کہتے ہیں۔ لیکن جو تجربہ مجھے ہوا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری اُبھرتی ہوئی نوجوان نسل میں بڑے اچھے اوصاف اور کردار کی بلندی موجود ہے۔ میں اگر فلاسفر ہوتا تو فلسفے اور نفسیات کی زبان میں بات کرتا لیکن میں متوسط طبقے کا عام سا انسان ہوں۔ مجھ ایسے لوگ کہانیوں اور مثالوں سے اپنا مقصد بیان کیا کرتے ہیں۔"

اُنہوں نے کچھ اور تمہیدی باتیں بھی کیں جن سے متاثر ہو کر مَیں نے انہیں کہا کہ وہ کہانی سنائیں۔ میری حوصلہ افزائی سے انہوں نے جو کہانی سنائی۔ وہ مَیں انہی کی زبان میں پیش کرتا ہوں۔

مَیں ایسے ہی ایک محلے کا رہنے والا ہوں۔ جسے آپ چار دیواری کی دُنیا

کہتے ہیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ محلے کے لڑکے گلیوں کے چوراستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں یا تھڑوں پر بیٹھ جاتے ہیں یا پان سگریٹ والے کی دکان کے آگے رکھے ہوئے بنچوں پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ یہ اُن کا شغل ہے کہ وہ قریب سے گزرنے والی خواتین کو گھور گھور کر بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اکیلی دوکیلی خاتون کے ساتھ چھیڑ خانی بھی کر گزرتے ہیں۔ یہ فلموں اور فلمی گیتوں کا اثر ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں کوئی قومی نصب العین نہیں دیا گیا۔ ہم بڑوں نے اپنے معاشرے کی اقدار کو ختم کر ڈالا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جو آپ خود بہتر سمجھتے ہیں۔

مجھ میں ایک خرابی ہے۔ جسے مَیں خوبی سمجھتا ہوں۔ مَیں اخلاق اور کردار کے معاملے میں بہت زیادہ حسّاس ہوں۔ جب کوئی لڑکا فلمی گانے گاتا ہُوا گلی میں سے گزرتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ یہی ارادہ کرتا ہوں کہ قتل کر دوں۔ کئی مرتبہ اس قسم کے لڑکوں کے ساتھ گرما گرمی بھی ہوئی ہے۔

نوجوان تو سبھی ایک جیسے ہیں۔ میرے محلّے کے یہ لڑکے تقریباً روزانہ ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے اور کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے لیکن ایک نوجوان جس کا نام امجد ہے، ہر وقت ایک مقام پر کھڑا رہتا یا بلا مقصد رُک کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگتا۔

مَیں نے پہلے پہل اُسے کچھ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ دیر تک میرے گھر کے بالکل سامنے رکنے لگا۔ میری ایک بیٹی جوان ہے۔ اُن دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ایک روز بیٹی نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکا دو تین مرتبہ سکول سے واپسی پر اُس کا پیچھا کر چکا ہے۔

اگلے روز جب یہ لڑکا میرے گھر کے سامنے آکر رُکا تو اُسے معلوم نہ تھا کہ مَیں اُس کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا ہے کہ مجھ میں غیرت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے اور یہاں تو معاملہ بھی میری اپنی ہی بیٹی کا تھا۔ مَیں نے

اُس لڑکے کے لمبے لمبے بالوں کو مٹھی میں لے کر زور سے جھنجھوڑا اور اُسے کہا کہ آئندہ وہ یہاں رکا یا گلی میں بلا مقصد کھڑا نظر آیا تو میں اُس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ لڑکا میرے ساتھ بدتمیزی پر اُتر آیا۔ مَیں نے اُسے تھپڑ رسید کر دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ جس طرح ہمارے نوجوانوں کا شغل تاک جھانک کرنا اور بیہودہ فلمی گانوں سے دل بہلانا ہے۔ اسی طرح ہماری چار دیواری کی دُنیا کے بڑوں کا شغل یہ ہے کہ دو آدمی یا دو خاندانوں میں ٹھن جائے تو وہ صلح صفائی کروانے کے بجائے جلتی پر آگ ڈالتے اور تماشہ دیکھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ محلے کے آدمی میرا ساتھ دیتے۔ یا مجھ سے ایک لڑکے کو چھڑوا کر صلح صفائی کروا دیتے، کسی نے امجد کے گھر والوں کو اطلاع کر دی کہ فقیر حسین تمہارے لڑکے کو مار پیٹ رہا ہے

مَیں نے لڑکے کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ وہاں سے جا رہا تھا کہ اُس کا باپ اور دو بھائی للکارتے ہوئے آئے اور بغیر پوچھے کہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ بدقسمتی سے میرے دروازے کے اندر لوہے کے پائپ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ تین آدمیوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہو اور ڈر کر پیچھے ہٹ جائیں۔ مَیں نے پائپ کا ٹکڑا پکڑ لیا۔ امجد کا بڑا بھائی سب سے آگے تھا۔ اُس نے اینٹ اٹھالی۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لیے پائپ اس طرح گھمایا کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جائے۔ لیکن وہ تیزی سے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اس لیے فوراً رک نہ سکا۔ میرا گھمایا ہوا پائپ اُس کے سر میں لگا۔ یہ بڑی سخت ضرب تھی۔ وہ چکرا کر گرا اور اُس کے سر سے خون بہنے لگا۔

لڑائی اس پر ختم ہو گئی اور وہ لوگ تھانے جا پہنچے۔ مجھے محلے داروں نے کہا کہ میں بھی تھانے جاؤں اور رپورٹ کروں کہ اُن کے لڑکے نے میرے دروازے پر آکر مجھ پر حملہ کیا ہے۔ مَیں ان تماشائیوں کا مشورہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ میری بیوی اور بیٹی مجھے اندر لے گئیں۔ مَیں کچھ خوش بھی تھا کہ مَیں نے بدکردار آدمی کو سزا دی ہے اور اب یہ لڑکا کم از کم میرے گھر کے سامنے اس

طرح بیہودگی کا مظاہرہ کرتے نہیں گزرے گا۔ لیکن میری خوشی ایک گھنٹے سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ پولیس کے ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے پُرزور مشورہ دیا کہ مَیں تھانیدار کو کچھ دے دلا کر مضروب پارٹی سے سمجھوتہ کر لوں۔ کانسٹیبل نے یہ بھی کہا کہ کچھ میرا چائے پانی بھی کر دیں تو مَیں چوہدری صاحب کو منا لوں گا۔ چوہدری صاحب ہمارے علاقے کے تھانیدار تھے۔ مَیں نے کانسٹیبل کو ڈانٹ دیا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ کیا تھی۔

کانسٹیبل ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ "بھولے بادشاہو! بات وہ سچی ہوتی ہے جو سب سے پہلے تھانے میں پہنچتی ہے اور وہ بات تو بہت ہی سچی ہوتی ہے جس کے ساتھ سرخ رنگ کے چار پانچ نوٹ نتھی ہوتے ہیں۔" کانسٹیبل نے کہا۔ "آپ نے اگر اسی طرح چوہدری صاحب کے ساتھ بھی اکڑ کر بات کی تو سمجھ لیں کہ وہ کوئی معمولی سی دفعہ نہیں لگائیں گے۔ وہ ۳۰۷ کا پرچہ کریں گے اگر آپ کو معلوم نہیں کہ ۳۰۷ کیا ہوتی ہے تو مجھ سے سن لیں۔ اسی کو کہتے ہیں کہ ارادۂ قتل یعنی آپ نے ایک آدمی کو اپنی طرف سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن خدا نے اُسے بچا لیا۔ یہ دفعہ ناقابلِ ضمانت ہے۔"

مَیں پھر بھی ڈٹا رہا۔ مجھے پورا بھروسہ تھا کہ قانون میری بات بھی سُنے گا۔ لیکن جناب میری کسی نے نہ سُنی۔ مجھے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شام کو تھانیدار نے مجھے بہت ڈرایا۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مضروب کی کھوپڑی ٹوٹ گئی ہے۔ تھانیدار حوالات کے دروازے سے ہٹا تو تھانے کا محرّر آ گیا اُس نے میرے کان میں کہا کہ کیوں اپنے بچوں کی زندگی تباہ کرتے ہو۔ کہو تو مَیں چوہدری صاحب سے بات کروں۔ ابھی پرچہ نہیں ہوا۔ دو چار سو کی بات کیا ہے آپ کی یہ رات حوالات میں نہیں گزرے گی۔

مَیں دین و ایمان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ مَیں نے محرر سے کہا کہ

تم لوگوں کے ساتھ مَیں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک نہیں دس پرچے لکھو۔ مَیں عدالت میں اپنا بیان دوں گا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ جن کے بیانات ضروری تھے۔ وہ تھانے میں لیے جا رہے تھے۔ یہ سب کے سب میرے خلاف تھے۔ تین چار روز بعد مجھے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ میری بدقسمتی اور مجبوری یہ تھی کہ مَیں پٹھانکوٹ کا مہاجر ہوں۔ میرا کل خاندان میری بیوی اور تین بچیاں ہیں جن میں ایک جوان ہے۔ میرے تمام عزیز اور قریبی رشتہ دار ۱۹۴۷ء میں شہید کر دیے گئے تھے۔ مَیں جیل میں بند ہو گیا تو میرے بیوی بچیوں کی دیکھ بھال کرنے اور انہیں دو وقت روٹی کھلانے والا بھی کوئی نہ رہا۔ میرا چالان زیرِ دفعہ ۳۰۷ ہوا تھا۔ اس لیے میری ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ میری بیوی نے اپنے زیورات بیچ کر اور محلے کے ایک بزرگ کو ساتھ لے کر وکیل کر لیا تھا۔

عدالت میں تمام گواہیاں میرے خلاف گزریں۔ محلّے کے دو آدمی بھی میرے خلاف گواہی دینے آئے۔ جنہیں میں شریف اور مخلص سمجھتا تھا۔ میری صفائی بڑی کمزور تھی۔ لیکن میرے وکیل نے اتنی عقلمندی سے مخالف گواہوں پر جرح کی کہ یہ ثابت ہو گیا کہ مضروب پارٹی حملہ آور تھی۔ اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جو دفعہ مجھ پر لگائی گئی تھی اس کی مجھے انتہائی سزا نہ دی گئی۔ عدالت نے مجھے تین سال سزائے قید بامشقت دے دی اور رعایت یہ تھی کہ میں جتنا عرصہ جیل میں رہا ہوں۔ وہ سزا میں شامل کیا جائے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری سزا تین کے بجائے دو سال رہ گئی۔

میری بیوی نے سلائی مشین نکال لی اور لوگوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے۔ میری بڑی بیٹی نے جو مقدمے کے دوران میٹرک پاس کر چکی تھی۔ پانچ سات بچوں کی ٹیوشن رکھ لی۔ اس طرح ماں بیٹی نے ہانڈی روٹی کا مسئلہ حل کر لیا۔ دوسرے محلّے کے ایک میرے دوست نے یہ کرم کیا کہ دن میں ایک آدھ مرتبہ میرے گھر آ کر میرے بیوی بچوں کو دیکھ جاتا۔

بیوی اور میری بچیاں جیل میں مجھ سے ملنے آتیں۔ میں سی کلاس میں تھا۔ اس

لیے انہیں خاصا پریشان اور خراب ہونا پڑتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ نہ آیا کریں یا کبھی تیسرے چوتھے مہینے آجایا کریں۔

ایک روز میرا یہ دوست مجھے ملنے آیا۔ وہ اکثر آتا رہتا تھا۔ اُس نے جیل کے کسی افسر سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ اس لیے وہ اندر آجاتا تھا اور ہم الگ بیٹھ کر باتیں کر لیتے تھے۔ اُس روز اُس نے مجھے ایک ایسی اطلاع دی، جس نے میرے خون کو کھولا دیا۔ میں اتنا بھڑکا کہ بار بار یہی ارادہ ذہن میں آتا کہ جیل سے فرار کی کوشش کروں۔ یا اُس اُونچی دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنے آپ کو ختم کر لوں۔

اطلاع یہ تھی کہ ایک دو روز پہلے میرا دوست رات دس بجے کے لگ بھگ میری بیوی اور بچیوں کو دیکھنے میرے گھر گیا تو میرے گھر سے امجد برآمد ہوا اور اُس کو دیکھ کر آگے گزر گیا۔ میری بیوی نے میرے اس دوست سے پردہ ہٹا دیا۔ میرے دوست نے امجد کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اُس نے کہا کہ کہیں یہ گھر کی عورتوں کو دھمکانے ڈرانے تو نہیں آتا۔ میری بیوی نے میرے دوست کو بتایا کہ یہ تین چار مرتبہ پہلے بھی آچکا ہے اور ہر بار معافی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر مصیبت آئی ہے۔ میری بیوی نے میرے دوست کو بتایا کہ امجد اور کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ میری بیوی امجد کے آنے جانے پر کچھ پریشان بھی ہے۔

اصل پریشانی تو مجھے تھی۔ میں جیل میں بند تھا اور سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ امجد کسی اچھی نیت سے میرے گھر آتا ہے۔ اگر اُس کی نیت نیک بھی تھی تو میں کیسے برداشت کرتا کہ جس نے مجھے جیل تک پہنچایا۔ وہ میرے گھر کے دروازے میں داخل ہو۔ کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا کہ میرا دوست جھوٹ بولتا ہے۔ لیکن یہ شخص جھوٹ بولنے والا نہیں تھا۔ اُسے ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ جاسوسی

کرے اور اصل بات کا پتہ لگائے۔ مجھے اپنی بیوی اور بڑی بیٹی کے کردار پر بھروسہ تھا۔ لیکن مجبوریاں انسان کو گمراہ کر ہی دیا کرتی ہیں۔

سوچتے سوچتے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کہیں ——— پڑھا تھا کہ بعض باپ اپنے بچوں پر قیدیوں جیسی پابندیاں عائد کر کے گھر کو جیل خانہ بنا دیتے ہیں۔ ایسے بچے جوان ہو کر موقعہ ملتے ہی غلط آزادی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ میں خود بڑا سخت گیر تھا۔ میں نے اپنی بیٹی کو نویں جماعت میں برقعہ پہنا دیا تھا۔ میں نے گھر والوں کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ عورت کی آواز دروازے سے باہر نہ جانے پائے۔ میں نے تو گھر کی چھت پر بھی پردے کا سخت انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن میں نے اپنی بیوی بچیوں کو کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی تھی۔ انہیں جتنی بھی شفقت دے سکتا تھا۔ وہ دی تھی۔ پھر بھی مجھے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ میری بیوی اور جوان بیٹی میری پابندیوں سے تنگ آکر میری غیر حاضری میں آزادی کا مزہ چکھ رہی ہوں۔ مجھے غصہ اس بات پر آرہا تھا کہ دشمن کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت کیوں دی گئی۔

جیل میں قیدی جلنے کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک سے ایک خیال ذہن میں آتا ہے۔ قیدی اپنا خون پیتا ہے اور صرف آنسو بہا کر رہ جاتا ہے۔ دوست کے ساتھ ملاقات میں پندرہ دن باقی تھے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ اگلی ملاقات پر مجھے وہ مکمل اور صحیح رپورٹ دے۔ یہ پندرہ دن پندرہ مہینوں جتنے لمبے ہو گئے تھے۔

پندرہ دن بعد میرا دوست یہ خبر لایا کہ امجد دوسری تیسری رات میرے گھر جاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ میری بڑی بیٹی کسی دُور کے محلے میں شام کو ٹیوشن پڑھانے بھی جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ دو تین مرتبہ جب میری بیٹی ٹیوشن پڑھا کر واپس آئی تو امجد بھی اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔

آپ خود تصوّر کریں کہ جیل میں بند ایک باپ کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میں نے

اپنے دوست سے کہا کہ اگلی ملاقات پر میری بیوی کو بھیجنا۔ میں نے اگلی ملاقات تک کے دن بڑی اذیت میں گزارے۔

بیوی آگئی۔ مَیں نے اُس سے امجد کے ساتھ تعلقات کے متعلق پوچھا۔ بیوی کے ساتھ ملاقات میں یہ دشواری تھی کہ ایک ہی جالی کے ساتھ کئی قیدی لگے ہوئے ہوتے تھے۔ سب کے رشتہ دار باہر کھڑے ہوتے اور ملاقات کا وقت بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ میرا دوست تو ایک افسر کی دوستی کی وجہ سے اندر آجاتا تھا۔ لیکن میری بیوی کو یہ سہولت میسّر نہیں تھی۔ اس قسم کی ملاقات میں بیوی مجھے کیا بتاتی۔ اُس نے اتنا ہی کہا کہ آپ دل میں کوئی وہم اور شک شبہہ نہ رکھیں۔ گھر کی عزت و آبرو بالکل محفوظ ہے۔ ہم پورے وقار کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔ جب آپ باہر آئیں گے تو آپ کو صحیح اور مکمل بات کا علم ہو جائے گا۔

مَیں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اصل اور مکمل بات کیا ہو سکتی ہے۔ مَیں نے اپنی بیوی کو خبردار کیا کہ وہ گھر میں امجد کا آنا جانا بند کر دے ورنہ میں جیل میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا اور اگر مَیں زندہ باہر آگیا تو گھر میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میری بیوی آنسو بہاتی چلی گئی۔

میرے لیے سکون اور نیند ختم ہو گئے۔ عمر پہلے ہی زیادہ تھی، اب گھر کے غم اور فکر نے جسم کو بے جان کرنا شروع کر دیا۔ میری عمر اور میرے چال چلن کو دیکھتے ہوئے مجھے جیل کے دفتر میں منشی لگا دیا گیا تھا۔ یہ ایسا کام تھا کہ مَیں تمام جیل کے اندر گھوم پھر سکتا تھا۔

بیوی کی ملاقات کے پندرہ سولہ ہی دن بعد کا واقعہ ہے۔ مَیں جیل کے اندر سے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ قیدیوں کا رجسٹر تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ چار پانچ حوالاتی جیل کے اندر آرہے ہیں۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں امجد بھی تھا۔ مَیں خوش ہوا کہ جس شخص نے مجھے اس مصیبت میں ڈالا جو میرے لیے بڑا ہی اذیت ناک

مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ جیل میں آگیا ہے۔ اُس کی صورت دیکھ کر میری خوشی ایسے غصے میں بدل گئی۔ جس کے سامنے میں بے بس ہو گیا۔ میری عقل جواب دے گئی۔ مجھ پر غصّہ غالب ہوا۔ مَیں نے رجسٹر پھینکا اور دوڑ کر امجد کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دانت ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اگر زبان درمیان میں آتی تو کٹ جاتی۔ مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ امجد کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آگئے۔ تین چار قیدیوں اور دو سنتریوں نے امجد کو میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکالا۔ مَیں نے للکار للکار کر کہا کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ سنتری مجھے گھسیٹتے اور دھکیلتے ہوئے جیل کے دفتر میں لے گئے۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ مَیں کیوں اس شخص کی جان لینا چاہتا ہوں۔ سنتریوں نے اور جیل خانے کے دو تین آدمیوں نے بتایا کہ مَیں نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ مَیں ایک حوالاتی کو جان سے مارنے لگا تھا۔ یہ کیس کورٹ میں جا سکتا تھا۔ جہاں سے مجھے ارادۂ قتل کی انتہائی سزا ملتی۔ اگر جیل والے مجھ پر رحم کرتے اور کیس نہ بناتے تو وہ مجھے اپنی سزا ضرور دیتے۔ پہلے تو وہ خود مجھے مارتے پھر افسروں کے آگے پیش کر کے مجھے بیس تیس بیدوں کی سزا دلاتے اور معمول کے مطابق قید سے جو معافی ملتی ہے۔ وہ بھی ختم کروا دیتے۔ لیکن انہوں نے میرے حالات پر ترس کھایا اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔

مَیں تین چار دن حوالاتیوں کی بیرک کی طرف نہ گیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ امجد جوں ہی میرے سامنے آیا۔ مَیں اُسے قتل کر دوں گا۔ لیکن میری ڈیوٹی ایسی تھی کہ مجھے جیل میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ ایک روز مَیں حوالاتیوں کی بیرک کی طرف گیا۔ مَیں یہی دُعا کر رہا تھا کہ امجد میرے سامنے نہ آئے۔

مجھے کسی نے آواز دی۔ گھوم کر دیکھا، امجد تیز تیز چلتا میری طرف آرہا تھا۔ مَیں رُک گیا۔

"کیوں بلایا ہے مجھے؟" مَیں نے غصّے اور نفرت سے کانپتی ہوئی آواز

میں پوچھا۔

"میں آپ کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتا ہوں۔" امجد نے میرے قریب آکر بڑی نرم آواز میں کہا۔ "لیکن میری پوری بات سن لیں۔"

"میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔"

"چاچا فقیر!" امجد نے التجا کے لہجے میں کہا: "اگر آپ نے اصل بات سنے بغیر مجھے قتل کر دیا تو میں اس دنیا کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جاؤں گا اور آپ بھی پھانسی کے تختے کے ذریعے اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔ مگر آپ کی بیوی اور بچیاں در در ٹھوکریں کھاتی پھریں گی۔ آپ کو اپنے گھر کی عزت کی قسم کہ میری بات سن لیں۔"

میں اس کی بات نہیں سننا چاہتا تھا، کیونکہ جھوٹ کے سوا اسے کہنا ہی کیا تھا۔ پھر بھی ایک خیال دل میں آگیا کہ اس کی بات سن ہی لوں۔ میں نے اسے کہا کہ جو کہنا ہے کہہ لے۔

"چاچا فقیر!" امجد نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہمارے رسم و رواج ہی ایسے ہیں۔ جن کی وجہ سے کوئی پاگل ہو سکتا ہے۔ مجھے آپ پاگل سمجھ لیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر کے سامنے رُک جایا کرتا تھا۔"

"کیا تم نے میری بیٹی کو کبھی دیکھا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ مجھے یہ توقع ہی نہ تھی کہ جس بیٹی کو میں نے برقعے اور پھر پردے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا اسے اس لڑکے نے کہیں دیکھا ہوگا۔

"نہیں چاچا!" امجد نے کہا۔ "وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ بڑے غیرت مند ہیں۔ میری بات پر آپ کو غصہ آئے گا۔ لیکن میں آپ کو صحیح بات بتانا چاہتا

ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کی بیٹی بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اس کا صرف چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دو چار مرتبہ سکول سے آتے اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔ اسے بس میں سوار ہوتے بھی دیکھا۔ میں اسی بس پر اپنے محلے تک آیا۔ لیکن آپ کی بیٹی پردے کی اتنی سخت تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہ آیا۔ میری نیت خراب نہ تھی۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں آپ کی نظر میں گناہگار ہوں۔ پھر ہماری لڑائی ہوگئی۔

"جب آپ کو جیل کی حوالات میں بند کر دیا گیا اور پتہ چلا کہ آپ کی ضمانت نہیں ہوئی تو میری جو حالت ہوئی۔ وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ میری وجہ سے گرفتار اور قید ہوئے تھے۔ میں آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش نہیں کر رہا کہ میں شریف لڑکا ہوں۔ بالکل انہی جیسا ہوں جو گلیوں میں آوارہ گردی کرتے اور گلی محلے کی لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں۔ جب آپ کے ساتھ لڑائی ہوئی اس وقت تک میں لوفر اور لفنگا تھا۔ مجھے نہ اپنی اور نہ کسی اور کی عزت کا خیال تھا۔ مجھے امید تھی کہ تھانے جا کر میرے والد اور بھائی آپ کے ساتھ راضی نامہ کر لیں گے۔ لیکن انہوں نے تھانے دار کی مٹھی گرم کر دی اور کہا کہ چوہدری صاحب ایسی دفعہ لگاؤ کہ یہ شخص دس سال سے پہلے جیل سے نہ نکل سکے گا۔ میرے بھائی جان تھوڑی دیر بعد ہوش میں آگئے تھے اور زخم کاری نہیں تھا۔ لیکن میرے ابو کہنے لگے کہ وہ ڈاکٹر کی مٹھی گرم کر کے ضرب اور زخم شدید لکھوائیں گے۔ آخر انہوں نے جو کہا تھا۔ وہ کر کے دکھا دیا۔ تھانے دار بھی ان کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ دو گواہوں کو میرے ابو نے دو، دو سو روپیہ دے کر اپنی مرضی کے بیان لکھوائے تھے۔ میں نے بھی آپ کے خلاف بیان دیا تھا اور میں نے اپنے بیان میں آدھا جھوٹ شامل کیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو میرے ابو اتنے سخت اور ضدی آدمی ہیں کہ وہ مجھے گھر سے نکال دیتے... جب کیس عدالت میں پہنچ گیا تو معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ رات کو گہری نیند سے آنکھ کھل جاتی اور یوں لگتا جیسے کسی نے

مجھے جگا دیا ہو۔ باقی رات کروٹیں بدلتے ہوئے اور سخت بے چینی کے عالم میں گزرتی۔"

مجھے اس لڑکے کی باتوں پر اتنی جلدی اعتبار نہیں کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جس لہجے میں بول رہا تھا۔ اُس لہجے میں کوئی اثر تھا۔ جو میرے دل کو موم کرتا جا رہا تھا اور مجھے اُس پر اعتبار آتا جا رہا تھا۔ خدا کی قسم، میری زبان بند ہو گئی۔

"چاچا فقیر!" وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر آپ نے مجھے کہہ دیا کہ مَیں جھوٹ بول رہا ہوں تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور یہ گناہ آپ کے سر ہو گا... مَیں نے عدالت میں بھی آپ کے خلاف جھوٹا بیان دیا۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔ مَیں اپنے آپ کو ایسا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ ٹھیک کیا ہے۔ مَیں بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے دو دوستوں کو بتایا کہ مجھے کوئی طریقہ بتائیں جو مجھے اس حالت سے نجات دلا دے۔ دوستوں نے میرے ساتھ مذاق شروع کر دیے۔

"اور جب آپ کو سزا سنائی گئی تو میرے جسم کے اندر چیونٹیاں چلنے لگیں۔ میری حالت یہ ہو گئی۔ جیسے چیونٹیاں مجھے اندر سے کاٹ رہی ہوں۔ تین چار روز بعد شام کا کھانا کھانے کے لیے میرے گھر والے اکٹھے بیٹھے تو میرے ایک بھائی نے آپ کے گھر کے متعلق کہا کہ اب اُس کی یعنی آپ کی بیوی اور بیٹیاں بھوکی مریں گی تو اسے ہم جلیبیوں کے ساتھ ٹکر لینے کا مزہ آئے گا۔ میرے گھر کے تمام مرد اس طرح ہنسے جیسے اُنہوں نے کوئی قلعہ فتح کیا ہو۔ میری حالت یہ ہوئی کہ میں کانپ گیا۔ مَیں آپ کی نظر میں آوارہ اور گناہگار ہوں لیکن تکبّر اور غرور کی یہ بات مجھے بہت بُری لگی....

"کھانے سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میری بے چینی بہت زیادہ ہو گئی۔ مَیں گھر سے نکل گیا اور سر جھکا کر ایک طرف چل پڑا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ مَیں کدھر جا رہا ہوں۔ مجھے اُس وقت پتہ چلا کہ مَیں کہاں ہوں۔ جب میں آپ کے

دروازے پر کھڑا تھا۔ میرے اندر سے کوئی طاقت اٹھی۔ جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر دروازے پر مارا۔ میری دستک پر دروازہ کھلا۔ مَیں نے نہ دیکھا کہ دروازہ کس نے کھولا ہے۔ مَیں اندر چلا گیا۔ وہ خالہ (میری بیوی) تھیں۔ ڈیوڑھی کی روشنی میں مجھے دیکھ کر وہ اتنا ڈریں کہ ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ مَیں انہیں تنہا دیکھ کر انہیں پریشان کرنے آیا ہوں...

"مَیں نے جھک کر خالہ کے پاؤں پکڑ لیے۔ تب انہوں نے کہا کہ اس گھر سے نکل جاؤ۔ ورنہ مَیں گلی میں نکل کر شور مچا دوں گی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ مَیں نے ہاتھ جوڑ کر خالہ سے کہا کہ مَیں معافی مانگنے آیا ہوں۔ فوراً بعد میں بچوں کی طرح رونے لگا۔"

اس نوجوان نے مجھے وہ ساری باتیں سنائیں جو اُس نے کہہ سُن کر میری بیوی کے دل میں اپنا اعتماد پیدا کر لیا تھا۔ میری بیوی نے اُسے بٹھایا اور کہا کہ اُس کے دل میں اُس کے (امجد کے خلاف) کوئی ناراضگی نہیں رہی۔ لیکن وہ آئندہ اس گھر میں نہ آئے۔ امجد نے میری بیوی سے کہا کہ وہ اُس کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور وہ میری بیوی اور بچیوں کو بھوکا نہیں رہنے دے گا۔ میری بیوی خوددار عورت ہے۔ اُس نے امجد کی پیش کش قبول نہ کی لیکن امجد تین چار روز بعد رات کے وقت پھر میرے گھر چلا گیا۔ میری بڑی بیٹی اُس سے پردہ کرتی تھی۔

امجد نے میری بیوی کو ایک سَو روپیہ دیا۔ میری بیوی نے قبول نہ کیا۔ امجد سَو روپے کا نوٹ میری بیوی کے آگے پھینک کر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد میری بیٹی نے ٹیوشن پڑھانے کا انتظام کر لیا۔ میری بیوی نے سلائی مشین رکھ لی تھی۔ امجد نے میرے گھر جانا نہ چھوڑا۔ وہ پندرہ بیس روز بعد میرے گھر شام کے بعد جاتا تھا۔ میری بیوی سے پُوچھتا کہ گھر میں پیسے ہیں یا نہیں اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کبھی کبھی میری بیوی اُسے گھر کی کوئی ایسی ضرورت بتا دیتی جو وہ عورت ہونے کی وجہ سے خود پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا انتظام [illegible] اس نے تین بار

میری بیوی کو ایک ایک سو روپیہ دیا۔ میری بیوی نے امجد کی ضد پر یہ رقم قبول کی۔

"تم نے کہیں ملازمت کر لی ہے ؟" میں نے امجد سے پوچھا۔

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔

"پھر یہ ایک ایک سو روپیہ کہاں سے لاتے رہے ہو؟"

"آپ اچھا نہیں سمجھیں گے۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن مَیں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مَیں یہ پیسے اپنے گھر سے چوری کر کے خالہ کو دیتا رہا ہوں۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چوری کے پیسے میری بیوی کو دیتا رہا تھا میرے گھر میں حرام کی رقم استعمال ہوتی تھی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں نے کبھی حرام کا ایک پیسہ اپنی جیب میں نہیں ڈالا۔

"جب آپ باہر نکلیں گے چاچا ! تو چوری کی رقم مجھے واپس کر دینا۔" اُس نے کہا۔ "مَیں جو کر سکتا تھا وہ کیا ہے۔ یقین کرنا چاچا ! میں اندر سے جل رہا تھا۔ جونہی میں نے آپ کے گھر میں داخل ہو کر خالہ کے پاؤں پکڑے، میری آگ بجھ گئی۔ مجھے سکون مل گیا۔"

"تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو ؟" مَیں نے اُس سے پوچھا۔ "میرا خیال ہے تم نے چوری کی ہو گی۔"

"مَیں نہیں بتانا چاہتا تھا۔" اُس نے کہا۔ "لیکن آپ نے مجھ پر چوری کا شک کیا ہے۔ اس لیے بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ مَیں کس جرم میں پکڑا گیا ہوں... آپ کی بیٹی چند ایک بچوں کو اپنے گھر میں پڑھاتی ہے اور دن کے پچھلے پہر دو بچوں کو اُن کے گھروں میں پڑھانے جاتی ہے۔ دونوں گھر دُور ہیں۔ ایک رات میں آپ کے گھر گیا تو خالہ نے بتایا کہ کچھ دنوں سے آپ کی بیٹی کو دو لڑکے راستے میں پریشان کرتے ہیں۔ مجھ سے آپ کی بیٹی پردہ کرتی ہے۔

"مَیں دوسرے دن آپ کی بیٹی کے راستے میں جا کھڑا ہوا اور دُور دُور رہ کر

اُسے دیکھتا گیا۔ واپسی کے وقت بھی میں چلا گیا اور اُسے دیکھتا ہوا واپس آ گیا۔ مَیں تین دن جاتا رہا۔ چوتھے دن جب آپ کی بیٹی واپس آ رہی تھی۔ مَیں نے دو نوجوان دیکھے۔ وہ میری عمر کے ہیں۔ مَیں انہیں نہیں جانتا تھا۔ وہ آپ کی بیٹی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو ایک نے بیہودہ بکواس کی۔ آپ کی بیٹی رُک گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر رُکی تھی۔ مجھے پہچانتی تھی۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہ لڑکے اُسے اکثر اسی طرح پریشان کرتے ہیں۔

"میں نے اُسے کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ مَیں نے جو ارادہ کر لیا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر آپ کی بیٹی کو وہاں رکنا نہیں چاہیئے تھا۔ ورنہ اُس کی بدنامی ہوتی۔ جونہی آپ کی بیٹی نے پلٹ کر پھیری، مَیں ان نوجوانوں پر ٹوٹ پڑا۔ پھر وہی ہوا جو آپ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ دو تھے اور مَیں اکیلا تھا۔ میرے ہاتھ میں اینٹ آ گئی۔ مَیں نے اُٹھا کر اُن میں سے ایک کے کندھے پر پھر سر پر ماری۔ اُس کا خون بہنے لگا۔ دوسرا بھاگ گیا۔ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ورنہ میں اس لڑکے کو قتل کر دیتا۔ پورے تھانے تک چلی گئی۔

میرا باپ اور بھائی اتنے کمزور نہیں کہ خاموش رہتے۔ انہیں تھانے سے میری گرفتاری کی اطلاع ملی تو وہ آ گئے۔ انہوں نے ان دونوں لڑکوں کے خلاف رپورٹ لکھوا کر پرچہ کرا لیا۔ چونکہ ایک لڑکا زخمی تھا۔ اس لیے گرفتار صرف مجھے کیا گیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ راضی نامہ کر لیں گے۔ اُن میں مقدمہ لڑنے کی ہمت نہیں۔ ورنہ وہ دونوں لڑکے گرفتار ہو جائیں گے۔

میں امجد کا بہت مشکور تھا کہ اُس نے میری بیٹی کو ایک پریشانی سے بچایا تھا لیکن میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ باپ کو اپنی بیٹی کے متعلق ایسی بات کہنی تو نہیں چاہیے۔ لیکن میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے یہ سوچ پریشان کرنے لگی کہ امجد نے شاید میری بیٹی پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ قیدی وہم اور وسوسوں میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا، لیکن اس لڑکے نے مجھ پر کوئی ایسا اثر پیدا کر لیا تھا

کہ مَیں نے اُس پر اعتبار کر لیا۔

"امجد بیٹا!" مَیں نے کہا: "تم میرے گھر جاتے رہے ہو۔ تمہیں میری گلی کے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ اور انہوں نے میری بیوی اور میری بیٹی کو بدنام کرنا ہوگا۔"

"آپ نے بڑا لمبا زمانہ دیکھا ہے۔" اُس نے کہا: "لوگوں کو باتیں بنانے کے لیے ذرا سا اشارہ کافی ہوتا ہے۔ مَیں تو آپ کے گھر جاتا رہا ہوں اگر مَیں لوگوں کی باتوں سے ڈر جاتا تو مَیں کبھی آپ کے گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکتا۔ آپ کی گلی والوں نے میرے گھر جا بتایا کہ تمہارا لڑکا تمہارے دشمنوں کے گھر جاتا ہے۔ میرے باپ اور بھائیوں نے مجھ سے باز پرس کی۔ میں نے جھوٹ بولا کہ مَیں وہاں نہیں جاتا۔ میرا باپ میری پٹائی بھی کر چکا ہے۔ لیکن میں چوری چھپے آپ کے گھر جاتا رہا۔"

امجد نوجوان تھا۔ وہ جذبات میں آکر میرے گھر جاتا رہا۔ اُس نے میرے گھر کی بدنامی کا خیال نہ کیا۔

تین چار روز بعد ضمانت پر رہا ہو گیا۔ مجھے ایک ماہ بعد پتہ چلا کہ اُس کا اُن لڑکوں کے ساتھ راضی نامہ ہو گیا ہے اور کیس عدالت میں نہیں گیا۔ وہ میری قید کا تمام عرصہ میرے گھر جاتا رہا۔ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آیا۔ پتہ چلا کہ وہ میری بیٹی سے دُور رہ کر اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ میری بیٹی نے مجھے بتایا کہ اُسے معلوم ہے کہ وہ جب ٹیوشن پڑھانے جاتی ہے تو امجد اُس سے دُور دُور اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔

جیل میں میرا ریکارڈ اچھا تھا۔ میں چونکہ جیل کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس لیے افسروں کے ساتھ اچھی راہ و رسم پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکٹھی پانچ مہینے معافی مل گئی۔ مَیں رہا ہو کر گھر آ گیا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ امجد اُس کے لیے اور میری بچیوں کے لیے کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

مَیں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ قید ہو جانے سے ملازمت ختم ہو گئی تھی۔

ہاہو کر میں اُسی کمپنی کے دفتر میں چلا گیا۔ مالکوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ مَیں کیوں گرفتار ہوا ہوں۔ انہوں نے مجھے پرانی ملازمت دے دی۔ مَیں اب بھی اُس کمپنی میں ملازم ہوں۔ مَیں نے بیٹی کی باہر والی ٹیوشنیں چھڑوا دیں۔ صرف اُن بچوں کی ٹیوشنیں رہنے دیں۔ جو میرے گھر میں آکر پڑھتے تھے۔ اب میرے سامنے مسئلہ بیٹی کی شادی کا تھا۔ اپنا کوئی رشتہ دار نہیں۔ مَیں اور میری بیوی بیٹی کے رشتے کے مسئلے پر باتیں کرنے لگے۔

ایک روز میری بیوی نے کہا کہ امجد سے بہتر لڑکا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن دشمنی ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ امجد کے ماں باپ نہیں مانیں گے۔ بیوی نے کہا کہ کسی طرح یہ دشمنی ختم ہو جائے۔ امجد بھی یہی چاہتا ہے۔

میری بیوی نے دراصل میرے دل کی بات کہہ دی تھی، لیکن میں بیٹی کا باپ تھا۔ مَیں امجد سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنے باپ کو راضی کرے۔ دو چار روز میری بیوی نے محلے کی کسی عورت کے ساتھ بات کی کہ امجد ہماری بیٹی کو پسند کرتا ہے اور ہم امجد کو پسند کرتے ہیں۔ میری بیوی نے اس عورت سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ امجد سے کہے گی کہ اپنے ماں باپ کو راضی کرے کہ وہ ہم سے رشتہ مانگیں۔

آپ اپنے معاشرے کی عورتوں کو جانتے ہیں۔ اس عورت نے امجد کی ماں کو جا بتایا کہ تمہارا لڑکا فقیر حسین کے گھر میں پھنسا ہوا اور وہاں امجد کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امجد کے ماں باپ نے ایک ہفتے کے اندر اندر اُس کی شادی اپنے رشتہ داروں میں کر دی۔ میں آپ کو صحیح بات بتاتا ہوں کہ مجھے اس کا افسوس ہوا۔

تین مہینے امجد مجھ سے نہ ملا نہ میرے گھر آیا۔ مَیں ایک شام گھر آیا تو بیوی نے مجھے بتایا کہ امجد آیا تھا۔ وہ رو پڑا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ دشمنی ختم کر دیں۔ اُس کی

ماں نے اُس کے باپ اور بھائیوں کو بتایا کہ لڑکا اپنے دشمن کے جال میں آگیا ہے۔ بڑے بھائی نے اسے مارا پیٹا اور ہمارے "جال" سے نکالنے کے لیے اُس کی شادی کردی۔ امجد نے میری بیوی کو بتایا کہ جس لڑکی کو اُس کی بیوی بنادیا گیا ہے۔ وہ اُسے پسند نہیں اور لڑکی بدتمیز اور پھوہڑ ہے۔ امجد نے اُس کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کردیا اور وہ دو مہینوں سے اپنے میکے بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں باپ اور بھائی امجد کو بُرا بھلا کہتے تھے کہ اُس کا دل کہیں اور تھا اس لیے اُسے یہ بیوی پسند نہیں آئی۔

اس واقعہ کو چار سال ہوگئے ہیں۔ میری بیٹی کی شادی میرے ایک دوست کے بیٹے کے ساتھ ہوگئی تھی۔ اُس کا ایک بچّہ بھی ہے۔ اُدھر امجد دو سال ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے اور اُس نے دوسری شادی سے انکار کردیا ہے۔ مگر اُسے کوئی اپنی بیٹی دے گا ہی نہیں کیونکہ اُس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندگی کی پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ چرس پیتا ہے۔ مَیں نے اس عرصے میں اُسے دو تین بار دیکھا تھا۔ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اُس کا رنگ زرد اور چہرہ مرجھا گیا ہے۔ اب سُنتے ہیں کہ کئی کئی دن گھر نہیں آتا اور گھر والوں نے اُس کے نام پہ اکبر پھیر دی ہے۔

30-7-95

غیرت مرا نہیں کرتی

ہر ملک کے لیے دوسرے ملکوں کی جاسوسی اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنا اسلحہ اور بارود۔ خصوصاً ان ملکوں کے لئے۔ جن کی آپس میں دشمنی کی فضا قائم رہتی ہے۔ مثلاً روس اور امریکہ، پاکستان اور بھارت وغیرہ۔ ایسے ملکوں کو ایک دوسرے کے ملک میں جاسوس بھیجنے ہی پڑتے ہیں۔ کیونکہ آدھی جنگ کامیاب جاسوسی جیت لیتی ہے۔ اگر پاکستان میں بھارت کے جاسوس موجود ہیں یا بھارت میں پاکستانی جاسوس سرگرم ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اگر آپ جاسوسوں کی دُنیا میں جائیں تو عجیب و غریب اور جذبات کو ہلا دینے والے اور ناقابلِ یقین واقعات رونما ہوتے نظر آئیں گے۔ ایسی کہانیاں بظاہر افسانے لگتی ہیں لیکن یہ افسانے نہیں ایسی حقیقتیں ہیں جو افسانے سے زیادہ چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔

اب مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ اس کہانی کے کردار مجھے کہاں ملے اور یہ کہانی مجھ تک کس طرح پہنچی کیونکہ میں یہ بتاؤں تو ایک تو کہانی طویل ہوجائے گی۔ دوسرے امانت میں خیانت ہوگی۔

پاکستان اور بھارت کی سرحد پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ دونوں ملکوں کی جاسوسی کا نظام غیر معمولی طور پر سرگرم تھا۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک ایجنٹ جسے میں کہانی سُنانے کے لیے احمد خان کہوں گا۔ سرحد پار جارہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مشن کامیابی سے انجام دے چکا تھا۔ ان دِنوں

سرحد پار کرنا ایسے ہی تھا۔ جیسے کوئی آگ میں سے گزر جائے۔ کیونکہ دونوں طرف سرحدوں پر ایسی فوج موجود تھی جو عام شہری کو نظر نہیں آتی، لیکن اُس فوج کی نظر درختوں کے پتّے پتّے پر اور گھاس کی پتّی پتّی پر ہوتی ہے۔ احمد خان اُن تمام خطرات سے آگاہ تھا۔ لیکن تنخواہ کے علاوہ جو جذبہ اُس کے اندر پیدا ہو چکا تھا وہ اُسے ان خطروں میں دھکیل رہا تھا۔

اِس طرح جانے والے جاسوسوں کے اُستقبال اور رہنمائی کے لیے آگے آدمی ہوتا ہے جسے "کورئیر" کہتے ہیں۔ سرحد پار کروانے کے لیے جو کورئیر موجود تھا اُس کا نام غلام محمد تھا۔ وہ پچھلے پانچ چھ سال سے پاکستان انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اُس کے فرائض میں پاکستانی جاسوسوں کو بحفاظت سرحد پار پہنچانا اور واپس لانا تھا۔ غلام محمد کو سرحد پار کا علاقہ اور اُس کے لوگ بخوبی جانتے تھے اور یہی اُس کی کامیابی تھی کہ اُس نے اپنے اوپر سمگلنگ کا خول چڑھا کر اپنی اصلیت کو چھپا رکھا تھا اور وہاں کے لوگوں میں مقبول تھا۔

غلام محمد اور احمد خاں کو جہاں اکٹھے ہونا تھا ہوئے اور وہاں انٹیلی جنس کے آفیسر نے انہیں آخری ہدایات دیں اور خدا حافظ کہہ کر انہیں اُن رینجرز کے حوالے کر دیا جو اسی کام کے لیے وہاں موجود تھے۔

"میرے دوستو!" انٹیلی جنس کے آفیسر نے کہا: "تم میرے حکم سے نہیں جا رہے۔ اس وقت یہ بھول جاؤ کہ تمہیں ایک افسر حکم دے رہا ہے۔ تم خدا کے حکم سے جا رہے ہو۔ اپنے ملک کی روح تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جانتے کہ دشمن کے مقابلے میں ہمارے پاس اسلحہ بارود کتنا کم ہے۔ اس کمی کو صرف تم پورا کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس ایمان کی قوت موجود ہے اور یہی قوت تمہیں فتح دے گی جاؤ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

سورج غروب ہونے کے بعد جب شام تاریک ہونے لگی تھی۔ گوشت پوست کے چار انسان دشمن کی سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر قدم انہیں

موت کے قریب لیے جا رہا تھا۔ اُن پر خاموشی طاری تھی اور ایسی خاموشی جس میں طوفان پنہاں ہوتے ہیں۔ چلتے چلتے دونوں رینجرز رُک گئے۔ انہوں نے کہا۔ دوستو ہمارا سفر تمہارے ساتھ یہیں تک تھا۔ ممکن ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ جاتے مگر کام کام میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سفر تمہیں اکیلے ہی طے کرنا ہوگا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ غلام محمد اور احمد خان چل پڑے۔ رینجرز کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر شام کی تاریکی نے انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

غلام محمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ خطرہ کہاں کہاں ہے۔ ایک تو بھارت کی بارڈر سکیورٹی فورس تھی اور انٹیلی جنس یونٹیں بھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ کھیتوں میں کوئی بظاہر بے ضرر سا کسان گھومتا پھرتا، کسان نہیں ہو سکتا وہ انٹیلی جنس کا ہی آدمی ہوگا۔ اگر آپ دشمن کے ملک میں چلے جائیں تو وہاں کے پتھر اور مٹی بھی آپ کے دشمن ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتے اس مقام تک پہنچ گئے۔ جہاں غلام محمد نے احمد خان کو چھپا کر آگے کے حالات معلوم کرنے تھے۔

غلام محمد نے احمد خان کو ایک جگہ بٹھا دیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ غلام محمد جانتا تھا کہ یہ جگہ محفوظ ہے۔ اُس نے احمد خان سے کہا کہ جنگ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس لیے تمہارا کام ناممکن کی حد تک دشوار ہو گیا ہے۔ یہاں کسی جانور پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تم بیٹھو، چوکنے رہنا۔ مَیں آگے کے حالات اور ماحول دیکھ آؤں۔ احمد خان کے لیے اُس کی باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ دو بار پہلے بھی ان خطروں سے گزر چکا تھا۔ گیا بھی تھا۔ واپس بھی آیا تھا۔ اُس نے ہنس کر غلام محمد سے کہا کہ تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے تمہاری فکر رہے گی۔ لیکن یہاں احمد خان کا تجربہ اُسے دھوکہ دے رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ عرصے سے غلام محمد وہ غلام محمد نہیں رہا جو کبھی ہوا کرتا

تھا۔ اب وہ اپنا ایمان اور ضمیر فروخت کر چکا ہے اور اب اُس کے چہرے پر ایک نہیں دو نقاب ہیں۔ ایک بھارت کا ایک پاکستان کا۔

اس کہانی کا یہ حصّہ مجھے کچھ عرصہ بعد پتہ چلا تھا۔ یہ مَیں آپ کو اس کے ساتھ ہی سُنا دیتا ہوں۔ غلام محمد حالات دیکھنے نہیں جا رہا تھا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کی خفیہ چوکی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں اسے احمد خان کا سودا کرنا تھا۔ غلام محمد ڈبل کراس (دوغلی جاسوسی) کر رہا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ملکوں کی انٹیلی جنس سے پیسے کما رہا تھا۔

غلام محمد ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا تو اُسے کسی کی کھانسی کی آواز سُنائی دی جو کھانسی نہیں تھی۔ ایک اشارہ تھا۔ ایسے اشارے عموماً سمگلر اور جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ غلام محمد رُک گیا۔ ایک آدمی اُس کے قریب پہنچا۔ غلام محمد نے اُسے پہچان لیا۔ وہ چُونی لال تھا۔

"اوہ یہ تم ہو گامے" چُونی لال نے کہا۔ بھارتی علاقے میں غلام محمد گامے کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

چُونی لال نے کہا۔ "کوئی شکار لائے ہو؟"

"نہ یار! شکار کہاں؟" غلام محمد نے جواب دیا: "آج تو ویسے ہی گیا ہوں۔"

"اوہ گامے" چُونی لال نے اُسے کندھے پر تھپکی دے کر کہا: "ہمارے ساتھ بھی چکر بازی!"

اب غلام محمد اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی شکار نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی آیا ہے۔ لیکن چُونی لال نے اُسے احمد خان کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ چُونی لال کوئی عام قسم کا آدمی تو نہیں تھا جو غلام محمد پر فوراً یقین کر لیتا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کا "ٹاؤٹ" تھا۔ جس کا یہی کام تھا کہ آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھے اور اپنے مطلب کے آدمی اُن میں سے تلاش کرتا رہے

غلام محمد کو تو وہ جانتا ہی تھا اور اُس کی اب کوشش یہ تھی کہ غلام محمد جس پاکستانی جاسوس کو ساتھ لایا ہے وہ اُس کے حوالے کر دے تاکہ اسے وہ خود اپنی انٹیلی جنس کے حوالے کرے اور انعام و اکرام حاصل کرے۔

غلام محمد کو خیال آ گیا کہ جو کام وہ خود کر سکتا ہے، وہ کام چُونی لال کے حوالے کیوں کرے۔ لیکن چُونی لال اُس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ چُونی لال نے اُسے کہا کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے شکار کسی جھاڑی کے پیچھے بٹھایا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ مَیں اکیلا نہیں میرے ساتھ جو کوئی بھی ہیں۔ وہ خالی ہاتھ نہیں اور تم یہ بھی نہ بھولو کہ تم میرے ملک میں ہو۔ شکار تم نہیں دو گے مَیں خود جا کر لے لوں گا۔

غلام محمد وہاں لڑائی جھگڑے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اُس نے چُونی لال سے کچھ بے بسی کے سے عالم میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ جو کوئی بھی تھا وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو جا کر خود پکڑ لو۔ مَیں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔

چُونی لال نے بلند آواز سے کہا۔ "چلو اوئے!" اور وہ چل پڑا۔ غلام محمد کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ دو تین آدمی تو ضرور ہوں گے۔ غلام محمد جلدی ہارنے والا نہیں تھا۔ اگر جاسوس اتنی جلدی ہار جائے تو وہ اپنا کام کبھی بھی نہ کر سکے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہار کا مطلب گرفتاری، غیر انسانی اذیتیں اور موت ہے۔ جونہی چُونی لال اُس کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ وہ دوسری طرف بڑی تیزی سے چل پڑا۔ وہ راستہ چھوٹا کر کے احمد خان تک پہنچنے کی کوشش میں تھا۔

احمد خان غلام محمد پر بھروسہ کیے اطمینان سے وہیں بیٹھا تھا۔ جہاں وہ اسے بٹھا گیا تھا۔ اُسے جب قدموں کی آہٹ سُنائی دی تو اُس نے ذرا سر اُٹھا کر دیکھا کہ اُس کی طرف آنے والا ایک نہیں تین چار آدمی ہیں جو سایوں کی طرح اُسے نظر آ رہے تھے۔ احمد خان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کے قابل تھیں۔ اُسے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ وہاں سے سرک کر ایک طرف ہوا۔ آنے والے بڑی تیزی سے

اُس طرف آرہے تھے۔ اُسے ایک للکار سُنائی دی۔ "جو کوئی بھی ہو اُٹھ کے ہمارے سامنے آجاؤ۔" اب احمد خان کو یقین ہوگیا کہ غلام محمد دھوکے میں آگیا ہے وہ اُٹھا اور اُس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ بیک وقت دو تین گولیاں فائر ہوئیں احمد خان نے محسوس کیا کہ ایک یا دو گولیاں اُس کی ٹانگ میں سے گزر گئی ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی جھکتا ہوا اُن سرکنڈوں میں چُھپ گیا۔ جو قریب ہی تھے۔ اُس کے بعد گولیاں چلتی رہیں اور احمد خان سرکنڈوں میں سے نکل کر اُس طرف ہوگیا۔ جدھر چونی لال اور اُس کے آدمیوں کو شک نہیں ہوسکتا تھا۔ اب چُونی لال اور اُس کے آدمی اُسے سرکنڈوں میں تلاش کرتے رہے اور احمد خان رینگتا سرکتا کچھ دُور نکل گیا۔

غلام محمد نے گولیوں کے دھماکے سُنے تو اُسے افسوس ہوا کہ اُس کا انعام و اکرام ہاتھ سے نکل گیا ہے اس کا دوسرا نقصان یہ تھا کہ چُونی لال اس کے خلاف رپورٹ کرے گا کہ غلام محمد بھارتی انٹیلی جنس کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اُسے گرفتار بھی کیا جاسکتا تھا اور اُسے ہمیشہ کے لیے بلیک لِسٹ بھی کیا جاسکتا تھا۔ اُس کے قدم رُکنے لگے۔ وہ سرحد کی طرف چل پڑا کہ کہیں وہ بھی نہ مارا جائے اندھیرے میں اُس نے اچانک دیکھا کہ کوئی لنگڑاتا ہوا اس طرف آرہا ہے وہ آگے بڑھا۔ دیکھا تو وہ احمد خان تھا۔

احمد خان نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ غلام محمد نے کہا کہ مَیں خود حیران ہوں کہ کیا ہوا ہے۔ اب غلام محمد نے سوچا کہ احمد خان کو وہ خود انٹیلی جنس کے حوالے کرے لیکن چُونی لال اُس کے آدمیوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں۔ اس کے دماغ میں ایک سکیم آگئی۔ اُس نے احمد خان کو ساتھ لیا۔ لیکن احمد خان چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُس نے اسے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ احمد خان نے پوچھا اب کہاں کا ارادہ ہے؟ غلام محمد نے جواب دیا کہ میرا فرض ہے کہ تمہیں واپس پہنچاؤں لیکن غلام محمد کی نیّت کچھ اور تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھا۔ میل ڈیڑھ میل

دُور ایک خانقاہ تھی، جو چرسیوں، بھنگیوں کا اڈہ تھا۔ غلام محمد کبھی کبھی یہاں کش لگانے آجاتا تھا۔

یہ ایک معمولی سی خانقاہ تھی جو اب اڈہ ہی بن کے رہ گئی تھی۔ قریب کے گاؤں میں دو تین گھر ہی مسلمانوں کے رہ گئے تھے جو بے چارے صرف نام کے مسلمان تھے۔ اُن کے بچوں کے نام بھی ہندوؤں سکھوں جیسے ہوتے جارہے تھے۔ وہ تو اب مسجد کو بھی بھول گئے تھے۔ خانقاہ پر وہ کیا جاتے۔

احمد خان کو اس خانقاہ تک پہنچا کر اُس نے قبر کے قریب بٹھا دیا۔ اپنی چادر پھاڑ کر اُس کے ٹانگ کے زخم پر باندھ دی۔ خانقاہ کا متولی اُن کی آواز سُن کر وہاں آ گیا۔ متولی غلام محمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن وہ اُسے ہندو سمجھتا تھا اور متولی یہ بھی جانتا تھا کہ گاما سمگلر ہے جو کبھی کبھار متولی کو چرس کی دو چار گولیاں دے جاتا تھا۔ غلام محمد نے متولی سے کہا کہ یہ میرا ساتھی ہے۔ زخمی ہوگیا ہے۔ متولی نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سمگلر ہیں۔ ان پر کبھی کبھار گولی چل جاتی ہے۔ اُس نے احمد خان کو اٹھایا اور خانقاہ کے ساتھ اپنے کوٹھے میں لے گیا اور اپنے بستر پر لٹا دیا۔

غلام محمد متولی اور احمد خان سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ واپسی کا بندوبست کرتا ہے۔ "دیکھتا ہوں کہیں سے کوئی گدھا گھوڑا مل جائے۔" لیکن وہ انٹیلی جنس کی ایک چوکی کی طرف جارہا تھا۔

چوکی پر پہنچا تو اُس نے ہندو کیپٹن کو اپنا منتظر پایا۔ جسے رات والے فائرنگ کے واقعہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب ہندو کیپٹن اس پر برس پڑا کہ تم آگ کے ساتھ کھیل رہے ہو۔ مجھے رپورٹ مل چکی ہے کہ رات تم نے ہمیں کیا دھوکہ دیا ہے۔

غلام محمد نے جھوٹ کی تلوار کو جھوٹ سے کاٹنا چاہا۔ اُس نے کہا کہ مَیں نے نہیں بلکہ چونی لال نے رات کو چند روپوں کے انعام کے لالچ میں ایک پاکستانی کو بھگا دیا ہے اور ایک زخمی پڑا ہے۔ کام کا آدمی وہ تھا۔ جو بھاگ گیا ہے۔ چُونی لال نے میرے ساتھ رات کو زیادتی کی کہ میں دونوں پاکستانیوں کو آپ کے پاس لا رہا تھا۔ مَیں اُن

پاکستانیوں کے ساتھ نکل آیا تو چُونی لال کے آدمیوں نے ہم پر فائرنگ کی۔ دونوں پاکستانی بھاگ نکلے۔ چونی لال الگ غائب ہوگیا۔ میں ساری رات پاکستانیوں کو ڈھونڈتا رہا۔ ان میں سے ایک زخمی حالت میں پڑا ملا۔ دوسرا نہ ملا۔ وہ یقیناً بھاگ گیا ہے۔ زخمی کو میں ایک جگہ چھپا آیا ہوں، میں اُسے اپنے ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ پھر کہیں چونی لال راستے میں نہ حائل ہو جائے۔ میں اتنی مشکل سے جو اپنا شکار لایا ہوں۔ وہ چونی لال کے کھاتے میں کیوں ڈالوں۔"

ہندو کیپٹن غلام محمد کی بات مان گیا۔ اُس نے چُونی لال کو دو چار گالیاں بھی دیں اور کہنے لگا کہ میں تمہارے سامنے چونی لال کو جوتے ماروں گا۔ تم اُس آدمی کو لے آؤ۔"

غلام محمد خانقاہ کی طرف چل پڑا جو وہاں سے کم و بیش تین چار میل دُور تھی۔ جب وہ خانقاہ پر پہنچا تو صبح کی سفیدی صاف ہو چکی تھی۔ وہ متولی کے کوٹھے میں داخل ہوا تو وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی اور احمد خان چائے پی رہا تھا۔ اُس کے آگے مکئی کی روٹی بھی رکھی تھی۔ یہ متولی کا انتظام تھا۔ اُس نے احمد خان کے لیے ناشتہ اپنے گھر سے منگوایا تھا۔

غلام محمد اس بڑھیا کے جانے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے کہا کہ یہ لڑکا بتاتا نہیں کہ یہ کس طرح زخمی ہوا ہے۔

"اماں جی! کیا بتائیں؟" غلام محمد نے مایوسی کے عالم میں کہا اور ایک گاؤں کا نام لے کر بولا: "ہم دونوں بھائی رات کو ایک ماتم پر کسی گاؤں جا رہے تھے راستے میں سکھوں نے جو شراب پیئے ہوئے تھے ہم سے پوچھا کہ کون ہو؟ ہم نے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں تو ایک سکھ نے قہقہہ لگایا اور پستول نکال کر گولی فائر کر دی اور اسے زخمی کر کے ہنستے ہوئے چلے گئے۔"

بڑھیا نے لمبی آہ بھری اور کہنے لگی کہ یہاں ہماری زندگی ہے ہی کیا۔ جیسے مکھی مار دی ایسے یہاں مسلمان کو مار دیتے ہیں۔ تمہارا وہ وقت یاد ہوگا۔ جب ملک تقسیم

ہوا تو بڑھیا کی زبان رواں ہوگئی۔ جیسے اُس کا رُکا ہوا غبار بے قابو ہو کر نکل رہا ہو۔ وہ کہنے لگی: "میں وہ وقت ساری عمر نہیں بھول سکوں گی۔ میں اِس گاؤں کی رہنے والی نہیں۔ یہاں سے گیارہ بارہ میل دُور گوبند پورہ کی رہنے والی ہوں۔"

غلام محمد یہ نام سُن کر ذرا سا چونکا جیسے اُسے کوئی بڑی پُرانی بات یاد آگئی ہو۔ کہنے لگا۔ گوبند پورہ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ لیکن بڑھیا نے اُس کی بات پر دھیان نہ دیا اور اپنی سُناتی چلی گئی۔

"رات کا وقت تھا کہ میرے گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سکھوں نے حملہ کر دیا تھا۔ مسلمان ایک تو سوئے ہوئے دوسرے نہتے اور تیسرے تعداد تھوڑی، کر ہی کیا سکتے تھے۔ جس کا جدھر منہ آیا بھاگ اُٹھا۔ سکھوں نے کسی کو بھاگنے نہ دیا۔ برچھیوں اور کرپانوں سے کاٹتے چلے گئے۔ بچوں تک کو انہوں نے نہ بخشا۔ دودھ پیتے بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے چھینا اور برچھیوں کی اَنیوں میں اُڑس کر قہقہے لگاتے۔ جوان لڑکیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے گئے۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ میں نے بعد میں سُنا تھا کہ کچھ مسلمان لڑکیاں اپنی عصمتیں بچانے کے لیے کنوؤں میں کود گئی تھیں۔ بعض نے اپنے آپ کو اپنے جلے ہوئے مکانوں کے شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایسی خوش قسمت کم ہی تھیں۔ زیادہ تر کو سکھ اُٹھا لے گئے تھے۔

"یہ تو سینکڑوں سکھوں کا حملہ تھا۔ جو رات کو ہوا۔ دن کے وقت میرے پڑوس کی ایک نوجوان لڑکی جس کا نام رضیہ تھا۔ گاؤں سے نکلی تو دن دہاڑے سکھوں نے اُٹھا لی۔ مسلمان چیختے چلّاتے رہ گئے۔ سکھ لڑکی کو لے گئے۔"

غلام محمد یوں چونکا جیسے اُسے کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا ہو۔ گھبرائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "اماں جی! آپ نے کیا نام بتایا ہے۔ رضیہ۔"

"ہاں بیٹے! میں اس کا نام کبھی نہیں بھول سکتی۔" بڑھیا نے کہا۔ "بے چاری کا

کوئی بڑا بھائی گھر نہیں تھا کہ اُسے آگے بڑھ کر چھڑاتا. چھوٹا سا ایک ہی بھائی تھا۔ بے
اس کا بھی نام یاد ہے۔ غلام محمد نام تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اپنے دروازے
میں کھڑا اپنی بہن کے لیے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اُس پر ترس کھانے والا کوئی
تھا۔ بے چاروں کا باپ اندر بیمار پڑا تھا اور ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جاکر
دیکھا وہ مرا ہوا تھا۔ بیٹی کے صدمے سے مر گیا تھا۔ اُس رات حملہ ہوا۔ مَیں نہیں
سمجھتی کہ میری قسمت اچھی یا بُری۔ مَیں انہی شعلوں میں سے، اس چیخ و پکار میں
سے اور ان سکھ وحشی درندوں میں سے زندہ سلامت نکل آئی۔

"مَیں اندھیرے میں دوڑتی چلی گئی۔ گری اٹھی پھر دوڑی اور پھر اس خانقاہ
کے دروازے پر ایسی گری کہ اُٹھ نہ سکی۔ صبح ان ملنگوں نے مجھے اُٹھایا۔ مجھ پر نیم
بے ہوشی طاری تھی اور اسی کوٹھے میں چارپائی کے نیچے انہوں نے مجھے
پھینک دیا۔

صبح ہوئی تو باہر سے مجھے آوازیں سنائی دیں۔ 'او ملنگو! یہاں کوئی مسلمان
تو آکر نہیں چھپا۔ ایک ملنگ نے کہا۔ 'خالصہ جی، ہم کہاں کے مسلمان ہیں کہ ہمارے
پاس کوئی چھپنے آئے گا۔ ہمارا دین مذہب تو چرس اور بھنگ ہے، سکھ
چلے گئے.....

"مجھے معلوم نہیں وہ قیامت کس طرح آئی اور کس طرح چلی گئی اور کتنے
دن بیت گئے۔ مَیں حیران ہوں ان ملنگوں پر جو کہتے تھے کہ چرس اور بھنگ
ہمارا مذہب ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی لڑکی سمجھ کر چھپائے رکھا۔ کھانے کو دیتے
رہے اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے میری رضامندی سے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔
مَیں پاگلوں کی طرح اُٹھ کر بھاگی تھی کہ مَیں اپنا گوبند پورہ دیکھوں گی اور یہ لوگ
مجھے کہتے تھے کہ وہاں اب راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہ گیا اور اس راکھ کے
نیچے تمہارے خاندان کی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن میرے پاگل پن میں کوئی فرق نہ
آیا۔ ایک دن ایک بوڑھے ملنگ نے مجھے حقے کا کش لگوا دیا۔ تھوڑی دیر

یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دُکھ اور غم نہیں رہا۔ لمبی باتوں کو چھوڑو۔ سیدھی بات ہے
انہوں نے مجھے چرس پلا دی تھی۔ اس کے سوا علاج ہی کیا تھا.....

"ایک سال گزرا تو میں نے یہ قبول کر لیا کہ اب میری یہی زندگی ہے۔ میرا ایک
بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ مَیں نے چرس چھوڑ دی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا خاوند
ملنگ ہی ہے۔ لیکن مسلمان تو ہے سکھ نہیں ہے۔ مگر بیٹے! گوبند پورہ میرے
دل سے اُترا نہیں۔ رضیہ کو مَیں بھول نہیں سکتی۔ مَیں اُس رات کو نہیں بھلا سکتی۔ جیسے
دل ہر طرح مطمئن رہتا ہے۔ لیکن ایک کانٹا سا دل میں چبھا رہتا ہے کہ مسلمان اپنی عزت،
غیرت کو کیوں بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ پاکستانیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ مَیں
نے ان پڑھ چرسیوں، بھنگیوں میں عمر گزار دی ہے۔ حکومتوں کے معاملے حکومت
کرنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ مَیں اتنا کہتی ہوں کہ مسلمان، کو اپنی عزت اپنی غیرت
بیچنی نہیں چاہیئے۔ ان سے تو وہ غیرت والی تھیں۔ جو کنوؤں اور شعلوں میں کود گئیں۔
مَیں بھی کنوئیں میں ہی کود گئی تھی۔ سمجھو کہ ایک ملنگ کو اپنا خاوند بنا لیا اور خوش ہو گئی کہ
چلو مسلمان ہے سکھ نہیں۔"

بڑھیا نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ غلام محمد نے اچانک کہا۔ "اُٹھو احمد خان!
ہمیں فوراً جانا ہے۔"

اُس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ دن دھاڑے
دشمن کے علاقے سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ موت اور صرف موت۔ اُس نے
احمد خان کو کندھے پر ڈالا اور باہر نکلا اور اندھا دھند سرحد کی طرف چل پڑا۔ سب
سے بڑا خطرہ جو اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ دو آدمیوں کی صورت میں تھا جو ہندو
کیپٹن نے اس طرف بھیجے تھے کہ جا کر دیکھو گاما آیا کیوں نہیں؟ وہ ایک زخمی کو
لا رہا ہے۔ آخر مسلمان ہے۔ دھوکہ نہ دے جائے۔

سرحد میل ڈیڑھ میل دور رہ گئی تھی۔ غلام محمد ایک جوان آدمی کے بوجھ تلے
دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دُور پیچھے سے اُسے للکار سنائی دی۔ کوئی اُسے رُکنے کے لیے

کہہ رہا تھا۔ وہ اور تیز دوڑنے لگا۔ احمد خان نے اسے کہا کہ اتنا تیز نہ دوڑو گر پڑو گے۔ احمد خان نے یہ بھی کہا کہ رُک جاؤ۔ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

غلام محمد نے غصّے سے کہا: "نہیں، خاموش رہو احمد خان! مجھے چلنے دو۔"

انہیں اب اپنی ایک سرحدی چوکی نظر آنے لگی تھی۔ پیچھے سے پھر للکار سنائی دی۔ "رُک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔" وہاں کچھ کھڈ نالے بھی تھے زمین اونچی نیچی تھی۔ جس نے غلام محمد کی خاصی مدد کی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے غلام میں کوئی مافوق الفطرت قوّت عود کر آئی ہو یا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو وہ تو دوغلا ایجنٹ تھا، لیکن وہ پاکستان کے راستے پر دوڑا آ رہا تھا۔

ایک خشک برساتی نالے سے اُوپر چڑھا تو اسے اپنے ہاتھ زمین پر ٹیکنے پڑ اوپر جا کر جب اس نے سامنے دیکھا تو اپنی سرحدی چوکی دو ہاتھ ہی پر نظر آ رہی لیکن پیچھے سے تین چار گولیاں اکٹھی فائر ہوئیں۔

احمد خان نے اُس سے پوچھا۔ "غلام محمد! تم ٹھیک تو ہو۔ گولی تو نہیں لگی؟"

"نہیں۔ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ گولی تمہیں تو نہیں لگی۔" غلام محمد بولا۔

پیچھے سے شاید اور گولیاں بھی آئیں۔ کسی جذباتی رینجر نے جس نے انہیں پہچان لیا تھا۔ احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس طرف ایک ذو راؤنڈ فائر کر دیے اس سے غلام محمد اپنے عقب کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔ غلام محمد جب چوکی کے قریب پہنچا تو اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ پھر بھی چلتا گیا اور چوکی سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر منہ کے بل گرا۔

احمد خان ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اپنی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔ تین چار پاکستانی رینجر زور زور سے آئے ایک حوالدار نے غلام محمد کو پہچان لیا۔ دیکھا گیا تو اُس کے تمام کپڑے خون میں بھیگ رہے تھے۔ دو تین گولیاں اس کے کولہوں میں

سے گزر گئی تھیں۔ اُسے اٹھانے لگے تو اُس نے کہا۔ "نہیں، میں اب ہمیشہ کے لیے گر پڑا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں پاک مٹی میں آ کر گرا ہوں۔"

اُس نے احمد خان کی طرف دیکھا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے احمد خان سے کہا: "احمد! تم نے اس بڑھیا کی کہانی سُنی تھی نا۔ اُس نے جس رضیہ کا نام لیا تھا وہ میری بہن تھی اور جو چھوٹا سا غلام محمد دروازے میں کھڑا اپنی بہن کے لیے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ میں تھا۔ مجھے اس بڑھیا کی جوانی یاد ہے۔ اس نے میری غیرت کو بیدار کر دیا ہے۔ میں تو اپنا ایمان بیچ چکا تھا۔ تمہیں میں بھارتی انٹیلی جنس کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔ اچھا ہوا خدا نے بڑھیا کو بھیج دیا اور اچھا ہوا کہ میں مر رہا ہوں۔ ایمان بیچنے والوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ لیکن میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اب شاید خدا میرے گناہ معاف کر دے اور میری جان کا نذرانہ قبول کر لے۔ بڑھیا نے پوچھا تھا کہ مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔

احمد خان! غیرت مرا نہیں کرتی۔ غیرت کو کوئی جگانے والا تو ہو۔" اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں

جب بہن نے دھتکارا

کہانی سنانے والے صاحب نے مجھے کہا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس خاتون کو اس کے خاوند کو دیکھ لوں اور ان کے پڑوسیوں سے پوچھ لوں کہ ان کی ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے اور خدا نے کہاں کا خمیر کس مٹی سے جا ملایا ہے۔

میں اُن کے ساتھ اُس قصبے میں چلا گیا۔ جہاں یہ میاں بیوی رہتے ہیں۔ میں نے انہیں دُور سے دیکھا۔ اُن کے دو بچوں کو بھی دیکھا۔ کہانی سُنانے والے صاحب نے مجھے اپنے گھر بٹھایا اور ایک صاحب کو بلا لائے۔ پھر جہاں تک تصدیق کی ضرورت تھی۔ وہ میں نے کر لی۔ معلوم ہوا کہ اپنے معاشرے کی یہ جو کہانی مجھے سنائی گئی ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ قدرت کا یہ مظاہرہ سب نے دیکھا کہ یہ خاتون جسے میں اُس کے اصلی نام کے بجائے راشدہ لکھوں گا۔ کس طرح دولت کے زور پر آسمان تک پہنچی اور دولت ہی نے اُسے زمین پر پٹخ دیا۔

یہ ایک خاندان کی کہانی ہے جو ہمارے پُورے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے ایک باپ تھا جو بڑی مشکل سے روٹی چلاتا تھا۔ خُدا نے اُسے دو بیٹیاں دے کر مزید امتحان میں ڈال دیا اور بیٹا ایک ہی دیا۔ اُس نے اپنی اُمیدیں اور اپنی بیٹیوں کا مستقبل اپنے بیٹے کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ بیٹے کو اُس نے پیٹ باندھ کر تعلیم دلائی۔ محنت مزدوری اتنی کی کہ اُس کی کمر دوہری ہو گئی۔ بیٹا محنتی نکلا اور دیانتدار بھی۔ اُس نے بی۔ اے کر لیا اور تین چار ٹیوشنیں رکھ کر ان کی آمدنی سے بی ایڈ بھی کر لیا۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو جس قیمت پر نیلام کیا۔ وہ بہت تھوڑی

تھی۔ اُسے بی۔ ایڈ کی ڈگری کی بدولت ——— ایک سرکاری سکول میں ٹیچری کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ تھوڑی تھی۔ ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ اُس نے دو تین طلباء کی ٹیوشن رکھ لی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد سکول کی نوکری سے اُس کا دل بیزار ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک ایک ماسٹر نے بیس بیس ٹیوشنیں رکھی ہوئی ہیں۔ کلاسوں میں جس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ وہ کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں۔ بچوں کو زبردستی ٹیوشن پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ کاروبار بن گیا تھا کہ جن بچوں کی ٹیوشن رکھی جاتی ہے انہیں مل ملا کر پاس بھی کروا دیا جائے۔

اس ماسٹر نے جسے میں اصلی نام کے بجائے زبیر لکھوں گا۔ اس کاروبار سے دامن بچائے رکھا۔ لیکن اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ کاروبار ناجائز اور غیر قانونی ہی سہی، لیکن سکول ٹیچروں کو قلیل تنخواہ اور ہوشربا گرانی نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اور انہیں بیماریوں سے بچائے رکھنے اور اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اُلٹے سیدھے ہاتھ ماریں۔ زبیر نے پاؤں اتنے ہی پھیلائے جتنی خدا نے اُسے چادر دی تھی۔ لیکن پاؤں لمبے اور چادر چھوٹی ہوتی گئی۔ ماں باپ نے زبیر کی شادی صرف اس بنا پر کر دی کہ لڑکا ملازم ہو گیا ہے۔ برادری میں کوئی یہ نہ کہے کہ انہیں کسی نے رشتہ نہیں دیا۔ دو بہنیں شادی کے قابل تھیں۔ جن کے رشتے طے ہو چکے تھے۔ لیکن رشتے طے ہونے سے شادی نہیں ہو جایا کرتی۔ جہیز کا پہاڑ جیسا مسئلہ سر پر پڑا تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ اپنا مکان بیچ ڈالیں۔

لڑکیوں کی عمریں ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھیں۔ چھوٹی پندرہ سال کی اور بڑی سترہ سال کی تھی، لیکن رواج کے مطابق بھائیوں کی شادی بہنوں سے فارغ ہو کر کی جاتی ہے۔ زبیر اب یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ برادری طعنے دے گی کہ اُس نے بہنوں کا خیال نہ کیا اور اپنا بیاہ رچا لیا۔ اُس وقت تک زبیر نے دیانتداری

اور حلال کی کمائی کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن چار دیواری کی دنیا کے رسم و رواج ذمہ داریاں اور نمائش پسندی میں وہ اس طرح گھر گیا جیسے وہ سیلابی دریا میں ایک تختے پر بیٹھا بہتا جا رہا ہو اور اس کی کوشش میں ہو کہ اس پر پانی کے چھینٹے نہ پڑیں۔ آخر مجبوریوں نے اسے اسی راستے پر ڈال دیا۔ جہاں محنت اور دیانتداری بے معنی سی چیزیں بن کر رہ جاتی ہیں مگر ایک سال گزر جانے تک اسے اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا کہ پہلے جہاں ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ گوشت پکتا تھا۔ اب ہر دوسرے دن گوشت پکنے لگا۔ غمی شادی اور ختنے وغیرہ پر جہاں یہ لوگ پانچ روپے دیتے تھے اب اکیس اور اکیاون دینے لگے۔ بہنوں کے جہیز وہیں کے وہیں رہ گئے۔ البتہ برادری میں کچھ حیثیت بن گئی اور ان کی آؤ بھگت ہونے لگی۔

زبیر کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہوئی کہ اسے جو بیوی ملی اس میں بن ٹھن کر رہنے کی بھی عادت تھی اور اس میں شو بازی بھی زیادہ تھی۔ وہ کسی امیر کبیر گھرانے کی لڑکی بھی نہیں تھی۔ درمیانے درجے سے بھی کچھ کم درجے کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایسے گھرانوں میں محرومیوں کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اس لڑکی نے اس قسم کی محرومیوں کو شاید کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ جب خاوند کی آمدنی میں بالائی آمدنی کا بھی اضافہ ہو گیا تو اس نے یہ پیسے آئے دن کپڑے سلوانے اور بناؤ سنگھار کی نذر کرنے شروع کر دیے۔ بیاہ شادیوں پر سلامیاں دینے میں بھی وہ خاصی فیاض تھی۔ اسے اپنے خاوند کی بہنوں کی شادیوں کا کوئی غم فکر نہ تھا۔ زبیر کو اپنی بیوی کی یہ غلط عادتیں بری نہیں لگتی تھیں۔

زبیر نے بیوی کو ان ناروا اخراجات سے روکا۔ لیکن یہ محسوس کیا کہ اب جو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اپنے دین و ایمان کو ترک کر دیا تھا، وہ کی تو ں پڑی ہیں۔ حرام کی کمائی کے میدان میں اس کی راہ و رسم طرح طرح

لوگوں سے پیدا ہو گئی۔ ان میں ایک دو آدمی ایسے بھی تھے جو اسے بیرونِ ملک بھجوا سکتے تھے۔ اس وقت تک ہزاروں پاکستانی باہر جا چکے تھے اور باہر سے پیسہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ دو آدمی زبیر کی برادری کے بھی تھے۔ جن کے ہاں ہانڈی بھی بڑی مشکل سے پکتی تھی۔ لیکن اب ان کے گھروں کے آگے کسی نہ کسی تقریب کے بہانے دیگیں چڑھی رہتی تھیں۔

زبیر کے بھی دن پھر گئے۔ اسے ان اثر و رسوخ والے واقف کاروں نے ایک عرب ملک میں نوکری دلوا کر بھجوا دیا۔ دن تو پھر گئے۔ لیکن تیل کا روپیہ دیکھ کر زبیر کے گھر والوں کے دماغ بھی پھر گئے۔ یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ زبیر کتنی رقم گھر بھیجتا ہے۔ اس کا اندازہ زبیر کی بیوی اور اس کی دونوں بہنوں کے نت نئے کپڑوں اور نمود و نمائش کے اوچھے طریقوں سے ہوتا تھا۔ ایک سال بعد زبیر پندرہ دنوں کی چھٹی آیا۔ اس کے ساتھ بے شمار سامان تھا۔ یہ چیزیں درپردہ فروخت ہوئیں۔ زبیر کے گھر کی حالت ایسی ہو گئی کہ اسے امیر گھرانہ کہا جانے لگا۔

پھر زبیر ایسا گیا کہ تین سال گزر گئے لیکن وہ نہ لوٹا۔ ان تین برسوں میں زبیر کے گھر میں انقلاب آ گیا۔ پیسہ بے انداز آتا رہا اور اسی رفتار سے زبیر کی بیوی اور بہنوں کا اخلاق اور کردار بھی بگڑنے لگا۔ زبیر کے والدین سے صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے چھٹی نہیں لیتا۔ والدین خاصے پریشان تھے۔ کیونکہ ان کی بہوؤں نے انہیں بالکل خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے اب یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ میک اپ کر کے برس اٹھا کر برادری کے دو چار گھروں میں گھوم پھر آتی اور شام کو سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتی۔

گھر میں دو لڑکیاں جوان تھیں۔ وہ بھی اپنی بھابی کے نقشِ قدم پر چل پڑیں۔ اور اس سے بڑھ کر شو باز ثابت ہوئیں۔ ماں باپ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ پرانے مکان کی مرمت کروائی گئی اور محلے کے ساتھ ہی ایک خالی جگہ خرید کر

اس پر نئی طرز کا دو منزلہ مکان بنایا گیا۔

یہ ماڈرن اور بڑا شہر تھا، جہاں بڑے بڑے کھلاڑی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے زبیر کی بیوی کو اپنی کار میں لفٹ دینی شروع کر دی۔ کار اور شراب کا نشہ ایک سا ہوتا ہے۔ پرائی کار کا نشہ زبیر کی بیوی کو چڑھ گیا۔ پھر لوگوں نے جو تماشے دیکھے وہ بیان سے باہر ہیں۔ مختصر یہ کہ زبیر کی بیوی بدچلنی اور ذہنی بیہودگی کے فرق کو بھول گئی۔ جن باتوں پر غیرت مند لوگ دوسروں کے سر کھول دیتے یا اپنا سر پھوڑ لیتے ہیں۔ ان پر زبیر کی بیوی اور بہنیں فخر محسوس کرنے لگیں۔

زبیر تین سال بعد پندرہ بیس دنوں کے لیے آیا۔ اگلے روز سامان سے لدا ہوا ایک ٹرک اُن کے گھر کے سامنے آ رُکا۔ جس برادری میں وہ کم مائیگی کی وجہ سے دَب کر رہتا تھا۔ اب اُس برادری میں یوں اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ جیسے کوئی پیر و مرشد دورے پر آیا ہو۔ لوگوں کو توقع تھی کہ وہ اپنی بہنوں کی شادی کر کے جائے گا۔ لیکن ٹرک میں جو سامان آیا تھا۔ وہ بیچ بٹا کر چلا گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ زبیر اُس مقام پر جا پہنچا تھا۔ جہاں پیسہ دھرم ایمان بن جاتا ہے اور اخلاقی قدریں دُور پیچھے کہیں رہ جاتی ہیں۔ اُس کی بیوی اچھی خاصی خوبصورت تھی۔ اُس کے خیالات میں ذرا سی بھی گہرائی نہیں تھی۔ اُس کے ذہن میں صرف جسم تھا۔ جسم کی زیبائش، جسم کی فطری ضرورت، اس اخلاقی کیفیت میں خاوند اور خاندان کی عزت اور آبرو بے معنی سی چیز بن کر رہ جاتی ہیں۔

زبیر کے باپ نے برادری کے ایک دو بزرگوں سے بات کی کہ اُس کے بہو اور بیٹے کو اُس کی بیٹیوں کے بیاہ شادی کی کوئی فکر نہیں جب کہ وہ خود بیٹیوں کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ بزرگوں کے کہنے پر زبیر کے باپ نے اُسے خط لکھا کہ لڑکیوں کے رشتے کبھی کے طے ہو چکے ہیں اور وہ لوگ تقاضا کر رہے ہیں کہ شادیاں جلدی ہو جانی چاہئیں۔ زبیر کا جواب آیا کہ وہ برادری میں اپنی

بہنوں کے رشتے نہیں دینا چاہتا۔ اُس نے لکھا کہ برادری میں اُسے کوئی ایسا خاندان نظر نہیں آتا۔ جو مالی لحاظ سے ان کی برابری کر سکے۔ لہٰذا رشتہ اُس لڑکے کو دیا جائے گا جو باہر کے کسی ملک میں ملازم ہو۔

حقیقت یہ تھی کہ جن گھروں میں ان دونوں لڑکیوں کے رشتے طے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کبھی بھی یہ تقاضا نہیں کیا تھا کہ شادیاں جلدی ہوں۔ وہ تو برادری کی پابندیوں کی وجہ سے چُپ تھے۔ ورنہ وہ ان لڑکیوں کو قبول کرنے کو بھی تیار نہ تھے کیونکہ لڑکیاں شریف گھرانوں کے قابل نہیں رہی تھیں۔ انہیں جب زبیر کی طرف سے جواب ملا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

آخر بڑی لڑکی کے لیے جسے آپ عارفہ کہہ لیں، ویسا ہی ایک لڑکا مل گیا۔ جیسا زبیر چاہتا تھا۔ وہ کسی عرب ملک میں ہی ملازم تھا۔ زبیر چند دنوں کی چھٹی لے کر آیا۔ دونوں طرف باہر کا پیسہ تھا۔ شادی ایسی ہوئی کہ لوگوں نے انگلیاں مُنہ میں دے لیں۔ نوٹ ردّی کاغذوں کی طرح پھینکے گئے۔ شادی ہوئی اور عارفہ چند دنوں بعد اپنے دولہا کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی۔ زبیر کی بیوی چلنے پھرنے میں خاصی مشہور ہو گئی۔ اُس کے ساتھ دوستی لگانے کے لیے کار اور سب سے اونچے یورپی طرز کے ہوٹل میں کھانا لازمی تھا۔ زبیر کے والدین نے یہ کمال کر دکھایا کہ چھوٹی لڑکی کو اپنی زنجیروں میں باندھ لیا۔ بدنام تو وہ بھی بہت ہوئی تھی لیکن جلدی سنبھل گئی۔

بمشکل ڈیڑھ سال گزرا ہو گا کہ عارفہ باہر سے اکیلی واپس آ گئی۔ سب نے دیکھا کہ وہ اپنے سسرال تھوڑی سی دیر کو بھی نہ گئی۔ سب نے یہ بھی دیکھا وہ تقریباً خالی ہاتھ واپس آئی اور وہ بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی۔ پانچ سات دنوں بعد عارفہ کے سسرال نے یہ خبر ساری برادری اور محلے کو دے دی کہ اُن کے بیٹے نے عارفہ کو طلاق دے دی ہے پھر ساری بات کھل کر سامنے آ گئی۔

یہ قصہ کچھ اس طرح ہوا کہ عارفہ کے خاوند کی ملازمت اس قسم کی تھی کہ وہ

ہفتے میں بمشکل دو دن اپنے گھر رہ سکتا تھا۔ باقی دن اور راتیں اُسے گھر سے دُور "سائٹ" پر گزارنی پڑتی تھیں۔ اُسنے ایک دوست سے بتایا کہ وہ اپنی ڈیوٹی تبدیل کروانے کی کوشش کرے یا اپنی بیوی کو پاکستان بھیج دے۔ دوست نے وجہ یہ بتائی کہ ایک پاکستانی کبھی کبھی رات کو اُس کے گھر میں جاتے اور خاصی دیر بعد برآمد ہوتے دیکھا گیا ہے۔

خاوند نے اپنے اس دوست سے کہا کہ وہ اُس کے گھر پر نظر رکھے اور جب کبھی وہ آدمی اس کے گھر میں داخل ہو وہ اُسے ٹیلیفون پر اطلاع کر دے۔ تین چار روز بعد اُسے اطلاع ملی لیکن یہ اطلاع اُس کے دوست کی نہیں تھی۔ بلکہ پولیس اسٹیشن سے بلاوا آیا تھا۔ کمپنی کے دفتر سے اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔ ٹیلیفون پر اُسے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اُسے کیوں بلایا گیا ہے۔ رات کا وقت تھا۔ وہ کمپنی کی گاڑی پر شہر میں آیا اور تھانے چلا گیا۔ وہاں اُس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو پولیس کی حراست میں بیٹھی تھی۔

تھانے کے انچارج نے اُسے بتایا کہ بہت دنوں سے اُس کی بیوی کی رپورٹیں مل رہی تھیں کہ اُس کے پاس رات کو غلط آدمی جاتے ہیں اور آج اُسے ایک آدمی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہے۔ وہ کوئی پاکستانی تھا جو تھانے کی حوالات میں بند تھا۔

"کیا تمہاری بیوی یہ پیشہ تمہارے کہنے پر چلا رہی ہے؟" تھانے کے انچارج نے عارفہ کے خاوند سے پوچھا۔ "یا تمہیں علم ہی نہیں کہ تمہارے گھر میں تمہاری غیر حاضری میں کیا ہوتا ہے؟"

عارفہ کا خاوند جل اُٹھا۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ لیکن وہ پولیس پر غصہ نہیں نکال سکتا تھا۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے بیوی کی ذرا سی بھی وکالت نہ کی۔ اُس نے پولیس آفیسر کو بڑے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ معلوم نہیں کس خیال سے شادی کر بیٹھا تھا۔ یہ لڑکی پاکستان میں بھی بدنام تھی۔ محنت

پر کر پولیس کے مخبروں کی رپورٹوں کے مطابق عارفہ نے بیک وقت تین آدمیوں کے ساتھ ناجائز مراسم قائم کر رکھے تھے۔ اُسے حوالات میں بند کر کے اُس کے خلاف مقدمہ تیار کر لیا گیا۔ ان ملکوں میں اس قسم کے مقدمات کے فیصلے بہت جلدی کر دیے جاتے ہیں۔

انہیں سزائے قید دے کر ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ کو بھی عربوں نے چھ ماہ سزائے قید دی اور اُس کا پاسپورٹ وغیرہ ضبط کر لیا۔ سزا میں یہ بھی شامل تھا کہ قید کاٹ کر اسے ملک بدر کر دیا جائے گا۔

عارفہ چھ ماہ سزائے قید کاٹ کر وہاں کی پولیس کی نگرانی میں واپس پاکستان بھیج دی گئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے طلاق نامہ بھی پہنچ گیا۔ عارفہ نے کچھ دن سوگ منایا پھر وہ بھائی کے راستے پر چل پڑی۔ برادری میں اب اُسے کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس کے سابقہ سسرال نے اُس کی بدکاری کی کہانیاں سارے شہر میں پھیلا دیں۔ لڑکی ابھی جوان تھی اور خدا نے اُسے حسن سے بھی نوازا تھا۔ اس کی دوسری شادی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے سابقہ سسرال نے اعلان کیا کہ جہاں کہیں بھی اس لڑکی کا رشتہ ہوا وہ وہاں جا کر لڑکی کی اصلیت بتا آئیں گے۔

زبیر اور اُس کے والدین پر یہ ضرب ایسی کاری پڑی کہ چھوٹی بہن کی شادی کرتے وقت انہوں نے یہ پابندی ہٹا دی کہ لڑکا ملک سے باہر ملازم ہو۔ چھوٹی بہن پہلے ہی سنبھل چکی تھی اور برادری میں اُس کی نیک نامی مشہور ہو گئی تھی۔ اُس کی شادی واجبی سے طریقے سے کر دی گئی۔ لڑکا دریا نے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لڑکی سسرال جاتے ہی اُن لوگوں میں گھل مل گئی۔ اُس نے ایسا انداز اختیار کر لیا کہ ظاہر تک نہ ہونے دیا کہ وہ امیر کبیر گھرانے سے آئی ہے۔ وہ اپنی

اصلیت میں واپس چلی گئی۔

عارفہ اُس کے گھر اکثر جایا کرتی تھی۔ سُنا ہے کہ شاہدہ اُسے بُرے کاموں سے روکتی تھی۔ پھر پتہ چلا کہ دونوں بہنوں میں لڑائی جھگڑا ہُوا ہے۔ کچھ دنوں بعد اس جھگڑے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ عارفہ نے اپنی بہن کے خاوند پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ یہ چھوٹی بہن کا الزام تھا۔ لیکن اس پر کسی نے یقین نہ کیا۔ کیونکہ شاہدہ کا خاوند شریف انسان تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ خدا کو معلوم ہے۔ ہوا یہ کہ شاہدہ نے عارفہ کو اپنے گھر آنے سے روک دیا۔

ایک وقت تھا کہ ہر محلے میں ایک دائی ہوا کرتی تھی۔ اُس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہ اُن کا آبائی پیشہ تھا۔ ان دائیوں کو اتنا تجربہ ہوتا تھا کہ ان کے ہاتھوں بچے گھروں میں پیدا ہوتے تھے اور کوئی پیچیدگی یا خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ آج کل وہ دائیاں دیہات یا کسی قصبے میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ شہروں میں یہ کام ایسی عورتوں نے سنبھال لیا ہے جو خود کو سند یافتہ نرسیں کہتی ہیں، لیکن ایسی نرس نہ نرس ہوتی ہے نہ دائی۔ جب سے زمانے نے ترقی کی ہے۔ اکثر دلہنیں اتنی جلدی مائیں نہیں بننا چاہتیں۔ زمانے کی ترقی نے دوسرا گل یہ کھلایا ہے کہ نا جائز تعلقات بڑھ گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں غیر قانونی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں جو نہ نرسیں ہیں نہ دائیاں۔ ان میں سے اکثر درپردہ اسقاط کا دھندہ اپنائے ہوئے ہیں۔ اُن کا طریقہ غیر سائنسی ہوتا ہے۔ جس سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک عورت کو عارفہ نے اپنا راز دان بنا رکھا تھا۔ اُس کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ وہ عارفہ کے لیے آشنائی کے پیغام بھی لایا کرتی تھی۔ اس کہانی کا انجام اسی عورت نے سُنایا تھا جو کہانی سنانے والے ہم تک کے ذریعے مجھ تک پہنچا۔

جس روز شاہدہ نے عارفہ کو اپنے گھر سے دھتکار دیا۔ اُس سے اگلے ہی یہ دائی عارفہ کے پاس اُس کے ایک خفیہ دوست کا پیغام لائی۔ عارفہ ایسے پیغام

بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ لیکن اُس روز اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا ہو گیا ہے؟" دائی نے اُس سے پوچھا۔

"ویسے ہی خیال آ گیا ہے کہ میری بھی کیا زندگی ہے؟" عارفہ نے کہا۔ "میں کل رات ایک بڑی خوبصورت طوائف کا قصّہ پڑھ رہی تھی۔ جس پر اُسے چاہنے والے سونے چاندی کا مینہ برساتے تھے۔ لیکن اُس کی عمر ابھی تیس سال ہوئی تھی کہ اُس کے اُمیدوار جھڑنے لگے اور وہ اُن کا راستہ دیکھتی رہی۔ میں اس سوچ میں غرق ہو گئی کہ چند برس بعد میں ان لوگوں کے لیے جو مجھے پیغام بھیجتے ہیں۔ بوڑھی ہو جاؤں گی۔ آج جو میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ کل میں انہیں ڈھونڈتی پھروں گی۔"

دائی نے اُس کا دل رکھنے کے لیے اُس کے ساتھ دو چار باتیں کیں۔

"تمہاری باتیں اب مجھے تسلّی نہیں دے سکتیں۔" عارفہ نے آہ بھر کر کہا۔ "آج میری سگی بہن نے مجھ پر یہ الزام لگا کر اپنے گھر آنے سے روک دیا کہ میں اُس چارپائی پر بیٹھ گئی تھی، جس پر اُس کا خاوند بیٹھا ہُوا تھا... خالہ! میرے پاس ابھی بہت کچھ ہے، جوانی ہے، حُسن ہے اور پیسہ بھی ہے۔ کسی بھلے آدمی کے ساتھ میری شادی کرا دو۔ ہر کوئی جو مجھے جانتا ہے، اگر مجھے بدنام کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔ مگر میری سگی بہن نے مجھ پر جو جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میری بہن کو بھی مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"عارفہ بیٹی!" دائی نے کہا۔ "صرف تم ہی نہیں ہو جس کی میں رازدار ہوں۔ میرے سینے میں گھر گھر کے راز محفوظ ہیں۔ تمہارے متعلق دوسرے گھروں میں جو باتیں ہوتی ہیں۔ وہ مجھ سے سن لو لیکن کیا کرو گی سن کر۔ میں تمہیں سیدھی سی بات کہہ دیتی ہوں۔ تمہیں جو کوئی قبول کرے گا۔ وہ تھوڑی سی دیر کے لیے کرے گا۔ اگر تم کسی کی بیوی بن بھی گئیں تو دو چار دنوں ہی میں تمہاری یہ کہانیاں تمہارے سسرال تک پہنچ جائیں گی۔ یہ تو میں بھی کہوں گی کہ تمہاری نجات صرف شادی میں ہے، لیکن تم خود جانتی ہو کہ تمہاری شادی ہو سکے گی یا نہیں۔"

دائی نے اُس کے سامنے اُس کے مستقبل کی تصویر ایسی بھیانک بنا کر رکھی کہ عارفہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر کچھ عارفہ نے کہا، کچھ دائی نے کہا اور عارفہ نے بیساختہ کہا کہ اُسے جیسا کیسا خاوند بھی مل جائے وہ قبول کرلے گی اور اُس کی وفادار رہے گی۔

جس طرح عارفہ نے یہ بات بے ساختہ کہی تھی ایسی ہی بے ساختگی سے دائی نے کہا۔ "ویسا خاوند میرا بیٹا ہے۔"

"عارفہ نے چونک کر حیرت سے دائی کی طرف دیکھا۔

"عارفہ بیٹی!" دائی بولی: "میرے دل میں تمہاری ہمدردی ہے۔ لیکن تم مجھے خود غرض کہو گی۔ تم جو کچھ بھی کہو مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو۔ معلوم نہیں تم جانتی ہو یا نہیں کہ میرا ایک بیٹا ہے۔ اُس کی عمر تم سے سال چھ ماہ کم یا زیادہ ہو گی وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ تب میں جوان تھی۔ مَیں صاف بتاتی ہوں کہ خاوند کے مرنے کے بعد میں نے بھی تمہاری طرح دو ستیاں لگائی تھیں۔ لیکن شادی کی بات جس کے ساتھ بھی کی، اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ مَیں فوراً سمجھ گئی اور دائیوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر اپنی زندگی اپنے بچے کے لیے وقف کر دی۔ جس طرح مَیں آج تمہیں شرافت کا ایک راستہ دکھا رہی ہوں۔ اسی طرح ایک بوڑھی دائی نے مجھے خبردار کیا تھا اور مَیں سنبھل گئی تھی....

"مَیں نے اپنے بیٹے کو بی۔ اے کرایا۔ ایک تو یہ دائیوں کا کام تھا جو مَیں نے کیا، دوسرا کام یہ تھا جو مَیں تمہارا کرتی رہی ہوں یعنی خفیہ پیغام رسانی۔ اس کام میں بھی مَیں نے بہت پیسے کمائے اور اپنے بیٹے کے مستقبل پر خرچ کیے۔ بی۔ اے کرنے کے ایک سال بعد اُسے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ہم ماں بیٹا ہی تھے، کوئی لمبے چوڑے اخراجات نہ تھے بیٹے نے کئی مرتبہ کہا کہ ماں، اب تم گھر بیٹھو۔ مَیں تمہاری خدمت کروں گا۔ لیکن فارغ بیٹھنا مجھے اچھا نہ لگا۔ مَیں نے بیٹے سے کہا تمہاری شادی کر کے گھر بیٹھوں گی، لیکن

عارفہ بیٹی! اُسے کوئی بھی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ میرے اپنے دُور پار کے رشتہ داروں نے بھی صاف جواب دے دیا ہے۔"

"کیوں؟" عارفہ نے پوچھا "اُس کی تنخواہ تھوڑی ہے یا وہ بدصورت ہے؟"

"تنخواہ اتنی زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تھوڑی بھی نہیں کہ کوئی غریب گھرانہ اسے تھوڑی کہے۔" دائی نے کہا۔ "اور وہ بدصورت بھی نہیں۔ اُس میں دو جسمانی نقائص ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کی بائیں ٹانگ دائیں سے دو تین انچ چھوٹی ہے اور اُس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ٹیڑھی ہو کر اکڑ گئی ہیں۔ رشتہ دینے والے یہی نقص بتا کر جواب دے دیتے ہیں۔ اگر تم اُس کا جسم اور اُس کی شکل و صورت دیکھو تو اُسے پسند کرو گی، لیکن تم شہزادی ہو اور وہ غریب بیوہ کا بیٹا ہے۔ سوچ لو عارفہ مَیں نے زمانہ دیکھا ہے۔ لوگوں کو اُٹھتے اور گرتے دیکھا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں قبول کرنے والے بہت ہیں بیوی بنانے والا کوئی نہیں۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دائی بہت چالاک عورت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دائی نے عارفہ کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا یہ ایک انقلاب تھا یا معجزہ تھا کہ عارفہ نے دائی کے بیٹے کے ساتھ بڑی خاموشی سے شادی کر لی اور دونوں اس شہر سے غائب ہو گئے۔ دائی نے بعد میں سب کو بتایا۔ یہ معاملہ اس طرح طے ہوا تھا کہ عارفہ نے دائی سے کہا تھا کہ اُس کا بیٹا اُسے اس شہر سے کہیں دُور لے جائے جہاں وہ اپنا کوئی کاروبار کر لے۔

دائی نے اُسے دُور کے ایک قصبے کا نام بتایا اور کہا کہ وہاں اُس کے عزیز رشتہ دار رہتے ہیں۔ جو اُس کے بیٹے کا کاروبار بھی چلا دیں گے۔ عارفہ خاصی رقم اور اپنا زیور ساتھ لے گئی تھی۔

اس واقعہ کو سات آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ عارفہ نے نیک نام بن کر دکھایا ہے اور اپنے خاوند کو کاروبار میں کامیاب کروا دیا ہے۔ اُس کے دو بچے بھی ہیں اور محلے والے اس گھرانے کو شریف گھرانہ کہتے ہیں۔

پچھتاوا

خدا نہ کرے آپ کا واسطہ کبھی عدالتوں سے پڑے اچھے یا بُرے کسی بھی مقصد سے ایک مرتبہ عدالتوں کا رخ کر لینے کے بعد آدمی کو واقعی خدا یاد آجاتا ہے۔

میرا قصور صرف یہ تھا کہ مَیں نے زخمی کو سڑک سے اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا اور پچھلے تین ماہ سے اس انسانی ہمدردی کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ دس پندرہ دن بعد مجھے گواہی کے لیے طلب کر لیا جاتا اور دو تین گھنٹے انتظار کروانے کے بعد دس پندرہ دن کی اگلی تاریخ دے کر رخصت کر دیتے۔

اس روز بھی اس چکر میں عدالت کا طواف کر رہا تھا۔ جب حوالاتیوں کی لاری کچہری میں داخل ہوئی۔ لاری اُسی عدالت کے قریباً سامنے آکر ٹھہری جس میں میری تاریخ پڑتی تھی۔ میں یہاں قریباً ایک گھنٹے سے کھڑا مکھیاں مار رہا تھا۔ اب جو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا تو میں بھی دوسرے انتظار کنندگان کی طرح اُس میں محو ہو گیا۔

جی ہاں۔ یہ دلچسپ نظارہ ہی تو تھا۔ لاری سے اُترتے ہوئے ملزموں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا۔

لاری سے اُترتے ہوئے اکثر ملزم تو ایسے تھے۔ جنہیں دیکھ کر رحم کے بجائے رشک آتا تھا کہ جیل نے ان لوگوں کو کتنا صحت مند اور باوقار بنا دیا ہے، کچھ بے چارے ضرور ایسے تھے جو واقعی مجبور ملزم نظر آرہے تھے۔

پہلے قسم کے ملزم ایک شان تفاخر سے لاری سے قدم باہر نکالتے اور پہلے سے

منتظر اپنے اعزا کے ساتھ اس طرح نعرہ مار کر مصافحہ یا معانقہ کرتے جیسے کوئی بڑا کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہو جبکہ دوسری قسم کے بے چارے سر جھکائے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور ضمیر پر گناہوں کا بوجھ سنبھالے لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلتے اور وہاں پہلے سے موجود ناظرین سے نظریں ملانے سے احتراز برتتے تھے۔

مَیں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے ہر قسم کے ملزمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک میری نظریں ایک چہرے پر ٹھہر گئیں۔ مَیں کوشش کے باوجود اُس چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔

کون ہے یہ ؟ مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور میرے قدم خود بخود اُس کی طرف بڑھنے لگے۔ جو حالت اس کی نظر آرہی تھی۔ اُس سے مَیں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس قسم کے ملزموں کو گارد کے سپاہی احاطہ کچہری کے کسی باغیچے میں نہیں بٹھائیں گے بلکہ سیدھے یہاں موجود حوالات میں لے جا کر اُس وقت تک بند رکھیں گے۔ جب تک کہ اُن کے نام کی آواز عدالت سے نہ آئے۔

کچہری کی حوالات کی طرف جاتے ہوئے مجھے جیسے ساری بھولی ہوئی کہانی یاد آگئی یہ وسیم تھا۔

میرا ہم جماعت اور سکول کی آنکھ کا تارا وسیم۔ قدرت نے اس میں کسی بات کی بھی تو کمی نہیں رکھی تھی۔ امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، اور ہر طرح ذہین اور فطین، سکول کی کوئی ٹیم بھی اُس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ میٹرک کے بعد ہم الگ ہو گئے۔ میری اُس سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ گردش حالات نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اسے پھر مل سکوں میں دوسرے کسی شہر کے کالج میں پڑھتا تھا۔

وسیم سے میری ملاقات پھر اُس روز ہوئی جب مَیں نے قریباً آٹھ سال بعد ایک اخبار میں اس کی تصویر اس خبر کے ساتھ دیکھی۔

اپنی معصوم بچی کو گلا دبا کر مارنے والا "شقی القلب باپ پولیس کی حراست میں۔"

اُف میرے خدایا ! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر سوچا یہ کوئی اور وسیم ہوگا۔ میرا ہم جماعت وسیم ہرگز نہیں ہوسکتا۔ لیکن میرے ایسا سوچنے سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ وسیم ہی تھا۔ میرا ہم جماعت اور سارے سکول کی آنکھوں کا تارا۔

دو تین سال پہلے مجھے اس کی شادی کی خبر تو ملی تھی۔ لیکن یہ کیا ؟ وہ ایسا شقی القلب بھی ہوگا۔ مَیں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ دل کڑا کر کے مَیں نے خبر کی تفصیل بھی پڑھ لی لیکن یہ خواہش بڑی شدت سے میرے اندر پیدا ہو رہی تھی کہ خود اس کی زبانی صحیح واقعات جان سکوں، لیکن یہ خواہش بھی دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

مزید دو تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ میرا تبادلہ اُسی شہر میں ہوگیا۔ جب یہاں آیا تو بھولی ہوئی کہانی پھر یاد آگئی اور سوچا کہ وسیم کا حال دریافت کروں۔ یہی عزم لے کر مَیں ایک روز جب اس کے گھر پہنچا تو اس کے والد سے ملاقات ہوگئی۔

آج سے آٹھ دس سال پہلے جب مَیں نے اس کے والد کو دیکھا تھا تو کبھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص بوڑھا بھی ہوگا اور آج جب مَیں نے اسے دیکھا تو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ شخص زندہ بھی ہے۔

ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک بوڑھے اور نڈھال مریض نے جس کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ اپنا ناتواں اور لرزتا ہوا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

"کون ہو تم بیٹا؟" انہیں بولنے میں بھی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

"مَیں وسیم کا دوست ہوں انکل۔" مَیں نے اپنا تعارف کروایا۔

"وہ ! وہ تو، وہ تو مر گیا ہے بیٹا ! وہ تو ...." میری بات سنتے ہی ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ شدّت جذبات سے ان کا بدن لرزنے لگا تھا اور وہ اپنی بات ابھی مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ ان پر کھانسی کا شدید حملہ ہوگیا۔

اس صورتِ حال نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کروں مَیں کو ان کے سامنے مجرم سمجھنے لگا تھا جیسے یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہوا ہو۔

ان کے بے تحاشہ کھانسنے کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے ایک ملازم اور ایک نوجوان عورت بھاگے بھاگے اس کمرے میں آئے اس لڑکی پر جسے حالات نے وقت سے پہلے ہی عورت بنا دیا تھا۔ نظر پڑتے ہی میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ یہی وسیم کی بیوی ہے۔ لیکن یہ یہاں کیا کر رہی ہے ؟ اب یہ سوچ مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔

وسیم کی بیوی نے مریض کے سرہانے رکھی دوائیوں کی شیشیوں کی قطار میں سے ایک شیشی باہر نکالی اور اس میں سے دوائی انڈیل کر انہیں پلائی تو مریض کو جیسے سکون آگیا۔

"معافی چاہتا ہوں بزرگوار آپ کو میری وجہ سے ....، مَیں نے کہنا چاہا لیکن میری بات ادھوری ہی رہی۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب انکل کو اکثر ایسا دورہ پڑتا ہے۔ آپ ذرا ادھر تشریف لے آئیں۔ اس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

مَیں محسوس کر رہا تھا کہ شاید وہ کوئی نشہ آور دوا تھی۔ کیونکہ وسیم کے والد پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔

مَیں شرمندہ سا اس کی راہنمائی میں دوسرے کمرے میں آگیا مَیں خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ دو منٹ بھی مزید یہاں ٹھہر سکوں، لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں رکا رہا۔ وسیم کی بیوی نے مجھے سارے واقعات سنائے۔

وسیم کی بیوی اس کے رشتہ کی خالہ زاد بہن بھی تھی اور خاصی ایڈوانس فیملی سے اس کا تعلق تھا۔ وسیم سے شادی کے بعد بھی اس کی عادات میں کوئی تبدیلی نہ آئی وہی مخلوط محفلوں میں آنا جانا ہوٹلوں اور سینماؤں کے چکر اور ہر محفل میں خود کو نمایاں کرنے کی عادت جو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اب بھی جوں کی توں برقرار رہی۔

ایسے ماڈرن خاندان کی لڑکیوں میں ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کو اپنی سہیلیوں میں متعارف کرواتی ہیں اور خود اپنی سہیلیوں کے خاوندوں

سے تعارف حاصل کرنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ مقصد سوائے خود کو نمایاں کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن بسا اوقات معصومیت میں کی جانے والی حرکات کتنی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ عموماً اس وقت ہوتا ہے۔ جب پانی سر سے گزر چکا ہو۔

وسیم کی بیوی کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا۔ اس نے فوزیہ سے اپنے خاوند کا تعارف اپنی سوسائٹی میں مروجہ اخلاقیات کے مطابق ہی کروایا تھا۔ یہ الگ بات کہ وسیم کی دلچسپی فوزیہ میں بڑھنے لگی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ فوزیہ عام شکل وصورت کی لڑکی تھی اس نے اپنے پہلے ہی تعارف میں اپنی باتوں اور ناز نخرے کا جادو وسیم پر چلا دیا۔ اس دوران وسیم کے گھر ایک بچی بھی پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ گمراہی کے جس دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اس سے باہر نکلنے کے بجائے اس میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اپنی بیوی میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگی اور فوزیہ میں بڑھنے لگی۔ دونوں میں شادی کے عہد و پیمان بھی ہو چکے تھے کہ وسیم ہاں بچی کی پیدائش نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

فوزیہ نے اس کے سامنے نئی شرط رکھ دی کہ وہ وسیم سے اس وقت شادی کرے گی جب وہ اپنی بچی اور بیوی سے نجات حاصل کرلے۔ اس دوران وسیم کی جذباتی حالت بڑی عجیب سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر کسی نے کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہو۔ اس نے زندگی میں کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ لیکن اب شدت سے شراب نوشی بھی شروع کر دی۔ پھر شراب بھی اس کو سکون نہ دے سکی تو منشیات کا استعمال اس نے شروع کر دیا۔

اس کی بدقسمت بیوی نے مجھے بتایا کہ ایک روز نشے کی حالت میں وہ فوزیہ کے گھر چلا گیا اور اس سے بضد ہوا کہ ابھی وہ اس کے ساتھ نکاح کرے۔ فوزیہ نے شاید جان چھڑانے کے لیے اسے کہہ دیا کہ وہ اس کی جائداد میں کسی کا حصہ برداشت نہیں کر سکتی۔ کل جب اس کی بیٹی جوان ہو گئی تو اس کی مطلقہ بیوی کی اولاد ہونے کے ناطے جائداد میں اپنا حصہ مانگے گی۔ وسیم نشے کی حالت میں تھا۔ اس کے دماغ میں نہ

جانے کیا بات سمائی۔ وہ اپنے اور فوزیہ کے درمیان اپنی بچی کو رکاوٹ سمجھنے لگا۔ فوزیہ کے ہاں سے وہ سیدھا اپنے گھر آیا۔ بچی کی ماں کسی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وسیم نے پاگل پن کی کیفیت میں اپنی دو سالہ معصوم بچی کا گلا دبا دیا اور اسے مار کر جنونی کیفیت میں گھر سے نکل گیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے اور نشہ اترنے لگا تو اسے ہوش آیا اور احساس ہوا کہ اس سے کتنا گھناؤنا جرم سرزد ہوا ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح رونے اور پیٹنے لگا۔ لیکن اب صرف پچھتاوا باقی رہ گیا تھا۔

جب بچی کی بدقسمت ماں گھر واپس آئی اور اس نے بچی کی لاش دیکھی تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی اور کئی دن تک اس کیفیت کا شکار رہی۔ ہوش حواس کی دنیا میں واپس لوٹنے کے بعد جب اسے یہ علم ہوا کہ اس کی بیٹی کا قاتل کوئی اور نہیں۔ اس کا سہاگ ہی ہے۔ تو اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔

بھرا پرا گھر لٹ گیا۔ وسیم کے والد پر پہلے دل کا دورہ پڑا پھر فالج کا حملہ ہوا۔ انہوں نے ایک ہی ضد باندھ لی تھی کہ وہ اب مرتے دم تک وسیم کی شکل نہیں دیکھیں گے۔

اس کی بیوی کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ اس نے اپنے والدین کے بضد ہونے کے باوجود اپنا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا اور وسیم کے باپ کی تیمارداری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور یہیں کی ہو رہی۔

● وسیم کے مقدمے کی کسی نے پیروی نہ کی۔ اس بات نے تو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تو پہلے ہی احساس گناہ کے جہنم میں جل رہا تھا۔ اپنے گوشہ جگر کو اپنے ہاتھوں موت کی نیند سلانے کے بعد وہ خود بھی زندہ درگور ہو چکا تھا۔ اس نئی خبر نے اس پر بہت برا اثر کیا۔ وہ تو اپنے گھر والوں کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن گھر والے اسے یہ موقع ہی دینے کو تیار نہ تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہنستا کھیلتا وسیم اب نیم پاگل ہو چکا تھا۔ پہلے پہل تو اخباروں میں اس کے متعلق کچھ پڑھنے سننے کو مل جاتا تھا۔ ریمانڈ کاٹنے کے بعد عدالت نے اسے جیل کی

حوالات کے سپرد کر دیا اور اب وہ نیم دیوانگی کی کیفیت میں تاریخیں بھگت رہا تھا۔

مَیں خود میں اتنا حوصلہ بھی نہیں پاتا تھا کہ اُس سے جیل میں ملاقات ہی کر سکوں۔ اُس شہر میں مجھے کئی ماہ بیت گئے۔ مَیں نے اس کے گھر سے آنے کے بعد اُسے بالکل بُھلا دیا تھا لیکن آج جب وہ اچانک میرے سامنے آیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ مَیں حوالات کے دروازے پر جا پہنچا۔ وہ حوالات کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ اُسے نہائے شاید کئی ماہ بیت گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کی وہ چمک جو اُس کی شخصیت کا خاصہ تھی، ماند پڑ چکی تھی۔ میں بھی دوسرے "ملاقاتیوں" کی طرح حوالات کی سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پہرے پر موجود سنتری نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر گردن جھکا لی۔

میں نے وسیم کا نام لے کر اُسے آوازیں دیں لیکن وہ بالکل لاتعلق بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔ شاید اپنا کھویا ہوا ماضی تلاش کر رہا تھا۔ "باؤ جی یہ تو سائیں لوگ ہے۔ بس یونہی چپ بیٹھا رہتا ہے نہ کسی سے بولتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔" ایک حوالاتی نے مجھے بتایا۔

میں بڑا دکھی ہو کر واپس مڑا ہی تھا کہ وسیم کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں آئے گا" اور اس نے اس فقرے کی تکرار شروع کر دی پھر خاموش ہو کر دوبارہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔ میں وہاں سے ہٹا اور بوجھل قدموں سے عدالت کا رُخ کیا۔ جہاں میرے نام کی آواز پڑنے والی تھی۔

کرموواردا تیا

کرموواردا تیے سے میری پہلی ملاقات بڑی ہنگامہ خیز تھی!

مَیں موٹر سائیکل پر کسی کام سے جا رہا تھا لاہور کی ایک ماڈرن آبادی کی کشادہ اور مضبوط لیکن ویران سڑکوں پر میں بظاہر سامنے سے آنے والی ٹریفک سے لاپرواہ موٹر سائیکل اڑائے چلا جا رہا تھا۔

گرمیوں کی جان لیوا دھوپ اور اس پر گرم لُو۔ مجھے علم تھا کہ اس قیامت کی گرمی میں ان شاندار اور ٹھنڈے بنگلوں سے کوئی باہر جھانکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔

سڑکوں پر انسان تو کیا کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن اچانک ہی مَیں گڑبڑا کر رہ گیا اگر چند سیکنڈ کی غفلت ہو جاتی تو مَیں کسی پولیس سٹیشن میں اور سڑک کے درمیان موجود راہگیر ہسپتال میں ہوتا۔

وہ اچانک ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے اس کی سائیکل گری پڑی تھی اور قریباً درمیان میں تپتی ہوئی سڑک پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ مَیں نے پورا زور لگا کر موٹر سائیکل روک لی۔ پہلے تو جی چاہا کہ جہنم میں جائے سب کچھ میری بلا سے۔ چپ چاپ نکل جاؤں۔ اگر یہ زخمی ہے تو مَیں نے نہیں کیا۔ اگر کوئی مریض ہے تو بھی میں اس کی مسیحائی کرنے سے رہا۔ لیکن انسانی ہمدردی کا جذبہ آڑے آیا اور میں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے پیدل چلتا اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی شاید مرگی کا دورہ تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول

گئے۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کروں کیا نہ کروں ؛ پھر اچانک جیسے ایک کوندا سا میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے یاد آگیا۔ بچپن میں سُنا تھا کہ مرگی کے مریض کو اگر چمڑے کا جوتا سونگھا جائے تو وہ نارمل ہوجاتا ہے۔

اسی خیال کے تحت اپنے پاؤں پر نظر ڈالی تو اپنا سامنہ لے کر رہ گیا کہ میرے پاؤں میں ربڑ کے بجائے کینوس کے جوتے تھے۔ یہ مشکل بھی اسی نے حل کردی کیونکہ مرگی زدہ نے پاؤں میں دیہاتی گرگابی پہن رکھی تھی۔ مَیں نے اس کے پاؤں سے جوتی کھینچ کر الگ کی اور اسے سونگھائی چند ہی منٹ بعد وہ نارمل ہوگیا۔

پسینے میں وہ بُری طرح نہا رہا تھا میری اپنی حالت بھی اس سے کوئی مختلف نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح اسے سہارا دے کر میں قدرے سایہ دار جگہ پر لے آیا۔ اب ایک نئی بپتا آن پڑی۔ اس نے اوسان بحال ہوتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا میرا جی چاہا کہ فوراً بھاگ جاؤں لیکن اب تو بھاگنے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی تھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں رکا رہا اور اسے حوصلہ دے کر چپ کروایا۔

"بابو جی ! مزدور آدمی ہوں۔ صبح سے مزدوری ڈھونڈھ رہا تھا۔ گھر بچہ بیمار ہے لیکن میری قسمت ؛ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ رونے کا اسٹارٹ لینا چاہا۔ لیکن اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں تھا۔

مَیں نے اپنی جیب سے دل کڑا کر کے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی مٹھی میں "زبردستی" تھما دیا کیونکہ موصوف خیرات لینے سے انکاری تھے۔ اسے حوصلہ دیا اور خدا خدا کر کے گھر پہنچا۔

اس واقعے کے قریباً تین چار ماہ بعد کا ذکر ہے کہ مَیں اپنے ایک عزیز کی دکان پر کسی کام سے بیٹھا تھا۔ یہ دکان خاصی آباد اور کاروباری لحاظ سے مصروف مارکیٹ میں تھی۔ دکان کے نزدیک دھڑام سے کسی شے کے گرنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دیکھا تو ایک بیچارہ گول گپے بیچنے والا اپنے خوانچے سمیت جو اس نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ زمین بوس تھا۔ اس کے گول گپے کھٹائی والے مٹکے اور لوہے کی تاروں کا خوانچہ

ٹوٹ چکا تھا۔

میرا عزیز دکاندار بھاگ کر میرے ساتھ اس کی مدد کو لپکا ہم نے اُسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ میرے عزیز دکاندار کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ مقامی دکانداروں کے تعاون سے چندہ کر کے اس کا نقصان پورا کرنے کی مہم شروع کرنے لگے۔ ابھی انہوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار وہاں اکٹھے ہوجانے والے دکانداروں کے سامنے کیا ہی تھا کہ ایک نوجوان مجھے پیچھے ہٹا کر سامنے آگیا۔

"میاں جی ! کیا کر رہے ہو۔" اس نے میرے عزیز کی طرف دیکھنے کے بجائے مظلوم گول گپے والے کی طرف دیکھ کر کہا ؛ "یہ تو فراڈیا ہے۔"

اب جو مَیں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو یاد آگیا کہ یہی وہ موصوف ہیں جو اس سے پہلے مرگی کا ڈرامہ رچا کر مجھے بے وقوف بنا چکے ہیں۔

یہ میری اور کرمو وارداتیے کی پہلی "باقاعدہ ملاقات" تھی۔ اپنی شخصیت کے انکشاف پر اس نے نہ تو بُرا منایا نہ کسی گھبراہٹ کا اظہار کیا، بلکہ اس نوجوان کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ جس نے اس کی اصلیت ظاہر کردی تھی۔ وہ گلہ کر رہا تھا کہ انکشاف کرنے والے نے اس کی دیہاڑی مروادی ہے۔

اسی نوجوان نے جب یہ بتایا کہ اس فراڈیے کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ تو مَیں متجسس ہوا۔ یہ جاننے کے لیے کہ آخر وہ ایک معزز گھرانے کا فرد ہوتے ہوئے فراڈیا کیوں بن گیا۔ اس نوجوان سے جب میں نے کرمو کا پتہ دریافت کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اور بولا ؛ "جناب آپ شریف آدمی ہیں کس چکر میں پڑنے لگے ہیں۔"

نوجوان نے نصیحت اچھی کی تھی۔ لیکن مَیں اپنی متجسس طبیعت کے ہاتھوں مجبوراً اس چکر میں پڑ گیا۔ کرمو کی شکل سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی غلط آدمی ہے عام حالات میں وہ ایک معزز نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ جتنا کامیاب فراڈیا تھا۔ اس سے مجھے یہ حیرت ضرور ہوئی کہ وہ ایسے گھٹیا فراڈ کیوں کرتا ہے ؟ کوئی لمبا ہاتھ کیوں نہیں مارتا ؟

یہی سوال لے کر ایک روز میں اس کے گھر پہنچا۔

اندرون شہر کی پُر پیچ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں دھکے کھانے کے بعد جب مَیں ایک بوسیدہ مکان تک پہنچا تو دروازہ کھٹکھٹانے پر جس شخصیت نے میرا استقبال کیا۔ اُسے دیکھنے کے بعد یقین نہیں آتا تھا کہ کرمو اس بزرگ عورت کا بیٹا ہوگا۔ میرے منہ سے کرمو کا نام سُنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بے چاری نے یہی سمجھا ہوگا کہ مَیں اس کا کوئی "شکار" ہوں، لیکن میرے یہ تسلی دلانے پر کہ "ایسی کوئی بات نہیں" اس بے چاری نے سکھ کا سانس لیا۔

کرمو، جب اس اطلاع پر باہر آیا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے تو اسے یہی امّید تھی کہ آنے والا یا تو تھانے کا کوئی پیامبر ہوگا یا پھر اس کا کوئی "شکار"، جس نے کرمو کا سراغ لگا لیا ہے۔ لیکن اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گیا۔

"کیا بات ہے جناب؟" اس نے بڑے شریفانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کچھ بات نہیں بھائی صاحب بس آپ سے ملنے کا شوق ہے۔"

یہ میرا اور کرمو وارداتیے کا پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس کی حیرانگی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ آخر میٹرک پاس فراڈیا تھا اور انسانی نفسیات پر خاصی دسترس بھی اسے حاصل تھی۔ جلدی سمجھ گیا کہ مَیں نہ تو کوئی مخبر ہوں نہ خفیہ پولیس کا آدمی بلکہ اس کا ایک طرح سے "مداح" ہوں۔

مَیں اسے چائے کے ایک معمولی سے ہوٹل پر لے آیا۔ جہاں پہلے سے موجود لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ شکل سے تو میں بہرحال شریف آدمی نظر آ رہا تھا اور کسی شریف آدمی کا کرمو وارداتیے کے ساتھ کیا کام؟ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنے متعلق کوئی بات مجھے نہیں بتائے گا۔

بڑا گہرا آدمی تھا۔ میرے لاکھ کریدنے اور گھما پھرا کر بات کرنے کے باوجود

میرے قابو نہ آیا۔ ہم کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ وہ میٹرک پاس ہے۔ مَیں نے کہا اچھا صرف یہی بتا دو کہ اتنے کامیاب اداکار بننے کے باوجود تم صرف معمولی اور گھٹیا قسم کے فراڈ ہی کیوں کرتے ہو۔

میری بات سُن کر اس نے دانشوروں کی طرح سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہنا لگا۔ "سر! چھوٹی کشتیوں کو کنارے کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ یہ بڑا گہرا سمندر ہے۔ بڑے بڑے مگرمچھ موجود ہیں اس میں۔ میرے جیسی چھوٹی مچھلی کی ان کے نزدیک اہمیت ہی کیا ہے۔"

مَیں نے کہا: "یار اتنی سمجھداری کی باتیں کرتے ہو تمہارا تعلق بھی شریف گھرانے سے ہے۔ پھر کیوں ایسے گھٹیا کام کرتے ہو، لعنت بھیجو۔ مَیں تمہیں نوکری دلا دیتا ہوں۔"

میری بات سُن کر اس نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا: "سر! اب میں اس کمبل چھوڑنا بھی چاہوں تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ آپ سمجھدار آدمی ہیں۔ ایک مرتبہ پولیس کے کاغذوں میں آنے کے بعد کوئی لاکھ شریف بنتا رہے۔ یہ لوگ کبھی تسلیم نہیں کرتے کبھی معاف نہیں کرتے اُسے۔"

یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک جہان کی یاسیت سمٹ آئی۔ میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ کئی دن تک کرمو میرے ذہن پر سوار رہا۔ پھر میں کاروبارِ حیات میں ایسا الجھا کہ کرمو حرفِ غلط کی طرح ذہن کی تختی سے مٹنے لگا۔

ایک روز وہ پھر میرے لاشعور سے نکل کر اخبار کے صفحات پر میرا منہ چڑانے لگا۔ اس مرتبہ وہ کسی کے "نوٹ دوگنے کرتے ہوئے" پکڑا گیا تھا۔ مَیں نے سرسری انداز سے خبر پڑھی اور کرمو کو یاد کر کے بھول گیا۔

اس واقعے کے تقریباً تین چار ماہ بعد میں ایک بس سٹینڈ کے نزدیک کھڑا تھا کہ ایک شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف مخاطب کیا میں گھوما اور جس شکل سے واسطہ

پڑا۔ وہ میرے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی تھی۔

پولیس کا سپاہی مجھ سے مخاطب تھا۔ وہ آپ کو بلا رہا ہے۔ اس نے سڑک کے ایک سائیڈ پر کھڑے تانگے کی طرف اشارہ کر کے مخاطب کیا۔

تانگے کی طرف نظر اُٹھائی تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پچھلی سیٹ پر دو سپاہی بیٹھے مجھے گھور رہے تھے۔ مَیں ڈرتا ڈرتا وہاں تک پہنچا۔

تانگے کی اگلی سیٹ پر کرمو ایک سپاہی کے ساتھ منہ سر چادر میں چھپائے بیٹھا تھا۔ مَیں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے پہچان کر تانگہ رکوایا ہوگا اور یہ بھی کہ اس کی ضروریات کیا ہیں ؟

"باؤجی اب مَیں یہ سارا دھندہ چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے نادانستگی میں بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مَیں حیرت سے اس کا مُنہ دیکھنے لگا کرمو جرم جس کی فطرت بن چکا تھا۔ مجھے کیا کہہ رہا ہے ؟ مَیں نے سوچا اور پولیس کے سامنے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مَیں نے اسے کچھ پیسے دیے اور کہا کہ میں کچہری اس سے ملنے آؤں گا۔ اس کی عدالت پوچھ کر مَیں چلا گیا۔

دوپہر کو جب کچہری پہنچا تو کرمو دوسرے ملزموں کے ساتھ ایک باغیچے میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ سردی اس روز کچھ زیادہ ہی تھی۔ مَیں نے یہاں کے دستور کے مطابق چائے منگوائی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ گارد کے سپاہی چائے پینے میں مگن تھے اور کرمو آج کچھ کہے سنے بغیر ہی مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

"باؤجی !" اس نے کہا "پچھلے دو مہینے سے ہاتھ بہت تنگ تھا اور نیا تھانیدار جان کو آ رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ جوان لوگوں کے کاغذات میں آ گیا۔ اس کی جان چھٹتی ہی نہیں۔ مَیں نے لاری اڈے پر ایک اسامی تاڑی ایک دیہاتی سا آدمی تھا۔ خدا کی قسم مجھے علم نہیں تھا کہ یہ اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔

لالچ بُری چیز ہے باؤجی ! وہ بھی میری طرح لالچی نکلا اور پیسے دوگنے کروانے

پکڑ میں میرے ہاتھوں لٹ گیا۔ مَیں نے واردات دوسرے علاقے میں کی تھی۔ خدا جانے ایک پولیس ٹاؤٹ نے کیسے مجھے پہچان لیا اور اگلے روز میں پکڑا گیا۔ اس دوران ساری رقم مَیں نے بانٹ دی تھی۔"

اتنا کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے آنکھوں میں آئے آنسو ضبط کرتے ہوئے مجھے کہا : "باؤجی۔ وہ بے چارہ جو میرے ہاتھوں لٹا تھا۔ دل کا مریض تھا کہ اس نے اس کی جان لے لی کہ اب وہ گاؤں واپس جا کر کیا منہ دکھائے گا۔

وہ روتے ہوئے میرے سامنے قسمیں کھانے لگا کہ اُسے علم نہیں تھا کہ وہ غریب بوڑھا اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔ مَیں نے اُسے حوصلہ دیا اور تلقین کی کہ اگر سچے دل سے تائب ہو گیا تو اللہ اُس کے گناہ ضرور بخش دے گا ضرورت اس بات کی ہے کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے۔

باؤجی ! اُس نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا : "کرمو وار حوالیا مر گیا ہے۔ اب مَیں صرف کرم دین ہوں۔ صرف کرم دین۔"

مَیں اُسے حوصلہ دے کر آ گیا۔ اس بات کی مجھے بے حد خوشی تھی کہ اللہ نے بالآخر اسے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے دی۔ وہ پہلے بھی بُرا انسان نہیں تھا۔ زبردستی سے اُس نے خود پر ایک خول چڑھا رکھا جو بالآخر اتر گیا اور اُس کی صحیح شخصیت ابھر کر سامنے آ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں اس کی خیریت کے لیے فکرمند رہنے لگا۔ کبھی کبھی اس کی تاریخ پر بھی چلا جاتا۔ دو تین مرتبہ جیل میں بھی اس سے ملاقات کی۔ کرمو نے اب ڈاڑھی رکھ لی تھی اور باقاعدہ نمازی بن گیا تھا جو لوگ اُسے جانتے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کرمو کبھی سدھر بھی سکتا ہے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ بھی کرمو کا کوئی نیا چکر ہے اس کے ایک واقف کار نے ایک روز مجھے بڑی رازداری سے بتایا۔

"وہاں جی اس مرتبہ کوئی لمبا ہاتھ مارنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ یہ سارا چکر ہے۔ کسی بھی گاؤں میں پیر فقیر کا روپ دھار کر بیٹھ جائے گا اور دو تین مہینے ہی میں

ساری عمر کی روٹیاں بنا لے گا۔"

مَیں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ لوگ اپنی جگہ ٹھیک بھی تھے۔ لیکن یہ میں ہی جانتا تھا کہ کرموا اب واقعی وہ نہیں رہا۔ اس حادثے نے اُس پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔

دو تین سال بعد وہ ضمانت پر رہا ہو کر آ گیا۔ مَیں اُس کی رہائی کے دوسرے ہی روز اُس سے ملاقات کے بعد اُسے اپنی توبہ پر قائم رہنے کی تلقین کر کے چلا آیا۔

گاؤں سے میری واپسی عموماً چار پانچ روز بعد ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اِس مرتبہ حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مَیں پندرہ دن تک واپس نہ آ سکا۔ واپس آتے ہی مَیں اس کی خیریت دریافت کرنے گیا۔ دروازے پر حسبِ سابق اُس کی والدہ سے ملاقات ہوئی میری شکل پر نظر پڑتے ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ مَیں نے انہیں دلاسہ دینا چاہا اور گھبرا گیا کہ خدانخواستہ کرے۔

"مار ڈالا۔ مار ڈالا اُسے ظالموں نے مار ڈالا۔"

وہ بین کرنے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا کرموا اتنی جلدی مر جائے گا۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

محلے کی عورتیں بھی وہاں جمع ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر اب میری واقف بن چکی تھیں کہ مَیں کرمو کا واحد "شریف دوست" ہوں۔

باؤجی! رہائی کے تیسرے ہی دن اُسے پولیس شبہے میں پکڑ کر لے گئی تھی! اُن میں سے ایک نے روتے ہوئے کہا۔ ..... "چار پانچ روز بعد جب گھر واپس آیا تو حالت بہت بُری تھی۔ پہلے تو محلے کے ڈاکٹر صاحب دوا لاتے رہے۔ پھر ایک روز زیادہ حالت بگڑی تو ہسپتال لے گئے۔ تیسرے روز کرمو مر گیا۔" وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"باؤجی! بڑا نور آ گیا تھا اُس کے چہرے پر، اللہ کی قسم باؤجی!"

کرمو تو وہ رہا ہی نہ تھا ایک اور عورت بولی اور رونے لگی۔

مجھے یاد آ گیا کرمو نے ایک روز کہا تھا ——— "باؤجی! آپ تو جانتے ہیں نا۔ ایک مرتبہ کوئی پولیس کے کاغذات میں آ جائے تو کبھی نہیں نکل سکتا۔"

لمبا ہاتھ

اللہ دسایا کا گھر کبھی نہ بس سکا۔ شاید یہی اس کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس مرتبہ تو اُس نے جی جان سے یہی کوشش کی تھی کہ وہ اس دُنیا سے نکل جائے اور پُرسکون گوشہ اپنے لیے ڈھونڈ لے جہاں اسے امان میسر آسکے۔ اب یہ اس کا مقدر کے اس عالم بے کراں میں کوئی ایک جائے پناہ بھی اسے میسر نہ آسکی۔ اس بھرپور زندگی کے لیے اس نے جتنی مسلسل دوڑ دھوپ کی تھی اس نے اللہ دسایا کو اب نڈھال کر دیا تھا۔

جرم اس کمبل کی طرح اللہ دسایا کے بدن سے چمٹ گیا تھا۔ جو اتارے نہ اتر سکے۔ اس کا بچپن اور جوانی وقت کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ کوئی ماضی نہیں تھا اس کا۔ کوئی مستقبل اسے اپنا نظر نہیں آرہا تھا۔ حال کو سدھارنے کے لیے وہ اندھوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن وقت نے سوائے پچھتاوے کے اس کی جھولی میں کبھی کچھ نہ ڈالا۔

اس روز جب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک ولولہ تازہ کیلیے بیجو وال پہنچا تو اسے یقین تھا کہ شاہدہ ضرور اس کی منتظر ہوگی۔ لیکن وہاں ریلوے سٹیشن پر اس کے مقدر کی طرح بربستی وحشت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

پاکستان کے ایک بڑے شہر کے تھانے سے ایک چھوٹے شہر کے ریلوے سٹیشن تک کا سفر اس نے یوں ہی طے نہیں کر لیا تھا۔ اس مختصر سفر میں اس کی ساری زندگی کی جدوجہد سمٹ آئی تھی۔ اس کے لاشعور میں ابھی اس کا بچپن زندہ تھا۔ وہ شام اس نے بھلائی نہیں کی تھی۔ جب مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں سے وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے

ساتھ پاکستان پہنچنے کے لیے نکلا تھا۔

ان کے ساتھ گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ تھے یہ الگ بات کہ پاکستانی سرحد تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

اس کو صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ آخری حملے کے بعد جب اس کا باپ ایک سکھ کی کرپان سے کٹ کر گرا تو وہ دیوانہ وار چیختا ہوا خوفزدہ ہو کر ایک طرف بھاگ نکلا تھا۔ پھر وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ زندگی کی شاہراہ پر اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ کھیوتی سے ایک مہاجر کیمپ تک کا سفر کتنا جان لیوا تھا۔ اس کا تصور کر کے وہ آج بھی کانپ اُٹھتا تھا۔

اس کی عمر تب بمشکل آٹھ سال تھی۔ ہر روز وہاں نئے لوگ آتے اور پرانے چلے جاتے تھے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اپنے گمشدہ عزیزوں کو کھوجتے یہاں آتے اور اپنا گوہر مقصود پا کر واپس لوٹ جاتے۔ لیکن اسے کوئی لینے نہیں آیا۔

وہ صبح ہوتے ہی کسی آنے والے کا منتظر ہو جاتا اور رات ڈھلنے پر پھر اگلے روز کسی آنے والے کے انتظار میں سو جاتا۔ دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلنے لگے۔ اللہ دسایا کو یقین ہو چلا تھا کہ اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن اُس روز وہ حیران ہی رہ گیا۔ جب کیمپ کے انچارج نے اسے بلا کر ایک مہربان صورت سے اس کا تعارف کروایا۔

"یہی ہے اللہ دسایا"۔۔۔ نووارد نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی خوشی سے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر حیران پریشان اللہ دسایا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

کیمپ انچارج حیرت سے کبھی نووارد اور کبھی اللہ دسایا کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اللہ دسایا کی طرف سے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

"یہ بے چارہ مجھے کیسے پہچانے گا جناب! ساری زندگی تو میں گاؤں سے باہر رہا ہوں قسمت کی بات ہے جناب؟" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کلکتہ نوکری کرنے نہ جاتا تو میں بھوکا نہیں مرنے لگا تھا۔ لیکن۔۔۔ "ہائے ری قسمت" وہ چپ

ہوگیا۔

اللہ دسایا کے چھوٹے سے ذہن میں تب یہی خیال آیا تھا کہ چلو غلط فہمی ہی کی بنا پر سہی کوئی اسے لینے تو آیا۔ کیمپ انچارج بھی خوش تھا کہ بچے کا کوئی وارث پیدا ہوا۔ سب سے زیادہ خوشی تو نووارد کو تھی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی اور اچھا بھلا شکار ہاتھ آگیا۔

وہ شخص اللہ دسایا کو اپنا بیٹا بنا کر ہی گھر لایا تھا۔ لیکن بے آسرا اللہ دسایا اس کی اصلیت کو نہ جان سکا۔ یہ ہمدرد صورت آدمی۔ انسان کے لباس میں بھیڑیا نکلا اس نے جلد ہی اللہ دسایا کو اپنی لائن پر لگا لیا۔ اس جیسے دو اور بیٹے یہاں پہلے بھی موجود تھے۔

نیا نیا ملک بنا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ وہ عظیم مقاصد ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جو اس ملک عزیز کی اساس تھے۔ لٹ کر آنے والوں میں سے بہت سے خود لٹیرے بن گئے۔ انہوں نے اللہ دسایا جیسے بے سہارا لوگوں کو بھی لوٹ کا مال سمجھ لیا تھا۔

تاجو تقسیم ملک سے پہلے کلکتہ میں ورغلا کر یا اغواء کر کے لائے گئے بچوں کا ایک ایسا ہی گروہ چلا رہا تھا کہ پاکستان بن گیا۔ بادل نخواستہ اسے بھی پاکستان آنا پڑا۔ جہاں تھوڑی محنت ہی سے کام کے تین چار بچے اس کے ہاتھ آگئے تھے۔

اس نے اللہ دسایا کے ذہن میں جلد ہی یہ بات ڈال دی کہ اسے نہ صرف خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے بلکہ اپنے چاچا کے لیے بھی کما کر لانا ہے۔ اور کمانے کا آسان طریقہ فطری طور پر بہادر اور ذہین اللہ دسایا کو اس نے دنوں میں سمجھا دیا۔

پہلی مرتبہ جب اس نے اللہ دسایا کو ایک خالی مکان میں جس کے مکین کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ داخل کیا تو خوف سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ لیکن پہلی ہی دار میں اس نے اتنی کامیابی کمائی کہ تاجو اسے عطیۂ خداوندی جاننے لگا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا

کہ شاگرد آگے نکلے گا۔

اللہ دسایا پھر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے پہل تو تاجو اس کے ساتھ جایا کرتا تھا پھر وہ دور آیا کہ اللہ دسایا اکیلے وارداتیں کرنے لگا۔ ایک مرتبہ پکڑے جانے پر جب وہ جیل پہنچا تو پہلے سے اندر موجود استادوں نے اسے اپنے فن کے وہ اسرار و رموز سکھا دیئے کہ اللہ دسایا بالکل کامل ہو گیا۔

دو تین مرتبہ جیل کاٹنے کے بعد وہ تاجو سے الگ ہو گیا۔ اب وہ اپنی محنت میں سے کسی کو حصہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک روز وہ ایک بڑے شہر کی معروف شاہراہ پر کسی شکار کے انتظار میں کھڑا تھا۔ جب اس نے ایک بوڑھے آدمی کو بریف کیس سنبھال کر بنک سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اللہ دسایا نے بھانپ لیا کہ معاملہ ٹھیک جمے گا۔

اس کی بے قرار نظریں بریف کیس پر جم گئیں۔ جیسے ہی وہ بزرگ ایک قدرے غیر مصروف شاہراہ کی طرف بڑھا جہاں اس نے غالباً اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ دبے قدموں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اللہ دسایا لپک کر سامنے آگیا۔

اس کی جراب میں چھپا خنجر ہاتھ میں آگیا اور اس کی آنکھیں بزرگ کے چہرے پر جم گئیں۔

لیکن یہ کیا؟

اللہ دسایا کو یوں لگا جیسے ان آنکھوں سے کوئی برقی رو خارج ہو کر اس کے جسم کو چھیدنے لگی ہے۔

"تم محمد دین کے لڑکے ہو..." بزرگ کی آواز اسے کسی کنوئیں سے آتی سنائی دی

"ہاں ہاں"... بے اختیار اس کی زبان سے نکلا،،

اسے یاد آگیا کہ اس کے باپ کا یہی نام تھا..... لیکن یہ شخص کون ہے۔

"خنجر واپس رکھ لو اور میرے ساتھ آؤ"..... تحکمانہ لہجے میں اسے کہا گیا۔

"مَیں .... ہیں۔ مجھے جانے دو۔" اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کرے ... نہ کرے۔ کسی بھی لمحے یہاں کسی کی آمد کا خطرہ موجود تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ بوڑھا کی توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے عملی جامہ پہنائے ایک آہنی شکنجے نے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ ہونقوں طرح اس کا منہ دیکھتا رہا۔

"مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ تم جان بھی نہیں سکتے" اسی بزرگ نے نزدیک کھڑی کار کا اگلا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھا دیا اور ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ تمام راستے وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش رہا۔ اس دوران اسے یہ ا ہو چکا تھا کہ یہ شخص آہنی اعصاب کا مالک ہے اور اندر سے کہیں زیادہ طاقتور ا ہے۔

گھر پہنچنے پر اس نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا یہی پراسرار اب اللہ دسایا کو دہشت زدہ کرنے لگا تھا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ شخص کون اٹھارہ انیس سال اس کی عمر ہو رہی تھی اور آٹھ نو سال اسے اپنے گاؤں سے نکلے ہو گئے تھے۔

"تمہیں فوجی چاچا یاد ہے۔" مہربان بزرگ نے گھر پہنچ کر اسے ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"فوجی چاچا۔" ... وہ بڑبڑایا اور اسے یاد آگیا۔ اس کی والدہ کا ایک دُور کا رشتہ دار فوجی تھا۔ شاید فوج کا کوئی بڑا افسر تھا۔ کبھی کبھی انہیں ملنے آیا کرتا تھا کمال کا مشاہدہ تھا فوجی چاچا کا .... جس نے آٹھ نو سال بعد بھی اسے پہچا لیا تھا۔

اللہ دسایا کو یہیں علم ہوا کہ اس کا تو سارا کنبہ مارا گیا تھا۔ وہ اکیلا رہ سکنے کے لیے رہ گیا۔ فوجی چاچا نے اسے اپنے گھر پناہ دی۔ اس نے اللہ دسایا سے کہا کہ وہ اپنا ما بھول کر اچھا انسان بننے کی کوشش کرے۔ اللہ دسایا کب بُرا بننا چاہتا تھا۔ فوجی ما

نے چند ہی دنوں میں اسے اتنا پیار دیا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔

اس نے اللہ دسایا کو اپنی فرم میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروایا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے فوجی چاچا نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اللہ دسایا اچھے لوگوں کی طرح اس کی دکان پر بیٹھا رہتا لیکن وہ بھول چکا تھا کہ اس کی اصلیت کچھ اور ہے۔

دس بارہ روز بعد ہی ایک دن ایک سپاہی اسے لینے آگیا: "چوہدری صاحب نے بلوایا ہے"

اللہ دسایا سمجھ گیا کہ کسی مقامی ٹاؤٹ نے اسے پہچان کر اس کی رپورٹ کر دی ہو گی۔

تھانیدار نے شریفانہ لباس میں ملبوس اللہ دسایا کو سر سے پیر تک بڑے غور سے دیکھا پھر ایک رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا۔" اس نے بڑے طنز سے ایک تصویر پر انگلی مار کر کہا۔

"جی سرکار... میری ہی ہے لیکن اب میں ..." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"اب کی بات چھوڑو بچے ... ہمیں کیا تم اب کیا کرتے ہو ... ویسے ہاتھ لمبا مارا ہے استاد تم نے ...."

تھانیدار نے مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

اللہ دسایا کی قسمیں پولیس والوں کے لیے نئی نہیں تھیں۔ ان کے اپنے کچھ اصول تھے ایک مرتبہ جو پولیس کے کاغذوں میں آگیا ... آگیا۔ تھانیدار نے اس کے رونے اور قسمیں کھانے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ... "مطلب کی بات کرو دسایا... مطلب کی بات کرو۔ ہمیں بے وقوف بناؤ گے کیا؟ پھر ہم تمہیں گرفتار تو کر نہیں رہے۔ بس ذرا خیال رکھنا ہمارا بھی .... آج کل تو بڑے آدمی بن گئے ہو نا۔" تھانیدار کی طنزیہ باتیں اسے کھا گئیں لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ اس دنیا کے قوانین جانتا تھا۔ اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پولیس ٹاؤٹ بن جائے۔ لیکن اس نے تو قسم کھائی تھی کہ دوبارہ اس زندگی میں واپس نہیں لوٹے گا۔ جسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔

اللہ دسایا کچھ نہ کر سکا۔ آئے روز تھانے اس کی پیشی ہونے لگی۔ پولیس کا جب جی

چاہتا اسے شک میں گرفتار کر کے لے جاتی۔ ایک روز بالآخر اسے غنڈہ ایکٹ میں بند کر دیا گیا۔ آج تک اس نے جی جان سے کوشش کی کہ فوجی چاچا کو اس کے لیے پریشان نہ ہونا پڑے لیکن ایسا ہو کے رہا۔

جب وہ تین مہینے کی نظر بندی کاٹ کر جیل سے باہر نکلا تو گھر کے بجائے اپنی دنیا میں واپس لوٹ گیا۔

پھر وہی چوریاں، ڈکیتیاں اس کا مقدر بن گئیں۔ اس نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک اور بڑے شہر کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ کئی تاجو یہاں بھی قدم قدم پہ بانہیں پھیلائے اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے اللہ وسایا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تھانے اور جیل اب اس کے لیے کھیل تماشا بن چکا تھا۔

دن بھر کی کمائی وہ رات کو لٹا دیتا تھا۔ انہی راستوں پر چلتے چلتے ایک روز شاہدہ اس سے ٹکرا گئی۔ شاہدہ کی داستان کوئی الگ نہیں تھی اس سے۔ وہ بھی اسی کی طرح مختلف ہاتھوں سے گزرتی یہاں پہنچی تھی۔ پہلے روز اللہ وسایا اس کا گاہک بن کر گیا تھا۔ لیکن پہلے ہی دن اس کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ فاحشہ ابھی تک اندر سے مکمل عورت ہے۔

جب اسے شاہدہ کے عورت ہونے کا ادراک ہوا تو ایک روز وہ اس کے سامنے بیٹھا۔ اس نے اپنے اوپر چڑھا خول اتار کر پھینک دیا اور شاہدہ کو بتایا کہ وہ صرف ایک معصوم دیہاتی بچہ ہے۔ جسے لیڈروں نے لوٹ کا مال بنا دیا ہے۔۔۔ شاہدہ خود مردم گزیدہ تھی۔ وہ بھی بلک پڑی۔ "چلو شاہدہ اس دنیا کو چھوڑ دیں۔ نکل جائیں یہاں سے۔۔۔" اس نے بڑے دکھی دل لیکن پُرعزم لہجے میں کہا۔

"لیکن کہاں؟" شاہدہ نے پوچھا، "اس کی سرحدیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں سے فرار صرف سوچا جا سکتا ہے وسایا۔۔۔ صرف سوچا جا سکتا ہے۔"

اللہ وسایا اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اس نے شاہدہ کو بظاہر قائل کر لیا کہ وہ یہاں سے نکل کر کسی دیہاتی علاقے میں چلے جائیں گے۔ اسے یاد آگیا کہ یہاں سے اسّی میل دور بیجواں میں اس کا ایک دوست موجود ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور اس نے بڑے خلوص سے

ایک تاریخ مقرر کر کے شاہدہ کو وہاں پہنچنے کے لیے کہہ دیا شاہدہ نے بھی اس کا دل رکھنے کے لیے ہاں کر دی۔

اس کی زندگی میں اللہ وسایا پہلا ایسا آدمی نہیں تھا۔ جس نے اسے نئی زندگی کی راہ دکھائی تھی۔ ایسے دو تلخ تجربات وہ کر چکی تھی اور تیسری مرتبہ دھوکہ کھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اس روز جب اللہ وسایا نئی زندگی کے خواب دیکھتا وہاں پہنچا تو اسے یقین تھا کہ شاہدہ وہاں موجود ہو گی۔ لیکن یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے دو گھنٹے تک وہ ایک بنچ پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران دو اور گاڑیاں وہاں رک کر آگے چلی گئیں۔

سٹیشن ماسٹر بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شخص پہلی ہی نظر میں اسے مشتبہ لگا تھا اور اب تو خاصی دیر ہو گئی تھی۔

"کہیں کوئی لمبا گھپلا نہ ہو جائے۔۔۔۔ کوئی قتل وغیرہ!" اس نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا اور اسے اس اطلاع کے ساتھ پولیس چوکی کی طرف دوڑا دیا کہ سٹیشن پر ایک مشتبہ گھوم رہا ہے۔

اللہ وسایا نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ خودکشی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا جینا بھی مرنے جیسا ہی تھا۔ وہ اپنا سر نہوڑے بیٹھا تھا۔ جب ایک حوالدار اور تین سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔

"کون ہو تم اوئے!" بوڑھا حوالدار للکارا۔

اس نے سر اٹھایا تو حوالدار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اوہو! یہ تو اللہ وسایا ہے پکڑ لو اسے اوئے۔۔۔۔" اس نے سپاہیوں کو حکم دیا، "کوئی لمبا ہاتھ مارنے آیا ہے۔"

دو سپاہیوں نے اس کے دونوں بازو اپنی گرفت میں لے لیے۔ اللہ وسایا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ حوالدار اور سپاہی بہت خوش تھے۔ جیسے انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

٭

پُراسرار محسن

میں جو واقعہ آپ کو سنانے جا رہا ہوں اس پر جانتا ہوں کہ آپ کو مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا کچھ پڑھ لکھ جانے کی وجہ سے مَیں بھی ایسے واقعات سنانے والوں کا تمسخر اڑایا کرتا تھا۔ لیکن خود ان کا نشانہ بننے کے بعد سے میرے خیالات میں خاصی تبدیلی آچکی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی میری طرح سوچنے لگیں۔

میں نے آپ سے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔ میرا نام نواز خان ہے اور مَیں رینجر کا سابقہ حوالدار ہوں عمر کے ایسے حصے میں ہوں۔ جہاں بس چل چلاؤ والا ہی معاملہ ہے مَیں نے بیس سال تک اس کہانی کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن ایک عجیب بے کلی سی ہمیشہ مجھے لگی رہی۔ آج جب آپ کو یہ کہانی سنا رہا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پچھلے بیس برسوں سے جو پھانس سی میرے گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ نکل گئی ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً ہی بعد بدقسمتی سے ہم نے ان عظیم مقاصد کو بھلا دیا جن کے لیے یہ مملکت خداداد وجود میں آئی تھی۔ قائداعظم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ملت کی شہادت کا سانحہ ہوگیا۔ اس کے بعد تو آئے روز وزارتیں بدلنے لگیں اور ملک میں سیاسی افراتفری کا طوفان بدتمیزی در آیا۔

جب بدامنی ہر طرف پھیل جائے تو ایسے حالات میں بدقماش عناصر ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہی ہوا ملک میں جرائم رواج پاگئے۔ راتوں رات دولت مند ہونے کی ہوس نے لوگوں کو اندھا کر دیا۔ دوسرے بہت سے جرائم کے علاوہ ان دنوں سمگلنگ کا مال

اپنے عروج پر تھا۔

یہ سمگلنگ دو طریقوں سے ہوتی تھی کہیں آپس میں مل ملا کر اور کہیں براہِ راست ان دنوں میں حوالدار بن کر اس علاقے میں نیا نیا گیا تھا۔ میری ڈیوٹی جس سرحدی چوکی پر لگی تھی۔ وہ ایسے علاقے میں تھی جہاں ارد گرد سمگلنگ کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے خدا بہتر جانتا ہے کہ یہاں لوگ مل کر کام کرتے تھے۔ یا اس علاقے کے لوگ اس میں ملوث نہیں تھے۔ بہرحال یہ ضرور تھا کہ میرے آنے پر یہاں چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں۔

میں صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور متشرع شکل بھی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے نام کے بجائے ہر جگہ مولوی صاحب ہی پکارا جاتا تھا۔ میرے متعلق یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ میں غلط کام کرنا تو بہت دُور کی بات ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں ایک مشہور سمگلر رہتا تھا۔ جس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ ہمارے پوسٹ والوں سے مل کر مال آر پار لاتا اور لے جاتا ہے۔ مَیں چونکہ رات کو نکلنے والی گشت کا انچارج تھا۔ اس لیے وہ لوگ جو اس کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ مجھے بھی اعتماد میں لیں، لیکن یہاں صورتِ حال ایسی تھی کہ ہر کوئی دوسرے پر شک کرتا اور محتاط رہتا تھا ان میں سے کسی نے بھی میرے ساتھ اس ڈر سے بات نہ کی کہ اس طرح وہ خود بے نقاب ہو جائے گا پھر میری نیک نامی بھی آڑے آئی۔

ان لوگوں نے بجائے خود میرے سامنے آنے کے اس علاقے کے سمگلر ماجھے کو میرے متعلق بتایا کہ یہ مولوی بڑا سخت قسم کا آدمی ہے اور رشوت نہیں لے گا۔ اس ضمن میں میری شہرت پہلے بھی خاصی خراب تھی اور مَیں نے دو تین دفعہ ایسی حرکت کرنے والوں کو پکڑوایا بھی تھا۔ ان لوگوں کو مجھ سے صرف یہی خطرہ نہیں تھا کہ مَیں خود رشوت نہیں لوں گا۔ بلکہ وہ خوف زدہ تھے کہ میں ان کو مروا دوں گا۔ یہ ساری صورتِ حال جب ماجھے سمگلر کے سامنے آئی تو وہ ضرور ہنسا ہوگا کہ ایسا بے وقوف کون ہے جو گھر

آئی مایا کو دھکے دے کر نکالے گا۔

اس نے فوراً براہِ راست مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری پکٹ کے نزدیک ترین ماجھے سمگلر ہی کا گاؤں تھا۔ جہاں سے ہم ضروریات زندگی خریدنے جایا کرتے تھے۔ یوں بھی ہم لوگ دن میں ایک آدھ چکر اس گاؤں کا لگا ہی لیا کرتے تھے۔ میں بھی اُس روز رات کی ڈیوٹی ختم کر کے سو گیا اور ظہر کے بعد جب اُٹھا تو گاؤں کی طرف چل دیا میرا پروگرام یہی تھا کہ عصر گاؤں کی مسجد میں پڑھ لوں گا۔

میں ایک دکان سے صابن خرید رہا تھا۔ جب مجھے ایک آدمی نے آکر کہا۔

"مولوی صاحب آپ کو ماجھے پہلوان نے بلایا ہے۔"

مجھے تو اس کی بات سن کر ہی غصہ آگیا۔ میں حکومت کا نوکر تھا کسی ماجھے سانجھے کا نہیں۔ پھر میرا ایک بدنام سمگلر کے پاس خود چل کر جانا یوں بھی مشکوک بنا دیتا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں ہے اُسے کیا کہا تھا بس ڈانٹ کر بھگا دیا تھا سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل یہی چاہا اس کو جا کر دو چار سنا آؤں لیکن مصلحتاً خاموش رہا میں اس کی شہرت سن چکا تھا اور اس کے منہ لگنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

میں دکان دار کو پیسے دے کر واپس مڑا تو ایک لمبا تڑنگا اور بڑے مضبوط جثے کا آدمی مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا اس نے میرے قریب پہنچ کر مجھے سلام کیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"آیئے بیٹھ کر دو چار باتیں کرتے ہیں۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہو"؟ ... میں نے غصے سے پوچھا ... میں تو تم کو جانتا بھی نہیں۔"

"مولوی صاحب میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں کوئی دشمن نہیں۔"

میں مزید کچھ کہے سنے اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وہیں ایک چائے کی دکان پر لے کر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دیا اُس دکان پر میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی دیہاتوں میں ان دنوں کون چائے پیتا تھا۔

"مولوی صاحب" اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ میں آپ کو کسی چکر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ میری بات غور سے سن لینا۔ آپ بال بچوں والے آدمی ہیں۔ یہاں افسر سے سپاہی تک سب ہی موج کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے آپ کچھ زیادہ ہی ایماندار ہیں۔ سو دفعہ ہوں ہم کو اس سے کیا ہماری درخواست تو یہی ہے کہ ہم غریبوں کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانا ورنہ ایسے منہ کے بل گرو گے کہ زمانہ دیکھے گا اور ہاں اگر مناسب سمجھو تو ہم ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہیں مل جل کر جو کام ہو جائے وہی بہتر ہوگا" وہ بغیر سانس لیے بولتا چلا جا رہا تھا۔

میرا خون کھولنے لگا۔ غصے کے مارے میرے منہ سے نہ جانے کیا نکل گیا۔ میں اٹھا اور وہاں سے چل دیا۔ ماجھے نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی صرف اس کا قہقہہ ہی مجھے سنائی دیا۔

میں پکٹ پر آیا تو کئی معنی خیز نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ شاید ان کو علم تھا کہ آج ماجھا میرے ساتھ بات کرے گا۔ میرے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر وہ لوگ بھی سمجھ گئے کہ میں ان کے دام فریب میں نہیں آیا۔

یہ میرا اس پکٹ پر تیسرا چوتھا دن تھا رات کو میری گشت ڈیوٹی بدل کر لگائی گئی اور مجھے جان بوجھ کر اس علاقے سے دُور رکھا گیا۔ جس کے متعلق مشہور تھا اور میرا تجربہ بھی یہی بتاتا تھا کہ یہاں سے باآسانی سمگلر آ جا سکتے ہیں میں سمجھ تو گیا۔ لیکن قانونی اور اخلاقی دونوں طور پر مجبور تھا کہ وہیں جاؤں جہاں مجھے بھیجا جا رہا ہے اپنے سروس رولز کے مطابق میں اپنے افسر کو ڈیوٹی بدلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ گشت پر چلا گیا ہماری ڈیوٹی ایسی ہے کہ ہر لمحے چوکس اور حاضر دماغ رہنا پڑتا ہے۔ اندھیرے میں چلائی گئی گولی ہمیں نظر آنے سے رہی کچھ بھی ہو سکتا ہے ماجھا کوئی معمولی سمگلر نہیں تھا۔

اس نے جس طرح بے دھڑک ہو کر مجھ سے بات کی تھی اور جواب میں جس طرح اس کی

بے عزتی کی اس کے بعد کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ مَیں نے ذہنی طور پر اس کی طرف سے ہونے والے کسی بھی وار کو سہنے کی تیاری کر لی تھی۔ مَیں نے ڈیوٹی پر روانگی کے وقت اللہ تعالےٰ سے دُعا کی تھی کہ وہ میری نیت کا حال بہتر جانتا ہے۔ وہی میری حفاظت بھی کرے گا۔

ہم لوگ اس مخصوص علاقے میں پہنچے تو مَیں ایک درخت کے نزدیک بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو دو مختلف اطراف میں روانہ کر دیا ان کو مَیں نے سمجھا دیا تھا کہ کس خاص مقام پر پہنچ کر انہوں نے واپس مڑنا اور ایک دوسرے سے ملاپ کرنا تھا۔

ملاپ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر ایک پہرے دار دوسرے کی طرف ٹارچ سے سگنل دیتا ہے تاکہ دونوں اپنی سمت کا اندازہ لگا لیں اور رات کو بھٹک کر سرحد کے دوسری طرف نکل جانے کے امکانات بھی نہ رہیں۔

خود مَیں ایک راستے پر درخت کے نزدیک ناکہ لگا کر بیٹھ گیا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے ایک دلدوز چیخ سنائی دی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کسی کا گلہ دبا رہا ہے مَیں چوکنا ہو گیا۔ کان آواز کی طرف لگا دیے۔

ایک ہی چیخ کے بعد پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ چونکہ ایک ہی چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس لیے سمت کا اندازہ بھی نہ کر سکا۔ اپنی جگہ سے اُٹھنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا یہ جال میرے ہی لیے پھیلایا جا رہا ہو۔

مَیں اپنی جگہ جم کر بیٹھا رہا۔ بطور احتیاط میں نے اپنی رائفل کو فائرنگ کے لیے تیار کر لیا تھا میں کسی بھی واقعے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ انتظار کی شدت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے لیکن دوسری طرف وہی سناٹا طاری رہا۔

چند منٹ مزید سُن گُن لینے کے بعد میں بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے کھسکنے لگا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کسی کو میرے یہاں بیٹھنے کا علم ہو گیا ہو اسی پوزیشن میں بیس پچیس گز دُور نکل آیا لیکن کچھ نہ ہوا۔

میری آنکھیں اندھیرے میں بہت دُور تک دیکھ سکتی تھیں یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس طرف میرا سپاہی اسلم گیا تھا۔ چیخ اس طرف سے بلند ہوئی تھی۔ میری نظریں اندھیرے میں اسی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ جب ایک منظر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

مجھ سے بمشکل پندرہ بیس گز دُور فضا میں ایک دیا جلتا ہوا نظر آیا یوں لگتا تھا جیسے یہ دیا ہوا میں تیر رہا ہو مَیں چکرا کر رہ گیا۔ میری اطلاعات کے مطابق یہاں دُور دُور تک آبادی یا کسی قبرستان وغیرہ کا نام و نشان بھی نہیں تھا کہ کوئی آ کر کسی قبر پر دیا رکھ گیا ہو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ خوف سے میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔

دل ہی دل میں مَیں نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور اس دیے پر نظریں جما کر سوچنے لگا کہ یہ مجرموں ہی کی کوئی سازش نہ ہو اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ ابھی تک میرے دونوں سپاہیوں نے ملاپ نہیں کیا تھا۔

الٰہی خیر میرے دل سے دعا نکلی۔

اس کے ساتھ ہی ایک سمت سے ٹارچ جل کر بجھی مَیں نے فوراً دوسری طرف دیکھا لیکن اس طرف سے کوئی سگنل وصول نہیں ہوا تھا۔ دوبارہ اسی سپاہی نے ملاپ کی کوشش کی لیکن اب بھی جواب نہ آیا۔ جس طرف اسلم گیا تھا۔ اس طرف سے کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا تھا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی مَیں نے اللہ کو یاد کیا اور خود اس کی تلاش میں جانے کو تیار ہوا اسلم اُسی سمت میں چلا گیا تھا۔ جدھر یہ دیا فضا میں تیر رہا تھا۔ مَیں بھی رائفل چھتیائے اسی طرف چل دیا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مَیں نے دیکھا کہ دیئے نے بھی چلنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے مَیں اس کی طرف بڑھا اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو میں نے گھبرا کر اس پر فائر کرنے کی بھی سوچی۔ لیکن پھر رک گیا کہ اگر میرے خیال کے مطابق یہ کسی زندہ شخص کی ہتھیلی پر نہ ہوا تو مَیں فائرنگ کے لیے کیسے جواب دہی کروں گا۔

میری آنکھیں اسی دیے پر لگی تھیں۔ جب اچانک میرا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور میں منہ کے بل اسی پر گر پڑا گھبراہٹ سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مجھے گرتے ہوئے

یہ احساس ضرور ہوا کہ میں کسی انسانی جسم پر گرا ہوں گرتے ہی مَیں نے سنبھل کر اور بڑا زور لگا کر اپنے حلق سے "ہالٹ" کی آواز نکالی۔

اس کے ساتھ ہی کانپتے ہاتھوں سے ٹارچ روشن کی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ میرا سپاہی اسلم تھا وہ بے ہوش تھا۔ مَیں نے افراتفری میں اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

اسلم ہوش میں آیا تو خوف سے کانپنے لگا۔ مَیں نے خطرات سے بے نیاز ٹارچ جلائے رکھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔

"ادھر ادھر"..... اس نے ہاتھ اٹھا کر اس سمت اشارہ کیا۔ جدھر مجھے دیا نظر آ رہا تھا اور کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور وہ کانپنے لگا مَیں سمجھ گیا کہ خوف سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ خود میں بھی سہما ہوا تھا لیکن ابھی اس کی طرح میرے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں آیات قرآنی کا ورد شروع کر دیا اور اس کو سہارا دے کر پکٹ کی طرف جانے لگا۔

اس دوران نہ چاہتے ہوئے بھی مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دیا غائب ہو چکا تھا۔ میں اسلم کو سہارا دے کر پکٹ میں لے آیا اور ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کی زبان گنگ ہو چکی ہو۔ پکٹ پر موجود سپاہی بھی وہیں آ گئے۔ میں نے جو کچھ بھی یاد تھا پڑھ کر اسلم پر پھونکا اس کے اوسان بحال ہونے لگے اس نے ہوش میں آنے پر بتایا کہ کسی نادیدہ طاقت نے اس کا گلہ گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔

مَیں کسی بزدلی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس کو پکٹ والوں کی نگرانی میں دے کر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے دوسرا سپاہی بھی مل گیا۔ جسے ان واقعات میں سے کسی کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ بالکل نارمل تھا۔ ہم نے ڈیوٹی کا وقت اکٹھے گزارا اور اس کو میں نے بتایا کہ اسلم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اپنے متعلق اس کو کچھ نہ بتایا۔

آدھی رات کو ڈیوٹی ختم کر کے ہم پکٹ میں آ کر سو رہے صبح تک اسلم والے

حادثے کی سب کو خبر ہو چکی تھی۔ مَیں نے اسلم کو سمجھایا کہ یہ اسلم کا وہم ہو گا۔ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں لیکن وہ قسمیں کھا کھا کر ہم کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔

صبح مجھے ایک بوڑھے کھوجی نے جو قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا الگ لے جا کر بتایا کہ یہ ایسی پہلی واردات نہیں ہے۔ اس علاقے میں دو تین مرتبہ پہلے بھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا:

"مولوی صاحب جس کسی نے بھی آپ کی ڈیوٹی ادھر لگائی ہے۔ اس نے آپ سے کوئی بدلہ چکایا ہے۔"

مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا کئی مرتبہ جی بھی چاہا کہ جو واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے وہ بھی ان لوگوں کو سنا دوں لیکن میں خاموش رہا۔ اگلی رات پھر میری ڈیوٹی اس طرف لگ گئی۔ اس مرتبہ دونوں سپاہی نئے تھے۔ مَیں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا اور اللہ کو یاد کر کے چل پڑا۔ صرف دل میں اتنی دعا کی کہ مولا کریم تو سب کے دلوں کا حال بہتر جانتا ہے اگر کوئی سازش ہے تو بھی مجھے اس کا شکار اس لیے بنایا جا رہا ہے کہ مَیں تیرے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل رہا ہوں۔

اس مقام پر آ کر میں ناکہ لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں سپاہیوں کو گشت پر بھیج دیا اچانک ایک خیال نے میرے ذہن میں سر اٹھایا کہ مَیں فوراً اپنی جگہ تبدیل کر لوں یہ سوچ کر ابھی مَیں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہی دیا مجھے اس مقام پر چلتا نظر آیا... لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔

مَیں اٹھ کھڑا ہوا اور دوسری سمت چل پڑا ابھی مشکل سے چند قدم اٹھائے تھے کہ یکے بعد دیگرے تین چار گولیاں فائر ہوئیں مَیں فوراً زمین پر گر پڑا اور پوزیشن میں آ گیا۔ مَیں نے رائفل کو فائرنگ کے لیے تیار کر لیا لیکن گولی نہ چلائی۔

مَیں نے سوچا کہ اگرچہ یہ گولیاں مجھ پر چلائی گئیں ہیں تو میں فائرنگ کر کے اپنی موجودہ پوزیشن حملہ آوروں کو کیوں معلوم ہونے دوں۔ مَیں چاہتا تھا کہ وہ شخص اپنی گولیاں ختم کرے اس کے بعد میں اچانک اس کے سر پہ پہنچ کر اس کو پکڑ لوں گا۔ یہ ارادہ کرتے ہی میں

فائرنگ کی سمت چلنے لگا۔ اچانک ہی فضا چیخوں سے لرز گئی یوں لگا جیسے کوئی کسی کو ذبح کر رہا ہے۔ مجھے کل والا واقع یاد آگیا۔ کسی غیر اختیاری عمل کے تحت میں آواز کی سمت اُٹھ کر بھاگا۔

یہ بھاگنے کا طریقہ میری تربیت کے اصولوں کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن اس لمحے مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا اپنے علاوہ مجھے اور بھی بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید میرے دونوں سپاہی بھی اسی سمت بھاگتے آرہے تھے۔ مَیں نے ٹارچ جلائی۔

چیخوں کی آواز بند ہو چکی تھی۔ جلد ہی میری ٹارچ کی روشنی ایک انسانی ڈھیر پر پڑنے لگی۔ میں اس کے نزدیک جا کر رک گیا۔ اس دوران دونوں سپاہی بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ چکے تھے۔ رائفل اس کے ہاتھوں سے نکل کر دُور جا گری تھی اور خود وہ وہاں اوندھے مُنہ گرا ہوا تھا۔ دونوں سپاہیوں نے مل کر اس کو سیدھا کیا۔ مَیں نے ٹارچ جلا کر دیکھی۔ خدا کی پناہ! یہ تو ماجھا سمگلر تھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آنے کو تھیں اور گردن پر سخت گرفت کے آثار بخوبی دکھائی دیتے تھے ہم نے جھک کر اس کی نبضیں ٹٹولیں۔

ماجھا سمگلر مر چکا تھا۔

اس کی لاش پکٹ پر لائی گئی جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی، لیکن گلہ دبانے کے دبانے کے نشانات بڑے واضح تھے یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اس نے ہی مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ کسی نے اس کو بتا دیا تھا کہ مَیں کس جگہ ناکہ لگا کر بیٹھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی اس کو مل گئی تھی کہ مَیں نے پکٹ پر پہنچتے ہی کمپنی کمانڈر کو اس کے متعلق رپورٹ دے دی تھی۔ یہ بڑی خفیہ کارروائی تھی لیکن اس کو اس کے ایجنٹوں نے مطلع کر دیا۔

ماجھا تھا تو موٹی عقل کا بدمعاش وہ سیخ پا ہو کر مجھے مارنے پر تل گیا اس کو یہ اطلاع تو مل چکی تھی کہ مختلف علاقوں میں ناکے کہاں لگتے ہیں۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی اس نے چار گولیاں ہی چلائی تھیں کہ کسی نادیدہ طاقت نے اس کا گلہ دبا کر اس کو جان سے مار ڈالا۔

لیکن یہ میرا ان دیکھا محسن کون تھا؟ اس دیے کا راز کیا تھا اور وہ میرے علاوہ کسی اور کو کیوں نظر نہ آیا؟ مَیں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ بس ایک ہی بات میرے ذہن میں آئی کہ مَیں نے اللہ سے مدد مانگی تھی اور اس نے میری مدد کی۔

∴

حمید ابوری والا

پاکستان کے ایک مشہور شہر کا پُر رونق بازار، زندگی کی گہما گہمی یہاں عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ایک دیہاتی بابو چھٹیاں گزار نے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ اس کی خواہش ہے کوئی تحفہ خرید کر گاؤں لے جائے۔ ایک گھڑی ساز کی دکان پر کھڑا وہ ایک گھڑی کی سودا بازی میں مصروف ہے۔ اس دکان سے کچھ فاصلے پر ادھ جلا سگریٹ انگلیوں میں پھنسائے، بارعب شخصیت کا مالک، خوش لباس، انگلی میں جعلی سونے (رولڈ گولڈ) کی انگوٹھی پہنے درمیانی عمر کا ایک شخص دکاندار پر نظریں جمائے کھڑا ہے۔ دیہاتی کے دکان پر پہنچتے ہی اس کی پُر امید نظریں اسی جانب لگ گئی ہیں۔ صبح سے کھڑا کھڑا وہ اکتا گیا ہے۔

ایک چمک اس معزز شخص کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جیسے بھیڑیئے نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ دکاندار نے اسے مخصوص سگنل دے دیا ہے۔ ہاتھ میں سلگتے سگریٹ کو پاؤں تلے مسل کر وہ بڑا گھبرایا ہوا دکان کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے یہی اندازہ ہو رہا ہے۔ جیسے بے چارے پر اچانک کوئی بپتا آن پڑی ہو۔

"بھائی صاحب! دو منٹ ذرا میری بات سُن لیجیے۔" وہ دیہاتی اور دکاندار کی گفتگو میں مداخلت کرتا ہے۔

دکاندار متوجہ ہوتا ہے۔ "میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اگر آپ براہِ کرم میری مدد فرمائیں۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گیا۔

"اللہ رحم کرے۔" دیہاتی کو اس کی شریفانہ وضع قطع دیکھ کر ترس آنے

لگا تھا۔

"فرمائیے۔" دکاندار نے کہا۔

"میں شریف آدمی ہوں۔ دوسرے شہر سے بچی کو علاج کروانے یہاں لایا تھا۔ معلوم نہیں تھا۔ اتنا زیادہ خرچ ہو جائے گا۔ کچھ عزیز رشتہ دار بھی یہاں ہیں لیکن کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو یہ گھڑی رکھ لیں۔"

"بھائی صاحب! رشتہ دار تو آج کل کے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیا بُرا زمانہ آگیا ہے۔" "اچھا دکھائیے تو گھڑی۔" دکاندار کا لہجہ بڑا ترحم آمیز ہے۔ دیہاتی اس دوران خاموش ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات ہیں۔ دکان دار نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر سرسری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"گھڑی تو پانچ سو سے کم کی نہیں ہے جناب!" دکاندار نے کہا، "لیکن میں معافی چاہوں گا۔ حالات آج کل خاصے خراب ہیں۔ ہم لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے پولیس بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ میں آپ پر شک نہیں کر رہا لیکن..."

"خدارا صرف اڑھائی سو روپے ہی دے دیں۔ میں کیا بتاؤں خدا کسی کو اس طرح مجبور نہ کرے۔" اس مرتبہ باقاعدہ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے تھے۔

"گھڑی تو ٹھیک ہے نا؟" دیہاتی نے پوچھا۔

"بظاہر تو ٹھیک ہی نظر آ رہی ہے نا؟" دکان دار نے کہا۔ "میں نے اس کے اندر گھس کر تو دیکھا نہیں۔"

"آپ گھڑی مجھے دے دیں۔" دیہاتی نے حوصلہ کر کے بالآخر اُس سے کہہ دیا۔

"اللہ تمہارے بھلا کرے" معزز سفید پوش نے گھڑی اتار کر دیہاتی کی طرف بڑھا دی اور اڑھائی سو روپے بغیر گنے جیب میں ڈال لیے۔ آنسو بدستور اس کی آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔

دیہاتی بابو خوشی سے جھومتا وہاں سے روانہ ہوا۔ اب وہ گاؤں جا کر ہر کسی پر رعب گانٹھ سکتا تھا۔ گھڑی واقعی بڑی قیمتی اور شاندار تھی۔

دیہاتی کے وہاں سے ٹلتے ہی وہ "شریف آدمی" دوبارہ دکان پر گیا۔ سٹو کا ایک نوٹ دکاندار کی طرف بڑھایا اور اپنی راہ لی۔ دوسری طرف دیہاتی بیچارہ ابھی گاؤں پہنچا ہی تھا کہ گھڑی نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاؤں کے ایک دو گھڑی سازوں کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ سوائے گھڑی کے ڈائل کے باقی سب کچھ نقلی ہے اور اس کی مشینری کو اتنا ہی چلنا تھا۔ جتنا چل چکی ہے۔

دیہاتی بے چارہ ایک موہوم سی امید کے سہارے چھٹیاں گزارنے کے بعد دکاندار کے ہاں پہنچ گیا۔ دکان دار نے پہلے تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ پھر دیہاتی کے یاد کرانے پر اسے یاد آ گیا۔

"میں نے تو پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا۔" دکاندار نے اس سے کہا — "تم پینڈو لوگ ہوتے ہی لالچی ہو۔ اب بھگتو۔" اور دیہاتی بے چارہ اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا۔

٭

لاہور کی ایک ماڈرن آبادی کا شاندار بنگلہ:

گھر کے مکین گیٹ کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک خاتون نے گھبرا کے کھلے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک سفید پوش درمیانی عمر کا باریش شخص دل پر ہاتھ رکھے لڑکھڑاتا اس طرف آ رہا تھا۔ سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ برآمدے کے نزدیک وہ کسی نہ کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا پہنچ ہی گیا۔

"پ ..... پ ..... پانی۔" اس کے منہ سے بمشکل نکلا وہ دھڑام سے گر پڑا۔

گھر کے مکین گھبرا کر اس کی طرف بڑھے۔ دو نوجوانوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ

دے کر اسے اٹھایا اور برآمدے میں لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ بڑی جان توڑ کوششوں سے قریباً پانچ چھ منٹ بعد اسے ہوش آیا۔ بے ہوشی کے دوران اس کی قمیض کی جیب سے شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے لکھے ہوئے دو نسخے باہر آن پڑے تھے۔ جن پر مختلف دوائیاں لکھی تھیں۔ ایک میڈیکل سٹور کی سلپ بھی اس کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ جس پر دوائیوں کی قیمت کا ٹوٹل سات سو اور کچھ روپے لکھے تھے۔

سارا معاملہ ان لوگوں کی سمجھ میں آ گیا۔ یہ بیمار سفید پوش تھا اور قیمتی دوائیاں خریدنے کی استطاعت اس میں نہیں تھی۔ یہ گھرانہ اپنی سوشل خدمات کے لیے کچھ زیادہ ہی شہرت رکھتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے نے بڑی ہمدردی سے اس سے پوچھا کہ اسے کیا تکلیف ہے۔؟

"اللہ کسی کی قسمت خراب نہ کرے۔" علیل بارلیش نے کراہتے ہوئے کہا۔ "چار جوان بیٹوں کا باپ ہوں۔" پھر اس نے روہانسی آواز میں ایک دردناک کہانی سنا دی کہ کس طرح بیوی کے مرنے پر اس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی نہ کی اور آج جب وہ کمانے کے قابل ہو گئے ہیں تو اسے کوئی منہ لگانے کو بھی تیار نہیں۔ اس کا اندازِ گفتگو شریف اور پڑھے لکھے لوگوں کا سا تھا۔ سننے والوں کے دل پگھل گئے۔ وہ اپنی کہانی سنا کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کو مڑا۔ لیکن انہوں نے اسے روک لیا اور اس کے انکار کے باوجود زبردستی ایک ہزار روپے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

چند روز بعد جب انہوں نے اخبار میں ایک نوسر باز کی گرفتاری کی خبر اور اس کے کارناموں کی تفصیل پڑھی اور تصویر بھی دیکھی تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ یہ وہی "ذاتِ شریف" تھے جن کی مدد انہوں نے زبردستی کی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ بیچارے خود ہی شرمندہ ہو کر چپ ہو رہے کہ اپنی بے وقوفی کا قصہ پولیس کو کیسے سنائیں۔

٭

غلام علی کا باپ حال ہی میں کافی جائیداد چھوڑ کر مرا تھا۔ غلام علی آوارہ لڑکوں

میں گھومنے پھرنے اور شہر جاکر فلمیں دیکھنے لگا۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے روپے پیسے کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ فلمیں دیکھتے دیکھتے شوٹنگ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور سٹوڈیوز کا رُخ کیا۔ باپ کی زندگی ہی میں صاحبزادے نے ایکٹرسوں سے باقاعدہ عشق بھی فرمانا شروع کر دیا تھا۔

بات آگے بڑھی تو سٹوڈیوز سے کوٹھے پر آمد و رفت شروع ہو گئی۔ غلام علی نے اپنے مختصر سے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ یہ ایکٹرسیں سوائے فنانسروں کے کسی سے عشق نہیں فرماتیں۔ لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا مالک ہونے کے ناطے اُس کے دل میں خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ وہ بھی فلم ساز بن جائے اور نہ صرف دولت میں ہاتھ رنگے بلکہ راجہ اندر بن کر بیٹھا رہے۔

باپ کی زندگی میں ایک مرتبہ جب اُس نے ماں کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو ماں نے صاف صاف کہہ دیا کہ والدین کی زندگی میں یہ بات ہرگز ممکن نہیں۔ اُس وقت تو غلام علی چپ رہا تھا۔ لیکن یہ خواہش اس کے دل سے نکلی نہیں تھی۔ باپ کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ اُس نے زمین کا سودا اونے پونے داموں کیا۔ کرنسی سے بریف کیس بھرا اور سٹوڈیوز کے شہر کا رُخ کیا۔

ٹیکسی سٹینڈ کے ایک کونے میں پان سگریٹ کی دکان سے اُس نے ایک فلمی دفتر کا پتہ پوچھا اور دکان میں لگے شیشے میں اُس کی ایک جھلک دیکھ کر "آغا صاحب" نے جو بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے وہیں کھڑے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ صرف غلام علی کو تول لیا، بلکہ اس کی قیمت کا اندازہ بھی لگا لیا۔

غلام علی کو شاید اُسی ایک دفتر کا نام یاد تھا۔ دکاندار کے بتائے ہوئے راستے پر وہ اُس بلڈنگ تک پہنچ گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تو اُس نے ایک بارعب شخصیت کو سگریٹ کے مرغولے بناتے وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا ——— یہ آغا صاحب تھے۔

فلم ڈائریکٹر آغا صاحب کو دیکھتے ہی تین چار آدمی لپک کر ان کے نزدیک پہنچ گئے

اور "آغا صاحب، آغا صاحب" ہونے لگی۔ وہ چاروں فلم ہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے آغا صاحب کی تعریفوں کے وہ پل باندھے کہ غلام علی جو تماشہ دیکھنے وہاں رُک گیا تھا خوش ہو گیا۔ آغا صاحب نئے آدمیوں کو چانس دیتے ہیں۔

اُسے پہلے ہی ایسے مہربان کی تلاش تھی۔ غلام علی نے چاہا کہ بڑھ کر اُن سے دُعا سلام لے لیکن ہمت نہ پڑی اور آغا صاحب آگے بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب؛ ملنا چاہتے ہیں آغا صاحب سے؟" ایک خوش پوش نوجوان نے ہمدردی کے لہجہ میں پوچھا۔

"جی ہاں!" غلام علی نے تھوک نگل کر کہا۔

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" نوجوان نے کہا: "یہ کوئی فلمی لیڈر تو ہیں نہیں اللہ کا نیک بندہ اس لائن میں آگیا ہے۔ ورنہ یہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر فرعون کی اولاد ہے۔ آغا صاحب کی مہربانی سے مجھے بیک وقت تین فلموں میں کام مل گیا ہے۔ ورنہ میری تو جوتیاں گھس گئی تھیں۔ سٹوڈیوز کے چکر کاٹتے کاٹتے۔" نوجوان نے آغا صاحب کی سخاوت اور شرافت کے پانچ چھ قصے بیان کر ڈالے۔ غلام علی اُس کی باتوں کے طلسم کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

دس بارہ منٹ کے بعد وہ دونوں بہترین دوست بن چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک ہوٹل میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی اپنی درد بھری کہانی سنا رہے تھے۔ اُس نوجوان کی کہانی بھی غلام علی سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ وہ بھی کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں ہزاروں روپے برباد کرنے کے بعد بالآخر آغا صاحب کی مہربانی سے کسی قابل ہوا تھا۔ اس نوجوان کا نام ظفر تھا۔ اُس کی گفتگو بڑی ٹھوس اور مدلل تھی۔ غلام علی کو ظفر اپنے کرائے کے مکان میں لے گیا اور اگلے روز آغا صاحب سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا۔

وہ رات غلام علی نے سوتے جاگتے گزاری۔ خوشی کے مارے اس کی تو نیند ہی اُڑ گئی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور دونوں تیار ہو کر آغا صاحب کے دفتر چلے گئے

پندرہ بیس منٹ بعد آغا صاحب تشریف لے آئے۔ ظفر اور غلام علی نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔ آغا صاحب سلام کا جواب دے کر بیٹھے۔ سب سے پہلے انہوں نے چپڑاسی کو ہدایت کی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے کیونکہ آج وہ مصروف ہیں اور ان کا مُنہ بولا بیٹا ظفر آیا ہوا ہے۔

ظفر نے غلام علی کا تعارف اپنے ایک عزیز کی حیثیت سے کرایا اور آغا صاحب سے درخواست کی کہ جس طرح انہوں نے ظفر کا ہاتھ تھاما تھا اسی طرح وہ غلام علی کو بھی سہارا دیں۔ آغا صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے ظفر کو بے بھاؤ کی سُنا دیں کہ اُس نے فلم انڈسٹری کو کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے۔ جس کا دل چاہا مُنہ اٹھا کر ہیرو بننے کے لیے آگیا۔ لیکن اس صورت حال کے لیے ظفر نے غلام علی کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا آہستہ آہستہ منت سماجت کر کے اُس نے آغا صاحب کو ٹھنڈا کر لیا۔

آغا صاحب نے پہلے تو غلام علی کو سمجھایا بجھایا کہ برخوردار یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اب بھی وقت ہے واپس لوٹ جاؤ۔ بڑے بڑے جی داروں نے اس میدان میں پہنچ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی اور بھاگ گئے۔ لیکن انہوں نے غلام علی کو ارادے کا پکا دیکھا تو گفتگو کا رُخ بدل گیا اور انہوں نے ان لوگوں کی کہانیاں سنانی شروع کیں جو بالکل ٹٹ پونجیے تھے اور آج وہ آسمان شہرت پر جگمگا رہے ہیں۔ دولت ان کی باندی ہے۔

غلام علی نے بتایا کہ اس کے پاس ستر ہزار روپے ہیں۔ آغا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے پچاس ہزار میں فلم تیار کر دی جس کا ہیرو غلام علی تھا اور ہیروئن سے ملنے اسے رات کو جانا تھا۔ پچاس ہزار میں فلم بننا ناممکن تھا۔ لیکن آغا صاحب کے اثر و رسوخ کے سامنے ہر چیز ممکن تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صرف بیس ہزار روپیہ ایڈوانس ایکٹروں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کریں گے۔ باقی پیسے فلم ریلیز ہونے کے بعد ادا کئے جائیں گے۔ تیس ہزار روپے شوٹنگ اور خام مال پر اُٹھ جائے گا اور جونہی آدھی فلم مکمل ہوئی وہ پارٹیوں سے ایڈوانس پکڑ کر باقی کام بھی چلا لیں گے۔

فلم کی تیاری اور غلام علی کی شہرت اور دولتمندی کا نقشہ انہوں نے ایسا پیش کیا کہ غلام علی جھوم اٹھا۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ رات کو پوری ہو گئی۔

رات کو آغا صاحب اور ظفر کی معیت میں غلام علی کو بازارِ حسن کے ایک کوٹھے پر لے جایا گیا اور اس کی ملاقات ایک نوخیز اور مستقبل کی اُبھرتی ہوئی فنکارہ سے کروائی گئی۔ جس کی من موہنی اداؤں نے غلام علی کو بُری طرح متاثر کیا۔ اُس رات غلام علی واقعی خود کو راجہ اندر محسوس کر رہا تھا۔ عارفہ جو اُس کی فلم کی ہیروئن تھی۔ اُس پر جان چھڑک رہی تھی۔

غلام علی کے حکم پر وہاں کڑاہی تکہ منگوا لیا گیا اور جب رات کو ناؤ نوش کا ہنگامہ گرم ہوا تو ظفر نے ہیرو اور ہیروئن کو آرام کروانے کے لیے الگ کمرے میں بھیج دیا۔ وہ رات غلام علی کی قسمت کے تابوت میں پہلا کیل ٹھونکتی گزر گئی۔ صبح غلام علی نے دس ہزار روپیہ بطور ایڈوانس ہیروئن کی ماں کو تھما دیا اور دو ہزار روپیہ انعام الگ دے دیا۔ آغا صاحب کا پانچ ہزار تو رات ہی ظفر نے انہیں دلا دیا تھا۔

صبح عارفہ اور غلام علی کو سٹوڈیو لے جایا گیا۔ ان کا سکرین ٹیسٹ ہوا اور سیٹ پر موجود قریباً سب ہی لوگوں نے انہیں مستقبل کا کامیاب ترین جوڑا قرار دیا۔ آغا صاحب نے اپنے دفتر ہی میں غلام علی کی فلم کا بورڈ لٹکا دیا۔ گرما گرم کہانی پہلے ہی سے موجود تھی۔ دوسرے تیسرے روز خالی کیمرے کے سامنے غلام علی سے الٹی سیدھی حرکتیں کروائی جانے لگیں۔ کبھی آغا صاحب پانچ ہزار میوزک ڈائریکٹر کے لیے ایڈوانس مانگ رہے ہیں تو کبھی تیس ہزار کیمرہ مین کے لیے اور کبھی کسی کے لیے۔ ہر روز آغا صاحب عارفہ اور اس کی ماں کی معیت میں دعوتیں اڑائی جاتیں۔ ہیروئن غلام علی کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے نکل جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستر ہزار روپیہ راکھ کی طرح اُڑ گیا پھر دس ہزار مزید اور پھر دس ہزار مزید۔ اس کے بعد غلام علی کی بیوہ ماں کو ہوش آیا اور اُس نے باقی پونجی رشتہ داروں کی مدد سے آخری عمر کے لیے قابو کر لی۔

اب کون ہیرو اور کون ہیروئن، لڑ دختم ہوئے تو یارانے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر فلک نے عجیب نظارا کیا کہ گاؤں کے چوہدری کا بیٹا در در کا محتاج ہوگیا اور آج چوہدری غلام علی "گاماں لائٹ مار" کے نام سے ایک سٹوڈیو میں ٹین کی چمکتی ہوئی سلیٹ ہاتھوں میں پکڑے بربادئ حالات کا رونا رو رہا ہے۔ اس چمکتی سلیٹ پر اُس کی بدقسمتی کی داستان بھی جلی حروف میں لکھی نظر آتی ہے۔

خدا کسی کو کچہری کا مُنہ نہ دکھائے۔ لیکن گردشِ حالات اچھے اچھوں کو کیا سے کیا دکھا دیتی ہے۔ تقدیر کے سامنے بندہ مجبورِ محض ہوتا ہے۔ اللہ دین بھی گردشِ حالات کا شکار ہو کر کچہری تک پہنچا تھا۔ شریف آدمی بے چارہ پانچوں وقت کا نمازی، بنس گھر، مسجد اور دکان کی تکون ہی میں اس کی زندگی چکرا رہی تھی کہ ایک روز اطلاع ملی کہ صاحبزادے تھانے میں بیٹھے والد کو یاد فرما رہے ہیں۔

اللہ دین گھبرا گیا۔ اُس نے بزرگوں سے سُن رکھا تھا کہ پولیس کی اگاڑی اور پچھاڑی دونوں ہی بُری ہیں۔ بچہ بھی شریف تھا پھر یہ آخر بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آن پڑی۔ تھانے پہنچ کر علم ہوا کہ کالج کے لڑکے بس کنڈکٹر کو تنگ کر رہے تھے۔ جب وہ زچ ہو کر اُن سے جھگڑ پڑا تو باقی سب بھاگ گئے اور اللہ دین کا بیٹا دھر لیا گیا۔ پولیس کو گدھے گھوڑے سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی شریف ہے یا بدمعاش۔ اس بات سے بھی انہیں کوئی علاقہ نہیں۔ وہاں تو جو پھنس گیا، پھنس گیا۔

پانچ چھ سو روپیہ تھانے میں اُٹھ گیا اور ضمانت نہ ہو سکی۔ بیٹا جوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلا گیا۔ اللہ دین شریف آدمی، عدالت، کچہری کی دُنیا سے بالکل ناواقف۔ اگلے روز جب متعلقہ عدالت کے باہر پہنچا تو ایک وکیل کا منشی اس سے ٹکرا گیا۔ اُس نے بڑی دردمندی سے اللہ دین کی کہانی سُنی۔ پھر اُسے عدالت کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے بعد ہدایت کی کہ وکیلوں کے چکر میں نہ پڑے۔ یہاں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلا کرتا۔ اُس نے اللہ دین کو "ملک صاحب" کے ہاں جانے کو کہا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور ملک صاحب مدد پر راضی ہو گئے تو وہ مل ملا کر فائل ہی غائب کروا دیں گے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی

بانسری، اگر ضمانت، مقدمے کے چکر میں پڑ گئے تو آدھی عمر گزر جائے گی۔

الہ دین سیدھا سادا بندہ، عدل و انصاف اور جرم و سزا کی اس دنیا کے بارے میں صرف یہ جانتا تھا کہ یہاں ٹاؤٹ ہوتے ہیں جو لے دے کر معاملہ رفع دفع کروا دیتے ہیں۔ ملک صاحب، کو بھی اُس نے ایسی ہی کوئی ہستی جان لیا۔ منشی اُسے لے کر ملک صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ ملک صاحب کے تو انداز ہی نرالے تھے۔

وہ اللہ دین کی سوچ سے مختلف کسی اور ہی قسم کی ہستی تھی۔ دروازے پر اُس جیسے تین چار اور ضرورت مند کھڑے تھے۔ جن کے کام حال ہی میں انجام پائے تھے۔ منشی اُسے لے کر اندر داخل ہوا تو ملک صاحب نے بغیر اُن کی طرف نگاہ اُٹھائے سلام کا جواب دے کر سامنے رکھے ایک ٹیلیفون کا نمبر گھمایا۔ پھر انہوں نے فون پر پوچھا کہ یہ فلاں تھانہ ہے؟ جواب ملنے پر حکم ہوا کہ ایس ایچ او کو بلاؤ۔ اس کے بعد انہوں نے تھانیدار کو وہ سنائیں جیسے وہ ملک صاحب کا زر خرید غلام ہو۔

فون رکھنے کے بعد بھی وہ گالیاں دیتے ہوئے منشی سے مخاطب ہوئے "جناب کیا مصیبت آگئی ہے؟" انہوں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں منشی نے اللہ دین کی کہانی سنا کر مدد کی درخواست کر دی۔ منشی کی بات ابھی نامکمل ہی تھی کہ ملک صاحب کے مُنہ سے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔

بالآخر منشی کی منت سماجت سے ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اللہ دین کو اگلے روز کچہری آنے کو کہا۔ اگلے روز اللہ دین خوش خوش کچہری پہنچا۔ ملک صاحب سے ملاقات ہوئی اور علم ہوا کہ "جج صاحب" ریٹائرنگ روم میں آرام فرما رہے ہیں۔ اللہ دین کی آنکھوں کے سامنے ملک صاحب سیدھے ریٹائرنگ روم میں جا گھسے۔ قریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ برآمد ہوئے اور "جج صاحب" کے "ریڈر" سے گفتگو کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اللہ دین اور منشی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کچہری کی کنٹین میں بیٹھے اللہ دین نے اُن کے لیے پُرتکلف چائے منگوائی۔

ملک صاحب نے کہا: "اجی کیسے کام نہ کرتا میرا۔ مَیں نے ہی تو اسے فلاں چکر سے نکالا تھا۔"

انہوں نے اللہ دین کو بتایا کہ پرسوں اُس کا بیٹا رہا ہو کر گھر پہنچ جائے گا۔ اور دو ہزار روپے ہتھیا لیے۔ جن میں سے ان کے لیے ایک چھوٹی کوڑی بھی حرام تھی۔"

وہ اللہ دین کو لے کر عدالت کے "ریڈر" کے پاس پہنچے۔ جس کے گرد اگرد لوگوں کا اس قدر جمگھٹا تھا کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ملک نے آگے بڑھ کر اللہ دین کا اُس سے تعارف کروایا۔

"ٹھیک ہے بزرگو!" ریڈر نے کہا۔ "پرسوں آپ گیارہ بجے آجائیں کام ہو جائے گا۔"

M-A-KHAN

دو ہزار روپے میں جان کی خلاصی ہونے پر اللہ دین نے سو نفل شکرانے کے گزارے اور دو روز بعد جب وہ متعلقہ عدالت میں پہنچا تو اُس کا کام واقعی ہو چکا تھا۔ ریڈر نے مقدمات کے کاغذات کی نقلیں تیار کروا رکھی تھیں۔

"لیکن ملک صاحب تو کچھ اور ....." اللہ دین نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا:

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ ریڈر نے آنکھیں نکالیں۔

جواب میں اللہ دین نے ساری کہانی سُنا دی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے بڈھے!" ریڈر نے کہا۔ "مجھے تو اس شخص نے منّت سے صرف اتنی بات کہی تھی کہ تم شریف اور ان پڑھ آدمی ہو۔ مَیں تمہارے کاغذات کی نقلیں تیار کروا دوں۔ مَیں نے خدا خوفی سے یہ کام کروا دیا۔ اندر خانے کیا چکر ہے۔ مجھے اس کا علم نہیں۔"

اللہ دین بے چارہ روتا پیٹتا پولیس سٹیشن پہنچا۔ تھانیدار نے اس کی کہانی سُن کر دو چار گالیاں اسے اور دس پندرہ اُس فراڈیے کو دیں، جس نے اُس کے ساتھ یہ ہاتھ کیا تھا اور دو کانسٹیبل اُس کے ہمراہ کر دیے کہ جاؤ اور فوراً اس نوسر باز کو گرفتار کر کے لاؤ۔ جیسے

"بس انہی کا منتظر بیٹھا ہو۔

کانسٹیبلوں کے خرچ پانی اور کرایہ جات پر ڈیڑھ دو سو روپے مزید اٹھ گئے پہلے تو اُسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ دفتر تھا کہاں۔ جب مختلف نشانیوں کی مدد سے ایک دفتر میں پہنچے تو وہاں ملک صاحب کی بجائے کوئی بھٹی صاحب فروکش تھے۔

اللہ دین نے اپنی داستانِ الم سنائی اور اس ملک زادے کا جغرافیہ سمجھایا تو بھٹی صاحب بولے کہ اس طرح کی شکل و شباہت کا منشی انہوں نے دو ماہ قبل ملازم رکھا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ دفتر میں زیادہ تر وہی بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن وہ تو پرسوں ہی آٹھ دس دن کی چھٹی اور ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ لے کر جا چکا ہے۔ کیونکہ گاؤں سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اُس کی بیوی مرنے ہی والی ہے۔

ایڈریس پر تفتیش کی گئی تو اس حلیے اور نام کے آدمی کا دُور دُور تک کوئی نشان دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ پولیس نے پراپرٹی ڈیلر سے ضمانت نیک چلنی طلب کر لی اور کیس داخل دفتر ہو گیا۔

مظلوم گھڑی فروش، دل کا مریض دُکھیا باپ، فلمی دنیا کا آغا صاحب اور کچہری کی دُنیا کا ملک صاحب چار شخصیتیں نہیں بلکہ ایک ہی ذاتِ شریف ہے جس کو لوگ حمیدا بوری والا کے نام سے جانتے ہیں۔

حمیدا اُس کا اصلی نام ہے؟ یہ بھی کوئی یقینی بات نہیں وہ بیک وقت چوہدری، بھٹی، ملک، خان، پراچہ، باجوہ، آغا اور نہ جانے کیا کیا کہلاتا ہے۔ میری اور اس کی پہلی ملاقات ایک وکیل صاحب کے ہاں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے دس پندرہ مقدمات میں سے کسی ایک کے متعلق جانکاری حاصل کرنے آیا تھا۔

ڈھلتی عمر، سرخ و سفید رنگت، اُس پر مہندی لگی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، سر پہ قراقلی ٹوپی شلوار قمیض پہنے وہ کسی محلے کی مسجد کمیٹی کا ممبر دکھائی دے رہا تھا۔ مَیں نے بھی سر راہے وکیل دوست سے پوچھ لیا تھا کہ ایسے شریف لوگ بھی اس کے پاس پھنس جاتے ہیں؟ اور جب اُس نے مجھے اس "شریف آدمی" کے کارنامے بتانے شروع کیے تو مجھے یقین ہو گیا

کہ وہ شریف کم اور "ذات شریف" زیادہ ہے۔ اُس کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال ہو چکی
میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے پچھلے تین چار سال سے مکمل توبہ کر لی ہے
اور کوئی واردات نہیں کرتا۔ لیکن اس پر اتنے کیس بن چکے ہیں کہ مرتے دم تک وہ عدا
کے چکر کاٹتا رہے تو بھی نہ نمٹ سکیں گے۔

یہ نوسر باز حمیدا بوری والا کے نام سے پولیس کے حلقوں میں مشہور تھا۔ میرا
واسطہ زندگی میں بڑے اچھے اور بہت بُرے قسم کے لوگوں سے رہا ہے۔ کئی لوگو
نے مجھے اپنی باتوں سے، عادات سے، کارناموں سے متاثر کیا۔ لیکن حمیدا بوری والا
ایک ایسی شخصیت تھی۔ جو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور میں اُسے شاید کبھی
بھلا پاؤں۔

میں نے وکیل دوست سے درخواست کی کہ وہ میرا تعارف اس سے کروا دے
پہلے تو اس نے مجھے منع کیا۔ کیونکہ اُسے اب بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر کبھی اس
کی فطری جبلت اس پر غالب آگئی تو عین ممکن ہے کہ حمیدا مجھ سے بھی کوئی ہاتھ
کر جائے۔

وکیل صاحب نے اگلے ہی روز ہماری ملاقات کروا دی اور میرا تعارف ایک
جرنلسٹ دوست کی حیثیت سے کروایا۔

"ارے واہ پھر تو اپنے ہی گھر کے بندے ہوئے۔" لفظ جرنلسٹ پر اس نے
قہقہہ لگایا۔

حمیدے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ نگر نگر گھوما تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات
میں مجھ سے خاصا فری ہو گیا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک ہوٹل میں چلے گئے، جہاں اُس
نے ماضی کی گرد جھاڑتے ہوئے اپنی کتابِ زندگی کے مختلف اوراق میرے سامنے
کھول دیے۔

اُس کی داستان طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ، سنسنی خیز اور طویل ہے۔
اتنی طویل کہ اسے لکھنے کے لیے بھی عمرِ خضر درکار ہو گی۔ میں نے اس کے چیدہ چیدہ

واقعات آپ کو سنا دیے ہیں۔ ان واقعات میں اس نے کمالِ احسان سے کام لیتے
ہوئے اپنی دُنیا کے کئی رازوں سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔

حمیدا کی پیدائش مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں ہوئی تھی۔ اُس کا باپ انگریزوں
کی فوج میں ملازم تھا۔ اس لیے گھر سے دُور دراز رہا تھا۔ یہ وہ دَور تھا۔ جب ہندوستانی
فلم انڈسٹری کا آغاز ہوا تھا اور لوگ اس طرف کھچے چلے جا رہے تھے۔ حمیدا کو فلمیں دیکھنے
کی لت سکول کے زمانے سے پڑ گئی اور ایک روز جب وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔
اپنے ایک دوست کے ورغلانے پر گھر سے فرار ہو گیا۔

اُس کا دوست حمیدا سے قریباً دس سال بڑا تھا۔ اور ایک مجرم گروہ کا ایجنٹ۔ اُس نے
حمیدا کو بمبئی میں سیدھا اپنے گورو کے ہاں پہنچا دیا۔ گورو نے دیکھا کہ لڑکا سمجھدار، تھوڑی
بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا اور سرخ و سپید رنگت کا مالک ہے تو اُس نے بجائے عام
قسم کا جیب کترا بنانے کے اُس کے متعلق کچھ اور ہی منصوبہ بنایا اور اُس پر عمل
پیرا ہو گیا۔

یہ گورو اپنے زمانے کا مشہور ٹھگ رہا تھا اور اپنا سلسلہ وہ مشہور زمانہ
امیر علی ٹھگ سے ملاتا اور اس پر بڑا فخر کیا کرتا تھا۔ اس نے حمیدا کی تربیت —
"سائنٹیفک، بنیادوں پر کی۔ اسے اپنے ڈیرے پر رکھنے کے بجائے اپنے گھر بیٹا
بنا کر رکھ لیا۔

حمیدا بتاتا ہے کہ بمبئی میں اُس نے جی بھر کے عیاشی کی نئی سے نئی فلم، گھومنا پھرنا،
سیر سپاٹے، کھانا پینا۔ یہی تھی اُس کی زندگی۔ اُس نے بڑے لمبے عرصے تک ماں باپ
کو بھلائے رکھا۔ کیونکہ گورو نے اُس کا ذہن دوسری طرف لگا دیا تھا۔ اُسے آپ "برین
واشنگ" کہہ سکتے ہیں۔"

وہ حمیدا کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ عمر صرف پندرہ سال تھی۔ وہ جیب تراش،
چاقو چلانے کا ماہر اور نوسر باز بن گیا۔ اُس نے اپنی گھناؤنی زندگی کا آغاز چھوٹی چھوٹی
وارداتوں سے کیا۔ پہلے پہل تو گورو ہر واردات پر اُس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ پھر

آہستہ آہستہ اُسے اعتماد ہونا شروع ہوگیا تو اُس نے حمیدا کو اکیلے اپنی صلاحیتیں آزمانے اور جوہر دکھانے کے لیے چھوڑ دیا۔

اُس نے بتایا کہ پہلے پہل اُس کا گورو اور وہ دونوں بھکاریوں کا بھیس بدل کر بمبئی کی امیر اور خصوصاً اینگلو انڈین اور فرنگی آبادیوں میں چوریاں کرتے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑا سیدھا سا طریقہ اپنایا تھا۔ دونوں سادھوؤں کا روپ دھار کر بھیک مانگنے نکل جاتے۔ اکثر وہ ماڈرن آبادیوں ہی کا رخ کیا کرتے تھے۔ بھیک مانگتے ہوئے وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتے کہ گھر کے افراد کی تعداد کتنی ہے۔ اکثر ایسے گھروں میں اُن کا واسطہ اِکّا دُکّا میم صاحبان یا ان کے خانساموں ہی سے پڑا کرتا تھا جنہیں جُل دے کر وہ گھر میں داخل ہوجاتے اور دن کے اُجالے میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چمپت ہوجاتے۔

بمبئی کوئی چھوٹا سا شہر تو نہیں تھا لیکن کب تک۔ بالآخر بھید کھل گیا اور پولیس کو اطلاع مل گئی کہ چور وہی دو پُراسرار سادھو ہیں جو خود کو کاشی اور متھرا کے پجاری بتا کر بھیک مانگنے نکلتے ہیں اور صفایا کر کے بھاگ جاتے ہیں۔ پولیس نے اپنا جال ان کے گرد بننا شروع کیا اور آہستہ آہستہ وہ گورو کے ڈیرے تک آن پہنچی۔

یہ گورو پہلے ہی ایک ریاست سے مفرور تھا اور یہاں آشرم کھولے بیٹھا تھا۔ اس آشرم کی آڑ میں وہ اپنا دھندہ بھی چلا رہا تھا۔ حمیدا نے بتایا:

"اُس رات جب انگریز پولیس کپتان اپنی دانست میں بڑی چالاکی سے آشرم کے گرد گھیرا ڈالتے ہوئے اچانک دھاوا بول کر اپنے جوانوں سمیت ہمارے آشرم میں داخل ہوا ہم ایک ٹرین کے آرام دہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھے، بڑے امیرانہ ٹھاٹ سے سفر کر رہے تھے۔ ہماری منزل کلکتہ تھی۔ دو مہینے تک تو گورو چیلے نے مل کر گلچھرے اڑائے۔ جب گنگال ہونے لگے تو آگے کی فکر دامن گیر ہوئی اور ہم نے وہی بمبئی والا چکر یہاں بھی شروع کر دیا لیکن کلکتہ کی پولیس قریباً آدھے سے زیادہ مسلمان اور انگریز افسروں

سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے جلد ہی ہمارا سراغ پالیا۔ یہاں دال گلتی نہ دیکھ کر ہم بادلِ نخواستہ دہلی چلے گئے۔ دہلی میں میرے استاد نے ایک نیا دھندہ شروع کر دیا۔ جس نے بعد میں "پلّہ" کا نام اختیار کیا۔ ہمارا طریق کار سائنٹیفک اور محفوظ تھا۔ ہم اپنے شکار کو تاڑ لیتے۔ پھر اُس کے راستے میں ایک پوٹلی پھینک دیتے۔ جس میں نقلی سونے کے زیورات ہوتے تھے۔ لیکن یہ نقل اتنی مہارت سے تیار کی جاتی تھی کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ یوں بھی جب آدمی لالچی ہو رہا ہو تو اُسے نقل اصل نظر آتی ہے۔ میرا گورو علم نفسیات پڑھے بغیر بہت بڑا ماہر نفسیات تھا۔ وہ انسانی فطرت کے کمزور پہلوؤں پر نظر رکھتا تھا اور اسے استعمال کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا.....

"آپ ذرا تصور کریں کہ ایک شخص ٹہلتا ہوا سڑک پر جا رہا ہے اچانک اُس کی نظر ایک کپڑے کی تھیلی پر پڑتی ہے وہ بڑی بے قراری اور تجسس سے بڑھ کر تھیلی اٹھا لیتا ہے۔ جس میں سونے کے زیورات رکھے ہیں۔ ابھی وہ تھیلی کو چھپانے کی فکر ہی کر رہا ہوتا ہے کہ ہمارا ایک ساتھی وہاں اچانک ایک کونے سے نمودار ہو کر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اُسے ایک طرح رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے۔ اب یہ ہمارا پکّا شکار ہے۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ ہمارا ساتھی سونے کی قیمت لگا کر اُس کا چوتھا حصّہ اس سے طلب کرتا ہے۔ اگر وہ شخص اس چکر میں نہ پھنسے اور کہے کہ وہ تو زیورات تھانے میں جمع کروائے گا۔ تو وہاں فوراً دوسرا ڈرامہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہمارا تیسرا ساتھی ایک بوڑھی عورت سمیت آجاتا ہے اور اُس پر چوری کا الزام لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی کچھ دے کر ہی اس کی جان چھٹتی ہے.....

"یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک بار جس پر "پلّہ" پڑ جائے وہ اُس سے بچ کر نکل جائے اس تیکنیک میں ہم نے نئی نئی اختراعیں کیں اور ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ آپ کی عقل حیران رہ جائے۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

"یو۔ پی کے ایک نواب صاحب کو شکار کا شوق تھا۔ ایک رات وہ اپنے دوستوں

کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ وہ لوگ جس علاقے میں مقیم تھے۔ اس کے قریب آثارِ قدیمہ تھے۔ ان کھنڈرات میں سے اکثر لوگوں کو سونے کے سکے اور دیگر نوادرات ملے تھے اور ان واقعات نے خاصی شہرت پائی تھی۔ ہمارے گورو نے اسی شہرت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ایک طریقہ سوچ لیا جو کسی انگریزی ناول کے پلاٹ سے کم شاندار نہیں.....

"رات کا دوسرا پہر تھا۔ نواب صاحب اور ان کے ساتھی شغلِ مے نوشی میں مصروف تھے کہ اچانک ایک آدمی جو خاصا زخمی تھا وہاں آ گھسا۔ نواب اور اُس کے ساتھی گھبرا گئے کہ یہ کیا مصیبت آ گئی۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی کہ وہ خوفزدہ ہو گئے۔ زخمی نے ان سے درخواست کی کہ اُس کے تعاقب میں کچھ لوگ ہیں جو یقیناً اسے مار ڈالیں گے اُس کے پاس ایک بوسیدہ سی ڈائری تھی۔ جو اُس نے نواب کے ساتھیوں کو دے کر کہا۔ اگر زندگی باقی رہی جس کی امید نظر نہیں آتی وہ اُن سے ڈائری واپس لے لے گا اور وہ باہر نکل گیا۔

"ابھی اُسے گئے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ تین چار مسلح آدمی وہاں آ گئے انہوں نے نواب اور اُس کے ساتھیوں کو دھمکانا شروع کر دیا کہ مفرور کو انہوں نے چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے ساری حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ پھر انہیں دھمکیاں دیتے چلے گئے۔ وہ بگولے کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔ شراب کا اثر بھی تھا۔ اُن کے جانے کے بعد نواب کو خیال آیا کہ وہ لوگ اس زخمی کا تعاقب کیوں کر رہے تھے۔ پھر ان کا خیال ڈائری کی طرف گیا۔ اس کے اوراق بوسیدہ اور تحریر شکستہ تھی۔ انہوں نے ڈائری کا مطالعہ کیا۔ اس میں اس علاقے کے ایک قدیم مندر سے متعلق چونکا دینے والی بات لکھی گئی تھی کہ مندر کی فلاں جگہ سے کھدائی کرنے پر خزانہ برآمد ہو گا۔ یہ خزانہ دورانِ غدر (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں ایک ریاست کے مہاراجہ نے یہاں چھپا دیا تھا۔ اُسے دوبارہ نکالنے کی مہلت نہ مل سکی کیونکہ وہ غدر میں مارا گیا تھا.....

"جس شخص نے یہ تحریر لکھی وہ راجہ کا دیوان تھا۔ یہ اُس کی ذاتی ڈائری تھی۔ اب [illegible] بات نواب اور اُس کے ساتھیوں کی سمجھ میں آ گئی کہ اصل معاملہ اُس دفینے کا ہے [illegible] جگہ جس کا ذکر اس ڈائری میں موجود تھا۔ یہاں سے بمشکل بیس بائیس میل دور تھی۔

"نواب اور اس کے ساتھیوں نے اس خزانے کی تلاش کا ارادہ کر لیا۔ ابھی آدھی رات باقی تھی۔ انہوں نے کل کا انتظار بھی مناسب نہ سمجھا اور خزانہ حاصل کرنے چل دیے ڈائری کے مطابق ٹوٹا پھوٹا مندر بھی مل گیا۔ وہ مختلف نشانیاں بھی وہاں موجود تھیں، جن کا ذکر ڈائری میں کیا گیا تھا۔ ایک مخصوص مقام پر جس کی نشاندہی ڈائری نے کی۔ انہوں نے کھدائی شروع کر دی۔ اُن کی توقعات کے مطابق جلد ہی وہاں سے چاندی کے پرانے سکے دستیاب ہونے لگے۔ اس کے بعد کچھ پرانے برتن نکلے اور وہ گھنٹے کی بان لیوا کھدائی کے بعد گوہرِ مقصود بھی ہاتھ آ گیا۔ یہ ساگوان کی لکڑی کے تابوت میں رکھی ہوئی سونے کی ایک مورتی تھی جس پر بڑا نفیس ہیروں کا جڑاؤ کیا گیا تھا.....

"عین اس لمحے جب وہ مورتی کو دیکھ رہے تھے۔ گورو کے مسلح ساتھی آ دھمکے اور انہیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ انہوں نے نواب کے ساتھیوں کو دھمکی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ تو ان کا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں شک تھا کہ ڈائری یہیں موجود ہے.. مختصر یہ کہ بات یہاں پر ختم ہوئی کہ مورتی کے عوض نواب اور اُس کے ساتھی ہمیں ۲۰ ہزار روپے دیں گے۔ جو اُس زمانے میں بہت بڑی بات تھی لیکن یہ بھی مدِ نظر رہے کہ مورتی بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم کی نہیں تھی۔ راتوں رات خفیہ تجوریوں کے منہ کھل گئے۔ دوران لوگوں نے آپس میں مل کر ۲۰ ہزار روپیہ ہمیں فراہم کر دیا۔ صبح جب انہوں نے کسی سنار یا جوہری کو بلا کر مورتی کی قیمت معلوم کرانی ہو گی تو انہیں یہی جواب ملا ہو گا کہ یہ سب مال نقلی ہے۔ اس واقعے نے بہت شہرت حاصل کی اور کئی روز تک زبان زدِ خاص و عام رہا.....

میرے گورو نے ایسی بے شمار وارداتیں کی تھیں۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ یہ پیشہ اُستے ورثے میں ملا ہے اور اُس کی قریباً آدھی مجرمانہ زندگی بنارسی ٹھگوں کے ساتھ گزری ہے۔ ان دنوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ پولیس مجرم کو پکڑ کر دم لیتی تھی۔ سزا اتنی سخت کہ جو ایک مرتبہ جیل میں چلا گیا۔ وہ ساری عمر جیل کے تصور ہی سے کانپتا رہا۔ جیلوں میں آج کل جیسی سہولتیں نہیں ملتی تھیں... حزانے والی واردات شاید اس دُور کا سب سے بڑا فراڈ تھا۔ جس نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے ہوشیار پولیس افسر اس کیس پر کام کرنے لگے۔ لیکن ہم اُسی روز وہ شہر چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے گروہ کا ایک آدمی اس واردات کے تقریباً ایک سال بعد کسی اور واردات میں گرفتار ہوا تو اُس نے پولیس کو اس واردات کی تفصیل بتا دی۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی پکڑے گئے۔ لیکن مَیں اور گورو محفوظ رہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک تھا۔ لیکن جس طرح پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ہیں ہندوستان میں کم از کم اتنے بڑے پیمانے پر واردات کرنے کا موقع پھر نہ مل سکا۔

"یہ غالباً ۱۹۴۷ء کا دوسرا یا تیسرا مہینہ تھا۔ مَیں اب کڑیل جوان بن چکا تھا۔ گھر سے فرار ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران مَیں نے کبھی کبھی گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ لیکن میرے گھر والے جو اَب میری حقیقت جان چکے تھے۔ مجھ سے کھنچنے لگے۔ ایک روز والد نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر راہِ راست پر آ جاؤ تو بسم اللہ ورنہ جہاں جی چاہتا ہے چلے جاؤ۔ ٹھگی اور نوسر بازی میری سرشت میں داخل ہو چکی تھی۔ مَیں اپنے شہر بھی آتا تو اکّا دکّا واردات کر دیتا۔ ایک مرتبہ پولیس میرے گھر کے دروازے تک آ کر واپس گئی۔ اس کے بعد مَیں نے مناسب نہ سمجھا کہ دوبارہ یہ نوبت آئے۔ مَیں نے ایمانداری سے اپنے حالات پر غور کیا۔ مَیں بُرائی کی دلدل میں اس قدر گہرا دھنس چکا تھا کہ نکلنا ممکن نہ تھا۔ مَیں نے اپنے آپ کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ میرے ماں باپ اور بہن بھائی بھی میری وجہ سے بدنام ہو رہے تھے، لیکن بُرائی جیت گئی اور مَیں ہار گیا۔ دوستوں نے مجھے گھر سے بھاگ چلنے پر مجبور

کر دیا....

اب مَیں تھا اور میرا گورو ... ایک روز بڑا عجیب حادثہ گزرا۔ گورو نے ایک بازار میں ایک انگریز کو تاڑا۔ جس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں پرس رکھا ہوا تھا۔ ہمارا طریقۂ واردات یہ تھا کہ ایک شخص سائیکل پر تیار رہتا۔ دوسرا واردات کرتا۔ خطرے کی صورت میں وہ سائیکل کی طرف بھاگتا۔ سائیکل چلانے کے ہم ماہر تھے۔ وہ سائیکلوں کا دَور تھا۔

میرے اُستاد کے ہاتھ بڑے پکے تھے۔ لیکن اس روز اُس نے اناڑیوں کی طرح کچا ہاتھ ڈالا۔ انگریز خبردار ہو گیا۔ اُستاد کے ہاتھ بٹوہ تو آ گیا تھا۔ لیکن اس نے انگریز کو چوکنا ہوتے دیکھا تو فوراً چاقو نکال لیا۔ یہ انگریز کوئی عام آدمی نہیں بلکہ علاقہ کا ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ ہم چونکہ یہاں نئے آئے تھے۔ اس لیے اسے نہیں جانتے تھے.....

"پولیس کپتان پہلے ہٹا اور پلٹا تو اس کے ہاتھ میں سرکاری ریوالور دکھائی دیا اُستاد نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چاقو کو ٹھگوں کے مخصوص انداز سے گھما کر اس پر پھینکا۔ نشانہ چُوک گیا اور بجائے دل میں پیوست ہونے کے چاقو اس کے کندھے میں لگا۔ پولیس کپتان نے فوراً ریوالور فائر کر دیا۔ اب اُستاد کے لیے سوائے فرار کے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا۔ وہ بھاگا اور دو گولیاں اُس کی پشت میں لگیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ مجھ تک پہنچ گیا۔

"میرے تو پہلے ہی ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح مَیں نے اُسے سائیکل پر بٹھایا اور سائیکل دوڑا دیا۔ پولیس کپتان کو زخم کاری لگا تھا۔ وہ گر پڑا اور لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس مہلت سے ہم نے فائدہ اٹھایا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک محفوظ جگہ نہر کے کنارے پہنچ کر اُستاد کی سانس اکھڑنے لگی۔ اُس نے مجھے سائیکل روکنے کے لیے کہا۔ مَیں نے استاد کو زمین پر لٹا دیا اور چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کے مُنہ میں پانی ڈالوں لیکن گورو نے ہاتھ کے اشارے سے رُک جانے

کو کہا۔ اُس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اُس نے مرتے مرتے پہلی نصیحت کہ بچّہ! یا تو اس دھندے سے توبہ کر لو۔ اگر جاری ہی رکھنا ہے تو کبھی کسی کو ساتھی نہ بنانا۔

"مَیں نے اس کے بعد ساری زندگی اس اصول پر عمل کیا اور کبھی کوئی باقاعدہ گروہ بنایا نہ کسی اور گروہ میں شامل ہوا۔ وقتی طور پر لوگ آتے جاتے رہے اور دھندا چلتا رہا۔ اُستاد کی موت نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا۔

لیکن گورو کی موت کا صدمہ مجھے کراچی لے گیا۔ کراچی بڑا شہر، بڑے لوگ، بڑے ہنگامے، شہر کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میرے دھندے کے لیے یہ شہر موزوں تھا۔ مَیں نے دھندہ شروع کر دیا اور ایک بار جیل جانا پڑا۔ اس قید کے دوران ایک پرانے ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ یہاں وہ جمالو کے نام سے مشہور تھا۔ جمالو کو مَیں نے اپنے گورو کے ہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن گورو نے اس کا تعارف میرے ساتھ نہیں کروایا تھا۔ اس میں بھی یقیناً کوئی مصلحت رہی ہو گی۔ میرا استاد بڑا گہرا آدمی تھا۔ اُس کو مکمل طور پر خدا کی ذات ہی سمجھ سکتی تھی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ اُس کی موت تک میں اسے ہندو سمجھتا رہا۔ مرنے کے بعد اُس کے مسلمان ہونے کا علم ہوا اور اس بات کا بھی کہ وہ پنجاب کے ایک علاقے کا رہنے والا تھا۔۔۔۔

"جو شخص میرے استاد کا ساتھی رہا ہو وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ پتہ چلا کہ جمالو پر جعلی سونا فروخت کرنے کا الزام ہے۔ جعلی سونا فروخت کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ ہمارے پیشے کے بڑے پرانے گرگے ہی اس میدان میں پاؤں رکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔ جمالو دوسری بار کے میں بند تھا۔ ہماری ملاقات جیل کے احاطے میں ہوئی۔ اُس نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے اُسے یقین دلایا کہ مَیں اُسے جانتا ہوں۔ گورو کے ذکر نے اُسے کچھ سوگوار کر دیا تھا۔ بہت دیر تک میرے استاد کی باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں کسی زمانے میں بڑے پکے یار رہے تھے۔ پھر استاد کو اُس سے الگ ہونا پڑا اور اس کی موت سے پانچ چھ ماہ پہلے

اُن دونوں کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔

"مَیں نے جمالو سے کہا کہ وہ میرے اُستاد کا پیر بھائی ہے۔ اس ناطے میں اُس کا بھی شاگرد ہوں۔ یہ روز روز کی بک بک جھک جھک ٹھیک نہیں۔ کوئی سیدھا سادا نسخہ بتا دو کہ باقی زندگی آرام سے گزر جائے۔ جمالو پہلے تو خاموش رہا۔ پھر اگلے روز کچھ بتانے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے روز ہماری ملاقات ہوئی تو ہم دونوں اپنی اپنی مشقت سے فارغ ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ جمالو پہلے تو چپ چاپ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر بولا: "پیر بنو گے؟ .... مزے کرو گے بیٹا! میرے پیر بھائی کے شاگرد ہو ورنہ یہ راز تو قبر میں میرے ساتھ جاتا ..."

"ضرور بنوں گا۔" میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

"جا بچّہ موج کر۔ اب ساری زندگی کوئی دھندہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔" اُس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی اور میری ٹریننگ شروع ہو گئی....

"میری سزا چھ ماہ تھی۔ ایک مہینہ معافی کا باقی پانچ ماہ میں جمالو سے ٹریننگ لیتا رہا۔ اس دوران مَیں نے داڑھی بڑھا لی تھی اور اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔ نمازیں پڑھنا بھی شروع کر دیں۔ آخری ایک ماہ مَیں نے بغیر نہائے گزارا اور جیل سے رہا ہو کر باہر نکلا تو میرے سر کے الجھے ہوئے اور داڑھی کے بے ترتیب بالوں نے مجھے کوئی اور ہی بہروپ دے دیا تھا۔

"باہر آ کر مَیں نے اپنے دو قابلِ اعتماد ساتھی تلاش کیے اور ایک عورت کو ہمراہ لیا جو ہمارے دھندے میں ہمارے لیے اکثر کام کرتی رہتی تھی۔ سبز رنگ کا ایک لمبا سا دوشالہ جس میں بے شمار جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ مَیں نے زیبِ تن کر لیا۔ اس کی مختلف جیبوں میں کیا کیا کام موجود تھا۔ اِس کا علم میرے اور خدا کی ذات کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ پنجاب کے ایک دور دراز اور خاصے جاہل علاقے کو ہم نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور جانگلیوں کے ایک گاؤں کا انتخاب کر لیا۔

"گاؤں کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے میں نے ڈیرے ڈال دیے اور درخت

سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ علی الصبح جب گاؤں کے کچھ لوگوں نے وہاں ایک فقیر خدامست کو دیکھا تو میرے نزدیک آ گئے اور ایک گھنٹہ مجھے ہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن مَیں خاموش رہا، بلکہ اُن سے بالکل بے نیاز منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ وہ بے چارے بھاگے بھاگے گاؤں میں گئے اور ایک پیر فقیر کی موجودگی کی دھوم مچا دی۔ گاؤں کے لوگ اُس طرف اُمڈتے چلے آئے ... تین روز تک وہ لوگ مجھے متوجہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ دُنیا بھر کے لوازمات کا ڈھیر انہوں نے میرے سامنے لگا دیا لیکن مَیں نے ان کی طرف نظر بھی نہ کی اور اپنے حال میں مگن رہا۔ یہ تین دن اور راتیں میں نے جاگ کر گزار دی تھیں اور اس کے لیے پہلے سے کافی پریکٹیس کر رکھی تھی۔ چوتھے روز میری طرف سے پہلی "کرامت" کا مظاہرہ ہوا۔

"میرا ایک ساتھی ایک بچے کو لیے آیا جسے بھڑ نے کاٹا تھا اور بچہ بُری طرح رو رہا تھا۔ مَیں نے اس کے ڈنک پر ہاتھ پھیرا۔ بچہ پُرسکون ہو گیا۔ اُس کو سوجن بھی نہ ہوئی اور آرام آ گیا۔ جانگلی لوگ فوراً میرے گن گانے لگے۔ یہ بالکل معمولی سی بات ہے۔ اگر آپ بھی چاہیں تو یہ قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ ساون بھادوں سے پہلے آموں پر بُور آ جاتا ہے۔ اگر آپ آم کے بُور کو دیر تک ہاتھوں میں مسلتے رہیں اور یہ عمل تین چار روز جاری رکھیں تو ڈیڑھ اڑھائی ماہ تک آپ کو بھی یہ قوت حاصل ہو جائے گی کہ بھڑ کے کاٹے پر ہاتھ پھیر دینے سے سوجن نہیں رہے گی۔ اس کے بعد تو وہاں بھڑ سے کاٹے ہوئے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

"دوسری کرامت کا مظاہرہ بھی تھوڑی ہی مدت کے بعد ہو گیا۔ ایک عورت درد سے بے حال چیختے چلاتے بچے کو لے کر آئی۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے ایک کمرہ سا بنا دیا تھا۔ مَیں اس میں بند یادِ الٰہی میں مصروف رہتا اور وہ باہر جمگھٹا لگائے بیٹھے رہتے۔ دن میں ایک دو مرتبہ میں باہر آ کر ان کو اپنے درشن کروا دیتا۔ صرف ایک شخص کو اندر جا کر مجھ سے ملنے کی اجازت تھی اور وہ میرا خاص آدمی تھا۔

"یہ روتا ہوا اور درد سے بے حال بچہ ہمارے گروہ کی اُسی عورت نے وہاں پہنچایا تھا

اس کے خاوند نے باہر کھڑے ہو کر التجا کی کہ بچے کے حال پر ترس کھا کر اُس کے لیے دُعا کروں۔ مَیں دروازے پر آیا چیختے چلاتے بچے پر نظر ڈال کر اندر چلا گیا۔ اندر بیٹھ کر مَیں نے افیون ملی سیاہی سے تعویذ لکھا اور اُسے دے دیا۔ میرے خادم خاص نے وہ تعویذ پانی میں گھول کر بچے کو پلا یا۔ چند منٹ کے بعد ہی بچہ گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے ماں باپ میرے پاؤں میں پڑے مشکور ہو رہے تھے۔

"اس علاقے میں جو ہڑ بے شمار تھے اور مچھروں کی بہتات سے ملیریا پھیل رہا تھا۔ میرے گروہ کے لوگ کونین کا سفوف مجھے پہنچا دیتے اور مَیں چینی میں ملا کر اُس پر جنتر منتر پڑھ کر پھونکتا اور مریض کو پانی میں گھول کر پی جانے کی ہدایت کرتا۔ چینی کا ذائقہ کونین ملنے سے کڑوا ہو جاتا۔ جسے میرے خاص لوگ پیر جی کے کلام کا اثر بتاتے۔ یہ سفوف ملی چینی پیتے ہی مریض کو خوب پسینہ آتا اور بخار اتر جاتا۔

"اسی طرح مختلف امراض کا علاج ہونے لگا۔ سر درد دانت درد دُور کرنے کا تو میں اسپیشلسٹ بن گیا۔ دُور دراز کے گاؤں سے لوگ علاج کروانے میرے پاس آنے لگے۔ میں سارے دن میں صرف دو گھنٹے "فیض" پہنچاتا باقی تمام وقت حجرے میں لیٹا رہتا۔ جہاں میرے مقربین میری خاطر مدارت میں مصروف رہتے۔ رفتہ رفتہ میرا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ نذرانے کے نام پر دولت کے ڈھیر لگنے لگے۔ میرے لیے خصوصی کھانے پک کر آتے لوگوں کی شدید خواہش ہوتی کہ میں اُن پر خصوصی مہربانی فرماتے ہوئے اُن کے ہاں کچھ دن کے لیے قیام کروں لیکن میں سینکڑوں میں سے بمشکل پانچ خوش قسمتوں کو شرف باریابی بخشا کرتا ....

"ان لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر مَیں نے دونوں ہاتھوں سے انہیں خوب لوٹا۔ میری ایجنٹ عورت لوگوں کے گھروں میں چلی جاتی اور گھر کے کسی کونے میں چوری چھپے (تعویذ) سر کے بال اور اسی طرح کی کچھ چیزیں چھپا دیتی۔ اس کے بعد بڑی استادی سے وہ ان لوگوں کو وہم میں مبتلا کرتی کہ اُن پر کسی دُشمن نے جادو کروا دیا ہے۔ انہیں میرے پاس لایا جاتا اور میں چلہ کاٹ کر اگلے روز حقیقتِ حال بتانے کا وعدہ کرتا۔ اگلے روز

میں بڑے جلال میں آکر انہیں حکم دیتا کہ فلاں جگہ سے تعویذ یا فلاں شے زمین کھود کر برآ
کر لو۔ اس کے بعد وہ میرے پکے مرید ہو جاتے۔

"ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ میں نے ایک اور گھناؤنا دھندا بھی شروع کر
انسانی ہوس اُسے کیا کیا راہ سجھاتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ بھی مجھے یہ روپ دھارنے
کے بعد ہوا تھا۔ دیہات کی عورتیں مجھ سے مختلف مرادیں پوری کرانے آیا کرتی تھیں۔ کسی
کو وہم تھا کہ اُس کی ساس نے اُس کے خاوند پر تعویذ کروا کر اُسے قبضے میں کیا ہوا ہے
تو کوئی اپنے خاوند کو بندۂ بے دام بنانے کی فکر میں ہلکان رہتی تھی، کوئی عورت کسی کے
ساتھ خراب تھی تو کوئی کسی غیر مرد کو حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

"ایسی عورتوں کو میں اکیلے اکیلے اپنے حجرے میں بلایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک انتہائی
حسین الھڑ قسم کی مٹیار میرے پاس آئی۔ اُس کی عمر بمشکل سولہ سترہ برس تھی اور اُس کا
خاوند جو اُس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ بلا مبالغہ اُس کے باپ سے زیادہ عمر کا تھا۔
لڑکی کے ماں باپ نے اُسے زمیندار کے ہاتھ فروخت کر کے اُس کا بیاہ کیا تھا۔ اُس نے
رو رو کر مجھے بتایا کہ اُس کے جذبات کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس قسم کی عورتیں اور بوڑھوں
کی نوجوان بیویاں میری خاص مریدنیاں بن جاتی تھیں۔ میں بے اولاد عورتوں کو اولاد
بھی دیا کرتا تھا۔ میرے گروہ کے دوسرے لوگ بھی اس گھناؤنے کھیل میں میرا پورا پورا
ساتھ دے رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی اندھی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ ساری
رات کے لیے اپنی بیٹیوں کو میرے ہاں چھوڑ جاتے کہ پیر صاحب رات کو اُن کے لیے چلہ
کاٹ کر اُن پر پھونکیں مارتے ہیں۔۔۔۔

"دو سال تک میرا یہ کھیل جاری رہا۔ ایک روز ایک خیال میرے ذہن میں سر
اٹھانے لگا۔ میں نے کہا کہ سو دن چور کا اور ایک دن ساہو کا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو یہ بھید
کھلے گا۔ یہ جانگلی لوگ ہمارا مُردہ بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔ قتل کرنا ان کے
بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔ راتوں رات میں نے
وہ رقم سنبھال لی۔ اپنے اُس بہروپ سے نجات حاصل کی اور وہاں سے جان بچا کر نکل آیا۔

اس کے بعد میں نے دوسرے شہر کا رُخ کیا اور بڑی کامیابی سے یہ ناٹک وہاں بھی کھیلتا
رہا۔

"پانچ چھ سال میرا یہ دھندا جاری رہا۔ لیکن ایک روز ایک گاؤں کے لوگوں کو مجھ
پر شک گزرا۔ انہوں نے مجھے کسی کی بیوی کے ساتھ پکڑ لیا۔ میرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا
اور سارے گاؤں میں گھمایا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے میری اچھی خاصی ٹھکائی کی اور
مجھے حوالۂ پولیس کر دیا۔

اُس جرم میں دو سال قید بھگت کر میں رہا ہوا تو پھر کبھی یہ سوانگ نہ بھرا ایک اور
شہر کا رُخ کیا اور چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔ اس دوران کئی مرتبہ جی میں آئی کہ
اس دھندے پر لعنت بھیج کر اپنا گھر بساؤں اور زندگی کے بھلے چنگے دن گزاروں۔ لیکن
ہائے رے انگریز کے قانون کی برکتیں جو وہ یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اس ملک میں جس شخص کا
نام ایک دفعہ پولیس کی لسٹ میں آ گیا۔ وہ پھر کبھی شریفانہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
اُس کے لیے زندہ رہنے کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ چپ چاپ پولیس
کو اُس کا حصّہ پہنچاتا رہے اور اپنے کام میں جتا رہے۔ جب کبھی میں نے خلوصِ دل سے
اس بات کی کوشش کی کہ میں یہ ذلیل پیشہ چھوڑ دوں۔ مجھے کسی نہ کسی الزام میں گرفتار
کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ یہ میرے عروج کا
زمانہ تھا۔ ان دنوں میں ہاتھ ذرا لمبے ہی مارا کرتا تھا۔ میرے علم میں بابو صدیق نام کا
ایک آدمی آیا۔ جسے راتوں رات امیر بننے کا شوق تھا۔ ایسے لوگ جو لالچ اور ہوس
کے مارے ہوئے ہوں۔ ہمارے خاص شکار بنتے ہیں۔ میں نے اسکیم تیار کی اور بابو
صدیق سے ہم نے کہا کہ ہمارے آدمی انڈیا سے چیزیں لے کر آئے ہیں جو ہم سستے داموں
اُسے مہیا کر سکتے ہیں۔

"بابو صدیق کے تعلقات ایک سنار سے تھے۔ اُس نے سنار سے ۴۰ ہزار روپے
ادھار پکڑے اور اپنی زندگی بھر کی جمع شدہ پونجی بھی اس میں شامل کر کے پچاس ہزار روپے

کا بندوبست کرلیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ واہگہ سے آنے والی ٹرین میں ہمارا آدمی مال لے کر آئے گا۔ تم اس سے مال وصول کرنے کے بعد اُسے رقم ادا کردگے۔ دس ہزار روپیہ ہم نے ایڈوانس اس سے حاصل کرلیا۔ ڈرامہ تیار تھا۔ بابو صدیق چالیس ہزار روپیہ بیگ میں لیے مقررہ مقام پر چاندی کا منتظر تھا۔ بالآخر ٹرین آئی اور ہمارا متعلقہ آدمی چاندی کا بھرا بیگ لیے اس طرف آگیا۔ ہم نے بابو صدیق کو یقین دلا رکھا تھا کہ کسٹم والے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

"چاندی آئی۔ بیگ کے اوپر کے حصے میں چمکتا ہوا سلور رکھا تھا۔ جسے ہم نے چاندی کی شکل دے رکھی تھی۔ ابھی وہ لوگ معائنے میں مصروف ہی تھے کہ "انٹیلی جنس" کا جعلی چھاپہ پڑ گیا۔ باقاعدہ وردیوں میں ملبوس "اسپیشل ڈیوٹی" کے لوگوں نے چھاپہ مارا تھا۔ انہوں نے چاندی اور چالیس ہزار روپیہ قبضہ میں لے لیا اور ہمارے "منت سماجت" کرنے پر بابو صدیق کو رہا کردیا۔

"یہ سب کچھ پہلے سے تیار کردہ ڈرامے کا حصہ تھا۔ سمگلر، چاندی، انٹی سمگلنگ، سپیشل سٹاف سب کچھ جعلی تھا۔ بابو صدیق عزت دار آدمی تھا۔ اُس نے راتوں رات لکھ پتی بننے کے لالچ میں رقم اکٹھی کی تھی گھر میں جوان بیٹی ہاتھ پیلے کرنے کے لیے تیار تھی۔ لڑکے والوں کا تقاضا رخصتی کے لیے بڑھتا جارہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے دو ماہ میں بیاہ دینے کا چیلنج کر دیا۔ کیونکہ لڑکے کو باہر جانا تھا۔ ان سارے عوامل نے مل ملا کر اثر دکھایا۔ ایک روز یہ منحوس خبر ملی کہ بابو صدیق نے خودکشی کرلی ہے۔ میں لاکھ بُرا سہی۔ لیکن ابھی میرا ضمیر شاید زندہ تھا کہ میں نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور خود کو اس کی موت کا ذمہ دار گردانا۔ میرا آنا جانا بابو صدیق کے گھر تھا۔ اُس کی موت نے ایک بُرے انسان کو نیکی کا راستہ دکھا دیا۔ میں نے اُس کے گھر والوں کو یقین دلایا کہ میں انہیں کبھی بابو صدیق مرحوم کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا اور اُن کی خدمت میں جُت گیا۔ میں نے بابو صدیق کی روح کو خوش کرنے کے لیے نہ صرف اُس کا قرض ادا کیا بلکہ اُس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر ڈولی میں بٹھایا اور رخصت کیا۔ ممکن ہے اس عمل سے میرے گناہوں کا کچھ ازالہ ہو جائے۔ اس کے بعد میرے پُرانے ساتھیوں نے کئی

مرتبہ لالچ دیا۔ پولیس نے تنگ کرنے کے تمام حربے آزمائے۔ اللہ کا احسان ہے کہ میں ثابت قدم رہا اور انشاءاللہ مرتے دم تک کوئی جرم نہیں کروں گا۔"

حمید البوری والا کی کہانی ختم ہوگئی۔ میری اور اُس کی ملاقات تین چار سال قبل ہوئی تھی۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنا ٹھکانہ نہیں بتایا۔ مجھے بھی نہیں حالانکہ میں شاید دنیا میں وہ واحد آدمی ہوں جسے اس نے اپنی کہانی سنائی ہے۔ میرے وکیل دوست کے پاس وہ اپنے مقدمات کے خاتمے تک آتا رہا۔ پھر یکایک غائب ہوگیا۔

وہ اب کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اس کا علم تو مجھے نہیں۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دوبارہ کبھی اپنی پُرانی دنیا میں واپس نہیں جائے گا۔ کیونکہ نیکی کا جذبہ اس میں زندہ تھا جو بہرصورت غالب آکر رہا۔

∴

یاروں کے یار

مجھے حال ہی میں عدالت نے میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے دس سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جج کے دل میں خدا نے میرے لیے رحم کے جذبات پیدا کر دیے۔ ورنہ مجھے بھی اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح ساری عمر جیل میں سڑنے کے لیے پھینک دیا جاتا۔ آج میں سوچ رہا ہوں۔ جن کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا۔ انہیں میرا نام بھی یاد رہا ہے یا نہیں؟ میرے خیال سے انہوں نے میرا نام بھی بھلا دیا ہوگا۔ یوں بھی اب میری حیثیت چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

گزشتہ آٹھ ماہ تک میرا مقدمہ ملک کی مختلف عدالتوں میں چلتا رہا۔ لیکن میں نے کوئی شناسا چہرہ نہیں دیکھا۔ میری مدد کو کوئی نہیں آیا۔ سوائے میرے بیگناہ بوڑھے والدین کے یا پھر میری بیوہ بہن جو دن رات بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر میرے مقدمات کا خرچ چلاتی رہی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ عالیہ مجھے اتنی جلدی بھول جائے گی۔ جس کے لیے میں نے زندگی کی سیدھی سادی شاہراہ کو چھوڑ کر پُرخار اور تھکا دینے والے راستوں کا انتخاب کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تو میرے والد نے جو ہمارے گاؤں کے پرائمری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مجھے کہا تھا۔

"بیٹا! تمہارے نمبر اتنے کم اور کرتوت اتنے بڑے ہیں کہ میں اپنی حلال کمائی

سے تمہیں مزید تعلیم دلانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہاری دو جوان بہنوں کو چھوڑ کر اب بھی تمہارے چاؤ چونچلے پورے کرتا رہوں۔ لیکن کیا کروں؟ میں مجبور ہوں۔ خدا نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے اور اُس کی تربیت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال دی ہے۔ اگر کوتاہی کرتا ہوں تو دنیا کہے گی۔ حاکم دین نے بیٹوں کی خاطر واحد اولاد نرینہ کو چھوڑ دیا۔ کاش خدا نے مجھے تمہاری جگہ بھی بیٹی ہی دے دی ہوتی کم از کم مجھے اس طرح سسک سسک کر تو زندگی کے دن پورے نہ کرنے پڑتے ——"

میں نے اپنے والد کی تقریر اس کان سے سُنی اور اس کان سے نکال دی۔ اب میں ایسی تقریروں کا عادی ہو چکا تھا۔ باپ مجھے ڈانٹتا تو ماں میرا ساتھ دیتی میرے لاشعور میں بھی یہ بات سما چکی تھی کہ میں والدین کی واحد اولاد نرینہ ہوں۔ شاید ان کی اسی کمزوری کو میرے اندر بیٹھا شیطان ایکسپلائٹ کر رہا تھا۔

پانچویں تک تو میں اپنے والد کے سکول میں پڑھتا رہا۔ ہائی سکول ہمارے گاؤں سے پانچ چھ میل دُور تھا اور جس علاقے کے ہم رہنے والے ہیں۔ وہاں یہ پانچ چھ میل پانچ چھ ہزار میل کے برابر ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں بجلی آئے تین چار سال ہوئے تھے۔ کیونکہ ہمارا گاؤں سڑک کے نزدیک تھا۔ یہاں کے بیشتر دیہاتوں میں تو بجلی بھی نہیں تھی۔ والد صاحب نے اپنا واحد اثاثہ جو سائیکل کی شکل میں محفوظ رکھا تھا مجھے منتقل کر دیا۔ میں سائیکل پر ہی سکول آنے جانے لگا۔ اس گاؤں کا میں واحد لڑکا تھا جو ہائی سکول جا رہا تھا۔ یہاں تو لوگ بچوں کو پرائمری تعلیم دلانا بھی مصیبت سمجھتے تھے۔ میرے والد صاحب کی لاکھ کوشش پر بھی پرائمری سکول میں کبھی ساٹھ ستر سے زیادہ بچوں کی تعداد نہیں ہو سکی تھی۔

ہائی سکول میں آٹھویں جماعت تک تو والد کی خصوصی توجہ اور سختی سے میں پڑھائی کی طرف راغب رہا۔ آٹھویں کے بعد میں بھی دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی خلیفہ بن گیا۔ گھر سے سکول جاتا اور راستے میں گلی ڈنڈے کا میچ کھیلنے لگتا۔ دسویں جماعت تک

مجھے نوجوانوں والی تمام بُری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ میرے والد دو تین ماہ بعد جب کبھی سکول جاتے اور میرے متعلق انہیں صحیح رپورٹ ملتی تو مجھے پہلے ایک آدھ تھپڑ لگا دیتے پھر ڈانٹتے اور آخر میں نصیحتوں کے انبار کے ساتھ سلسلہ کلام ختم ہو جاتا۔

میری نوجوان بہنیں تھیں۔ جنہوں نے مقامی روایات کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی یا پھر ماں سے سینے پرونے کا کام سیکھ لیا تھا۔ لیکن میری بڑی بہن کو والد صاحب نے اُس کا رجحان دیکھتے ہوئے خصوصی توجہ سے میٹرک کا امتحان پاس کروانے کے بعد سی ٹی کا کورس بھی پاس کروا دیا تھا۔ جب مَیں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو وہ نزدیک کے ایک گاؤں میں قائم لڑکیوں کے پرائمری سکول میں استانی لگ چکی تھی۔ چھوٹی بہن گھر پر بچوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ بس ایک میں تھا جو والدین کی توقعات پر کبھی پورا نہ اترا۔

میٹرک پاس کرنے تک مقامی نوعیت کے بیشتر جرائم میں سرانجام دے چکا تھا۔ اب دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ جلد از جلد جس طرح بھی ہو میں لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جاؤں اور وہاں خوب موج میلہ کروں۔

میں نے لاہور زندگی میں دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ جب ہم سب گھر والے داتا صاحب کے مزار پر سلام کرنے آئے تھے۔ دوسری مرتبہ جب میری ماں کے ایک دُور پار کے رشتے داروں کے ہاں اپنی بہن کا رشتہ دیکھنے آئے بعد میں اس گھر میں میری بہن کی شادی بھی ہو گئی تھی۔

مَیں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں بھی جس طرح پاس کیا وہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ اگر والد صاحب کو علم ہو جاتا تو وہ کبھی ایک پھوٹی کوڑی بھی مجھ پر خرچ نہ کرتے۔ مَیں نے امتحانی سنٹر کے سپرنٹنڈنٹ سے دو روز پہلے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملاقات کر کے اُسے کہہ دیا تھا کہ ہم اُس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ وہ ہمارے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑائے۔

سپرنٹنڈنٹ کھانے پینے والا آدمی تھا۔ اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر

لینے کا وعدہ کر لیا اور میں نے جیسے تیسے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس درمیان میری بڑی بہن بیاہ کر اپنے سسرال لاہور جا چکی تھی۔ لاہور ہمارے گاؤں کے نزدیک نہیں تھا۔ راستے میں کئی اور کالج بھی آتے تھے۔ والد صاحب مجھے یہاں داخلہ دلانے پر تیار نہیں تھے لیکن ماں کی ضد کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ہماری تھوڑی بہت زمین تھی۔ جس سے گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔ دیہاتوں میں زندگی کے شہر ایسے مسائل بھی نہیں ہوتے۔ والد صاحب کی تنخواہ کافی عرصے سے بینک میں ہی جمع ہو رہی تھی۔ وہ شاید بیٹیوں کی فکر کرتے تھے اور ان کے لیے ہی پیسے جمع کروا رہے تھے۔

جب والد صاحب مجھے لاہور کے ایک کالج میں جیسے تیسے داخل کروا کر گئے انہوں نے مجھے کہا:

"جاوید بیٹا! مَیں اتنی حیثیت کا مالک نہیں لیکن تمہاری ماں کی ضد کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ خدا کرے میرے خدشات غلط ثابت ہوں اور تمہیں عقل آ جائے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ مَیں نے تم سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تمہارے ماضی کے ایک ایک پل کی خبر مجھے ہے لیکن مَیں تمہاری ماں کو کچھ بتا کر اُسے دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس نے بدقسمتی سے تم سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ خدا کرے تم اُس کی امیدوں پر پورے اترو۔ بیٹا! لاہور بڑا شہر ہے۔ مَیں سینکڑوں میل دُور سے یہاں آ کر تمہاری خبر گیری نہیں کر سکتا۔ اس بات کا احساس کرنا کہ مَیں نے اپنی بساط سے بڑھ کر قدم اُٹھایا ہے۔

میرے لیے والد کی نصیحتیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بس یہی دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہ یہاں سے چلے جائیں۔ دیہاتی ہونے کے ناطے میرے لیے لاہور جیسا بڑا شہر بظاہر تو اجنبی اور چونکا دینے والا ہونا چاہیے لیکن یہاں رہ جانے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی ایسی خوشی اور دھن دل میں سمائی تھی کہ مَیں خود کو یہاں اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔

مجھے جس کالج میں داخلہ ملا۔ وہ ہنگامہ آرائی کے لیے خاص ہی شہرت رکھتا تھا۔ کالج کے ہوسٹل میں جو کمرہ مجھے الاٹ ہوا۔ اس میں پہلے ہی سے عارف مقیم تھا۔ عارف بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا۔ لیکن آٹھ دس ماہ تک ہم ایک دوسرے سے فری نہ ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ تو تین ماہ کی چھٹیاں تھیں۔ اس کے بعد مستقل ہنگاموں کی وجہ سے کالج مزید تین ماہ بند رہا۔ کالج کھلنے پر دس پندرہ روز تو ہم ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ پھر آپس میں کھل گئے اُس نے مجھے کرید کرید کر میرے ماضی کے متعلق کافی کچھ جان لیا تھا اور شاید یہ اندازہ بھی اُس کو بخوبی ہو گیا تھا کہ میں اُس کے کام کا آدمی ہوں۔

ایک روز اُس نے کھل کر کہہ ہی دیا۔ "جیدے یار تم بندے تو کام کے نظر آتے ہو لیکن ہو ذرا بزدل۔"

"ملک صاحب! آئندہ مجھے مذاق میں بھی کبھی یہ بات نہ کہنا۔ جب جی چاہے میری مردانگی کو آزما لینا۔" میں نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اچھا! اچھا! وقت آیا تو دیکھ لیں گے۔"

یہ وقت اگلے ہی روز آ گیا ——!

چھٹی کا دن تھا۔ ہوسٹل میں خاصی بے رونقی تھی۔ اُس روز ایک کار میں کچھ لوگ بیٹھ کر آئے۔ انہوں نے خود کو ملک عارف کا رشتے دار بتایا اور اُسی کے کمرے میں آ گئے۔ لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ اُس کے رشتہ دار نہیں بلکہ اُسی کی قماش کے دوست ہیں۔ عارف نے مجھے سو روپیہ کا نوٹ تھماتے ہوئے نزدیکی کنٹین سے کچھ لانے کو کہا۔ میں نے فوراً سو کا نوٹ پکڑ لیا۔ وہ اسی طرح پہلے بھی مختلف بہانوں سے اپنی امارت کا رعب مجھ پر ڈال چکا تھا۔

جب میں کھانے پینے کی اشیاء کے لفافے لے کر وہاں پہنچا تو کمرے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میری آواز پہچاننے پر عارف نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نگاہوں نے جو منظر دیکھا وہ بڑا مکروہ اور ناقابلِ بیان ہے۔ ملک عارف آنیوالوں

میں سے ایک نوعمر سے لڑکے کے ساتھ اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ میرے اندر آنے پر بھی اُس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے چرس سے بھرے سگریٹ سلگائے ہوئے تھے اور لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔

"کیوں بھئی جیدے کیا پروگرام ہے۔" ملک عارف نے اپنے مکروہ کام سے فارغ ہو کر مجھے مخاطب کیا۔

ایک مرتبہ تو میں سہم کر رہ گیا۔ لیکن حوصلہ کر کے میں نے کہہ دیا۔ "نہیں ملک جی! پھر کبھی سہی۔"

"جیسی تمہاری مرضی بھئی۔" ملک نے قہقہہ لگایا۔

اس قہقہے میں وہ نامرد اور اُس کے ساتھی بھی اُس کے ساتھ شامل تھے۔ میں نے ملک عارف کے اشارے پر میز پر کھانے پینے کی اشیاء رکھ دیں۔ باقی ۳۰، ۴۰ روپے اُسے واپس کرنے چاہے۔ تو اُس نے زبردستی میری قمیض کی جیب میں ڈال دیے اور ہنس کر بولا۔

"یار جیدے! ہم یاروں کے یار ہیں۔ کسی شے کی فکر نہ کرنا۔"

"ملک جی! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے فکر کس بات کی۔" میں نے ندیدے بچوں کی طرح دانت نکالے اور اُسی کے باقی چمچوں کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی اشیاء پر ٹوٹ پڑا۔

کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے نزدیکی کنٹین سے چائے منگوائی۔ میں اُس کے ملازموں کی طرح عارف کے ہر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب میں چائے لے کر واپس آیا تو ایک اور لڑکا اُسی لڑکے کے ساتھ ملک عارف والے قبیح فعل میں مصروف تھا۔

دونوں فارغ ہونے کے بعد ایک دوسرے سے بے ہودہ مذاق کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لوگ اس گندے فعل کے عادی ہیں۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے وہاں جوا کھیلنا شروع کر دیا اور شام ڈھلنے تک جوا کھیلنے میں مصروف رہے۔ اس دوران میں نے ایک خاص بات نوٹ کی کہ یہاں جتنا بھی جوا ہوا اُس میں ایک

خاص حصّہ ملک عارف کا ہوتا تھا۔ جتنی رقم بھی کوئی جیتتا اُس کا کچھ حصہ ملک عارف کی جیب میں چلا جاتا۔ اسے یہ لوگ اپنی زبان میں "نعل" کہتے تھے۔

شام ڈھلنے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگے تو ملک عارف نے اُس لڑکے کی طرف اشارہ کر کے پھر میری منشا دریافت کی۔ لیکن ابھی شاید میں جھجک رہا تھا۔ یا پھر کوئی لاشعوری خوف دامن گیر تھا کہ میں نے پھر انکار کر دیا۔ لیکن انکار کرتے ہوئے بڑی گول مول سی زبان استعمال کی۔ ملک عارف نے یہی سوچا ہو گا کہ میں شاید زیادہ لوگوں کی موجودگی میں جھجک محسوس کرتا ہوں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اُس نے پچاس کا نوٹ نکال کر مجھے تھمایا۔

"یہ کیا ملک جی!" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تمہارا حصّہ" ملک عارف نے بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جیسے ہم یاروں کے ساتھ میں جس کام میں ہمارا ساتھ دو گے اُس میں حصّہ ضرور ملے گا۔ لینا نہ لینا تمہاری مرضی"

"ہم تو آپ کے خادم ہیں ملک جی" خدا جانے ایسا گھٹیا اور کمینگی کا انداز لیے ہوئے زبان میں کیسے اُس کے سامنے بولتا رہا میری حالت تو اپنے گاؤں کے ان میراثیوں سے بھی بدتر تھی۔ جو چوہدریوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ واقعی ملک عارف نے مجھے اپنا "کامّا" بنا لیا تھا۔

مجھے لاہور میں پڑھتے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران دو مرتبہ میرے بہنوئی مجھے کالج میں ملنے آئے اور زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ جہاں میری بہن مجھے ایک ہی بات سمجھاتی کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور اُن کے مستقبل کی واحد امید ہوں اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو ان کے لیے باعث دکھ ہو۔ میں حسبِ روایت "ہوں ہاں" کر کے واپس لوٹ آتا۔ والد صاحب کا خط باقاعدگی سے آتا اور میں بھی انہیں جواب لکھ کر مطمئن کر دیتا۔

اس واقعے کے اگلے ہی روز ملک عارف مجھے لاہور کے اُس بازار میں لے گیا۔

ہم جس کوٹھے پر گئے۔ وہ لوگ اُسے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اُس کی آمد پر انہوں نے
نی خوشی کا اظہار کیا۔ جیسے اُن کے اُجڑے ہوئے چمن میں بہار آگئی ہو۔ وہ لوگ
ب عارف کے ساتھ ساتھ میرے بھی صدقے واری جا رہے تھے۔ مَیں تھا تو گیارھویں
ماعت کا طالب علم لیکن میرا قد کاٹھ اور جسمانی ساخت دیکھ کر اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے
تھے۔ یہاں عارف نے میری ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے کروائی اُس کی عمر تو مجھ سے
زیادہ تھی۔ لیکن پہلی ہی نظر میں اُسے میں دل دے بیٹھا۔ اس لڑکی کا نام عالیہ تھا۔
ہم رات دیر گئے ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوسٹل واپس آگئے۔

عالیہ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور مَیں اس کی خاطر اب
کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ پانچ چھ روز اُس کی جدائی میں جس طرح مَیں نے کاٹے وہ کچھ
میں ہی جان سکتا ہوں۔ اس دوران ہمارے کمرے میں قریباً روزانہ جوا اور دوسرے
غلط کام کیے جاتے۔ عارف مجھے باقاعدگی سے میرا حصہ دیتا رہا۔ ایک مرتبہ اُس کے
کہنے پر اُس کی موٹر سائیکل پر میں اُس کے لیے ایک خفیہ اڈے سے شراب کی بوتل بھی
لے کر آیا۔ میں سگریٹ تو سکول کے زمانے سے ہی پینے لگا تھا۔ لیکن ابھی کوئی اور
نشہ نہیں کیا تھا۔ ایک روز عارف نے مجھے بھی زبردستی ایک پیگ لگوا دیا۔ میرے لیے
تو یہی کافی تھا۔ خدا جانے میں شراب پی کر کیا اول فول بکتا رہا۔

صبح دیر گئے تک میں سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو سورج سر پر آگیا تھا۔ عارف اور اُس
کا ایک دوست چرس سے بھرے سگریٹ پی رہے تھے۔ میرا سر ابھی تک گھوم رہا تھا
میں اٹھ کر نہانے چلا گیا۔ نہا کر واپس آیا تو قدرے نارمل ہوا۔

عارف نے وہاں موجود نوجوان کا تعارف طاہر کے نام سے کروایا۔ میں نے اُس کا نام
نوٹ کر رکھا تھا۔ یہ ہمارے کالج کی یونین کا صدر تھا۔ عارف نے میرے لیے ناشتہ
وہیں منگوا لیا اور طاہر کے سامنے میری تعریفوں کے پل بھی باندھ دیے۔ اُس نے
بتایا کہ کالج کے الیکشن نزدیک آگئے ہیں اور مخالف تنظیم کی طرف سے غنڈہ گردی کا
خطرہ ہے۔ عارف نے بتایا کہ ہوسٹل میں وہ جوا خانہ اور دیگر بدمعاشیاں یونین کے

صدر کی مدد سے ہی چلا رہا ہے اور آج وقت آگیا ہے کہ وہ بھی طاہر کے کام آئے کیونکہ اسی کی وجہ سے آج تک کسی نے ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

"ہمیں کرنا کیا ہے ملک جی!" میں نے مُرغے کی طرح گردن پھُلا کر پوچھا۔

"یار جیدے بس ذرا دو چار فائر کرنے ہیں۔ یہ شہر کا بابو ہیں ان کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔" عارف نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"بے فکر ہو جاؤ جناب کوئی آپ کی طرف ہمارے ہوتے ہوئے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہاں ہائی سکول میں مَیں نے ڈانگ سوٹا اور چاقو وغیرہ تو چلایا تھا۔ لیکن پستول کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں طاہر نے مجھے ایک ریوالور اور چند گولیاں دے دیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں کالج کی حدود میں جو جی چاہے کر سکتا ہوں یہاں کسی کی جرأت نہیں کہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات بھی کرے۔

پستول اور گولیاں ہم نے سنبھال لیں۔ طاہر چلا گیا۔ اُس روز دوسری مرتبہ ملک عارف مجھے پھر بازارِ حسن لے گیا۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ میں عالیہ کو دل دے بیٹھا ہوں۔

"جیدے یار یہ کنجر لوگ نمود و نمائش کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر اس کا دل جیتنا چاہتے ہو تو مال خرچ کرو۔ اُسے سونے کی زنجیروں سے اس طرح جکڑ دو کہ پھر وہ تمہارے جال سے کبھی نکل نہ سکے۔" ملک عارف نے مجھے سمجھایا۔

"لیکن اتنا مال آئے گا کہاں سے؟" مَیں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"یار تم اس معاملے کی فکر نہ کیا کرو۔ یہ مسئلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم یاروں کے یار ہیں آخر کس روز تمہارے کام آئیں گے۔"

میرے پاس عارف کے دیے ہوئے جو پانچ چار سو روپے جمع تھے۔ اُن کی میں نے اُس کے کہنے پر ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی اور ہم عالیہ کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔ مَیں نے عارف کے کہنے کے مطابق اُسے ساڑھی پیش کی تو عالیہ کھل اٹھی اور شکریہ

کے ساتھ ساڑھی وصول کر لی۔

"کسی روز انہیں رات کو لایئے ناں ملک جی!" عالیہ نے میری طرف اشارہ کر کے عارف سے کہا۔

"اتنی بے صبری اچھی نہیں عالیہ بیگم لے آئیں گے کسی روز" ملک نے کہا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

میں ہونقوں کی طرح اُن کا منہ دیکھتا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ وقت میری ہنسی اڑا رہا ہے۔

واپسی پر مجھے عارف ملک ذہنی طور پر تیار کرتا آیا کہ ہمیں پیسے حاصل کرنے کے لیے کوئی بڑا کام کرنا چاہیے۔ لیکن ابھی تک اُس نے مجھے کام کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

تین چار روز بعد طاہر کی پستول استعمال کرنے کا موقعہ بھی آ ہی گیا۔ آج کالج کے میدان میں مخالف طلبا تنظیم کا جلسہ تھا۔ ہم نے جلسے کو ناکام بنانا تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں طاہر والی طلبا تنظیم کے اور لوگ بھی اس "کارِ خیر" میں حصہ ڈالنے کو موجود تھے۔ وہ تھے تو بظاہر اسی طلبا تنظیم کے ممبر لیکن ان کا اس کالج سے کیا کسی بھی کالج سے دُور دُور کا علاقہ نہیں تھا اور تمام شکل سے پکے ہوئے غنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ہی دوسری تنظیم کی طرف سے صدارتی امیدوار نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ میدان کے ایک کونے سے کسی نے ہوا میں گولی چلا دی۔ وہ لوگ بھی شاید تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کے سٹیج پر موجود ساتھیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہمارا کام شروع ہو گیا تھا۔ مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کپکپاتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور باہر نکالا اور سٹیج کی سمت دو تین فائر کر دیے۔ مَیں سٹیج کے قدرے قریب کھڑا تھا اور اس طرف کوئی متوجہ بھی نہیں تھا۔ خدا جانے سٹیج سیکرٹری کو کس کی گولی لگی۔ لیکن میں یہی سمجھا کہ اُسے میری چلائی ہوئی گولی ہی لگی ہے۔ سٹیج پر چیخ بلند ہوئی اور مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اُٹھا

وہ بھاگنے لگا۔ مَیں نے مزید نمبر بنانے کے لیے دھڑ دھڑ گولیاں چلانی شروع کر دیں اور چند منٹوں میں تمام گولیاں ختم کر دیں۔

اچانک ہی کسی نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ مَیں نے دیکھا یہ ملک عارف تھا۔۔۔۔

"چلو، چلو! بھاگ چلیں۔ اُسے تمہاری گولی لگی ہے۔" اُس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ میں گدھوں کی طرح اُس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

کالج کی پچھلی دیوار پھلانگ کر ہم باہر نکلے جہاں ملک عارف کا ایک اور ساتھی اُس کی موٹر سائیکل سمیت موجود تھا۔ اُس نے ہماری شکل پر نظر پڑتے ہی موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ عارف نے گدی سنبھال لی مَیں اُس کے پیچھے بیٹھا اور موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ملک عارف موٹر سائیکل چلاتے ہوئے مجھے مسلسل داد دیتا رہا۔ مَیں نے بڑی جوانمردی دکھائی ہے۔ خدا جانے اس لڑکے کو گولی کس نے ماری تھی۔ کم از کم میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن ملک عارف نے میری جس انداز سے تعریف شروع کی تھی۔ اُس سے مجھے یوں لگا۔ جیسے واقعی یہ کارنامہ مَیں نے انجام دیا ہو۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک مارڈرن آبادی کی شاندار کوٹھی پر ہوا۔ جس کے باہر ایک مسلح گارڈ کھڑا تھا۔ عارف کی شکل پر نظر پڑتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔ موٹر سائیکل وہ سیدھی کوٹھی کے لان تک لے آیا۔ شاید موٹر سائیکل کی آواز سُن کر ہی ایک ڈھلتی عمر کا گنجے سر والا موٹا سا آدمی باہر آیا۔ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اُس شخص کو مَیں نے پہلے بھی ضرور کہیں دیکھا ہوگا۔

"ویل ڈن ملک! ویل ڈن!" اُس نے موٹر سائیکل رُکتے ہی تالی بجاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کوٹھی کے برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ اُس نے گرم جوشی سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔

"بیگ صاحب یہ ہے اپنا یار جاوید خاں جس نے آج کا کارنامہ انجام دیا ہے۔" اور جیدے یہ بیگ صاحب ہیں۔ تم جانتے ہی ہوگے۔ ان کے تعارف کی تو کوئی ضرورت میرے خیال سے نہیں ہے۔" ملک عارف نے مجھے مخاطب کیا۔

"شاباش جوان۔ واقعی ہمیں تم جیسے بہادروں کی ضرورت ہے۔ ملک عارف یار تم نے آج تک یہ ہیرا کہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔" اُس نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کو ٹٹولتے ہوئے ملک عارف کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"بیگ صاحب ہم وقت آنے پر ہی مال باہر نکالتے ہیں۔" ملک عارف نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"واہ بھئی واہ۔ کمال کر دیا تم نے۔ پرواہ نہیں وہ سالا مر بھی جائے تو پرواہ نہیں کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔" بیگ صاحب نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ اس ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایک دفعہ تو میں بھونچکا ہی رہ گیا۔ میں نے ایسے کمرے فلموں میں تو دیکھے تھے۔ عملی زندگی میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ بیگ صاحب نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور چند منٹ بعد ہی ہمارے سامنے پُرتکلف چائے دیگر لوازمات سمیت موجود تھی۔ اس دوران ملک عارف میری جھوٹی سچی تعریف کرتا رہا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے جانے کتنے کارنامے میری ذات سے منسوب کر دیے اور میں گدھوں کی طرح سر ہلاتا رہا۔ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ میں اپنی معصومیت کے ہاتھوں کس طرح آہستہ آہستہ اپنی قبر کھود رہا ہوں۔ میں قدم بقدم گہری دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا اور اپنے انجام سے بے خبر بڑی خوشی سے قربانی کا بکرا بنا ہوا تھا۔

اس اثنا میں بیگ صاحب کے سامنے رکھے فون کی گھنٹی بجی اور انہیں مطلع کیا گیا کہ جس لڑکے کو گولی لگی ہے اُس کی حالت نازک ہے۔ مخالف فریق نے ہماری یونین پر پرچہ کروایا تھا۔ لیکن اس میں کوئی نام شامل نہیں تھا۔ اس بات کی گنجائش بہرحال موجود

تھی کہ پولیس تفتیش کے بعد کسی کو بھی شامل کر سکتی تھی۔

"تم دو تین روز یہیں رہو جیدے بیگ صاحب کے پاس۔ ابھی تمہارا کالج جانا ٹھیک نہیں۔" عارف نے مجھے نصیحت کی۔

"ہاں! ہاں! بھئی ہم اپنے بندے کو ایسے تو جانے نہیں دیں گے ناں۔" بیگ صاحب نے معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" میں نے ہونقوں کی طرح گردن ہلا دی۔

دونوں دوسرے کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے اُٹھ کر گئے اور آپس میں کچھ پرائیویٹ سی گفتگو کرتے رہے۔ شاید اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ یہ خچر کس حد تک کام آسکتا ہے۔ پھر بیگ تو واپس آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ملک عارف نے مجھے اشارے سے بلایا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر سو سو کے کئی نوٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیے۔

"پانچ ہزار روپے ہیں جیدے خاں! تمہارا انعام۔ بس اب سمجھو تمہاری قسمت کھل گئی۔ عالیہ تمہاری مٹھی میں آگئی۔" اُس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ بیگ صاحب کا خیال رکھنا بڑے کام کے آدمی ہیں ایسے آدمی کو ہاتھ سے نکلنے نہ دینا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

مجھے اُس کی بات تو کیا خاک پلے پڑتی بس یوں ہی سر ہلا دیا۔ "ہاں ملک جی بے فکر رہو۔ تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"اچھا خدا حافظ۔" کہہ کر ملک عارف چلا گیا۔

میں بیگ صاحب کے پاس واپس آگیا۔ جیبوں میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ ڈالتے ہوئے میں خود کو آسمان پر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ اب عالیہ کو مجھ سے کون الگ کر سکتا تھا۔ یہی تھی وہ واحد سوچ جو میرے دل میں جاگزیں تھی۔ مجھے اپنے تعلیمی کیریئر کی اپنے والدین کی، اپنے بہنوئی کی بالکل فکر نہ تھی۔ میرے دل میں شیطان نے یہ خیال

بھی نہ آنے دیا کہ میں ایک نوجوان کو گولی مار کر آیا ہوں جو میری طرح کسی کے آنگن کا واحد دیا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی ماں کے مستقبل کی اکیلی امید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ مر گیا تو؟ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

"آؤ بھئی تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دیں۔ تم آرام کرو۔ مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔" بیگ نے مجھے ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

کمرہ کسی رئیس کی خوابگاہ دکھائی دیتا تھا۔ جس کے ایک کونے میں وی سی آر اور ٹی وی نصب تھا اور آرام دہ بیڈ کے کنارے ایک چھوٹا فریج دھرا تھا۔

"تم ذرا آرام کرو۔ رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ مجھے ایک سیاسی میٹنگ میں جانا ہے۔" بیگ نے مجھے لجائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

آج تک میں نے کراٹے کی فلمیں لا کر بھی کبھی کسی دوست کے گھر وی سی آر دیکھا تھا۔ آج سب کچھ میرے سامنے تھا۔ شاید بیگ نے یہ سارا جال مجھے پھانسنے کے لیے بچھا رکھا تھا۔ اُس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ندیدے بچوں کی طرح وی سی آر کے نزدیک رکھی فلموں میں سے ایک فلم نکال کر چلا دی۔ کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"اُف میرے خدایا۔"

جیسے جیسے فلم چل رہی تھی، میرے اعصاب تن رہے تھے۔ یہ بلیو فلم تھی۔ ایسی ایک فلم کی جھلک میں نے ایک مرتبہ دیکھی تھی۔ اور اکثر ملک عارف سے تقاضا کیا تھا کہ مجھے ایسی فلم دکھائے۔ ملک عارف نے وعدہ تو کیا لیکن اتفاق سے حالات ایسے نہ بنے۔ آج دو گھنٹے کی مسلسل فلم میرے سامنے چل رہی تھی۔ میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر فلم میں غرق تھا۔ کسی نے میرے کمرے کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ شاید یہ اُس کوٹھی کی انکسی تھی۔ میں نے اس دوران فریج میں سے دو بوتلیں نکال کر پی لی تھیں۔ لیکن ایک آگ سی مسلسل میرے اندر دہکنے لگی تھی۔ فلم ابھی چل ہی رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا میں تو گھبرا ہی گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے سامنے

بیگ صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مجھے دو ڈھائی گھنٹے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

"کیسا مال ہے؟" انہوں نے لفنگوں کی طرح آنکھ دبا کر پوچھا۔

میں نے دانت نکال دیے۔

مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ بیگ اور عارف میں کوئی فرق نہیں۔ یہ شخص یوں تو ملک کی مقتدر سیاسی شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا لیکن ذہنی طور پر جنسی اور نفسیاتی مریض تھا۔ اس نے میرے کمرے میں ہی ملازم سے شراب منگوالی اور میرے ناں ناں کرنے کے باوجود ایک دو پیگ مجھے بھی پلا دیے۔ پھر ہم دونوں نے کھانا کھایا اور اسی کمرے میں آ گئے۔ اب میرا دماغ واقعی گھومنے لگا تھا۔ اس مرتبہ بیگ نے ایک فن اور فلم چلا دی۔ یہ فلم کیا تھی؟ شہوت اور درندگی کا ایک طوفان بدتمیزی تھا۔ جوں جوں فلم چل رہی تھی۔ میری رگوں میں خون کے بجائے انگارے دوڑ رہے تھے۔ اچانک میں نے عجیب سی حرکت محسوس کی بیگ میرے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑی گھٹیا فرمائش کر دی۔ وہ مجھ سے ایسی ہی حرکت کا تقاضا کر رہا تھا جو ملک عارف اپنے کمرے میں کیا کرتا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ بس ذہن میں ایک ہی بات سما گئی تھی کہ میں ایک مفرور ملزم ہوں جو اس درندے کی پناہ میں ہے اور ملک عارف کا وہ معنی خیز فقرہ کہ بیگ صاحب کو ناراض نہ کرنا۔ اس نے مجھے کہا تھا ——

"جیدے یہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ناراض ہو جائیں تو زندگی کو جہنم بنانے کی سکت رکھتے ہیں۔ خوش رہیں تو پو بارہ۔"

بیگ نے میری جسمانی ساخت کو اپنے گھناؤنے عزائم کی بھینٹ چڑھا دیا۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب سو کر اٹھا تو بیگ غائب تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں ایک مودب ملازم موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک پرچی تھمادی جس پر ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا اور وہاں فون کرنے کو کہا۔ میں نے فون کیا دوسری طرف ملک عارف تھا۔ اس نے میرا حال چال دریافت کیا۔

"ملک صاحب آپ نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا۔ میں اس لائن کا بندہ نہیں"
میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"جیدے خاں! بیوقوف مت بنو۔ وہ لڑکا جسے تمہاری گولی لگی تھی زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تمہیں ایک دو لڑکوں نے اُسے گولی مارتے دیکھ لیا تھا۔ اگر پولیس سے بچ گئے تو مخالف تنظیم والے مار ڈالیں گے۔ ہمیں اس مصیبت سے صرف بیگ ہی بچا سکتا ہے۔ اگر تم نے اُس کی بات نہ مانی تو میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یار کیوں مرے جا رہے ہو۔ ایک آدھ دن کی تو بات ہے۔ پھر تم ہو گے اور عالیہ ہو گی اور۔۔۔۔۔" اُس نے فون پر ہی سکارلی ۔

اب مجھے حقیقتِ حال کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں بری طرح پھنس چکا ہوں اور مجھے اس حرامی کی جائز ناجائز خواہش پوری کرنی پڑے گی۔ وہ منحوس تھوڑی دیر بعد سلیپنگ سوٹ پہنے وہاں آ گیا۔ اُس کے چہرے پر رات والے واقعات کا نام و نشان کسی معمولی تاثر کی شکل میں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے مجھے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ رات وہ کیا گھناؤنا فعل انجام دے چکا ہے۔ میں نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں نہا دھو کر اُس کے فراہم کردہ کپڑے تبدیل کیے اور ناشتہ کرنے لگا۔ بیگ تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے اپنے نوکر کو میرا ہر طرح خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس کی روانگی کے تقریباً دو گھنٹے بعد ملک عارف آ گیا۔ یہ وقت میں نے اخبارات پڑھ پڑھ کر گزارا تھا۔ تمام اخبارات کل کے واقعات سے بھرے تھے۔ واقعی مضروب کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے میرے ایف اے کے امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ میں اس صورتِ حال سے گڑبڑا کر رہ گیا۔

"گھبرانے والی کوئی بات نہیں جیدے،" ملک عارف نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "تم سمجھو کہ امتحانوں میں تم فسٹ ڈویژن حاصل کر چکے ہو۔ تم جانتے ہو بیگ صاحب کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ان سے ملاقات کو تو لوگ ترستے ہیں۔

اگر انہوں نے تمہیں "دوستی" کے لیے چن لیا ہے تو تمہارا خوش قسمتی ہے" اس نے بڑی مکاری سے حالات کی ایسی تصویر میرے سامنے پیش کی کہ میرے لیے سوائے "ہوں ہاں" کے اور کوئی چارہ ہی باقی نہ رہا۔

شام تک ملک عارف میرے پاس رہا۔ یہ وقت ہم نے بیہودہ فلمیں دیکھ کر اور ٹیلی فون کر کے گزارا۔ دوپہر کو پرتکلف کھانا ہمارے لیے آگیا تھا۔ شام کے بعد شیطان بھی لوٹ آیا۔ اُس نے آتے ہی مجھ پر احسان جتا دیا کہ بڑی مشکل سے ان لوگوں نے مجھے پرچے میں سے نکالا ہے۔ اب میں بظاہر تو محفوظ ہوں۔ لیکن مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔ رات ہونے سے پہلے عارف چلا گیا۔ اُس خبیث نے پھر وہی شیطانی عمل دہرانے کے لیے مجھے مجبور کیا اگلے روز صبح کو عارف مجھے اپنے ساتھ ہوسٹل لے آیا۔

ہوسٹل میں یونین والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے کسی سربراہ مملکت کا کیا جاتا ہے۔ طاہر اور دو تین دوسرے لڑکے میرے کمرے میں میرے منتظر تھے میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس سارے ڈرامے کے پس پردہ ملک عارف کی شاطر شخصیت کارفرما ہے۔ وہ میرے غبارے میں اتنی ہوا بھر دینا چاہتا تھا کہ پھر جب چاہے سوئی کی نوک سے مجھے دھماکے کی طرح اڑا کر رکھ دے۔

اُسی روز رات کو ہم عالیہ کا گانا سننے گئے۔ مَیں نے جس طرح حرام کی دولت ملی تھی اُسی طرح عالیہ پر لٹا دی۔ مجرے کے خاتمے پر عالیہ نے بڑے ناز و ادا سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے بازار سے میرے لیے کھانا منگوا کر خاص طور سے میرے ساتھ کھانا کھایا اور یہ اصرار کرتی رہی کہ مَیں روزانہ اُس سے ملنے آیا کروں مجھ گدھے کو اُس نے احساس دلایا کہ جیسے وہ مجھ پر مرمٹی ہے، لیکن ابھی زبان سے باقاعدہ اقرار نہیں کرنا چاہتی۔ دوسری طرف میں بیوقوف سوچ رہا تھا کہ کب تک بچے گی آخر ایک روز اسے میری محبت کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔

ایف اے کے امتحانات شروع ہو گئے۔ طاہر اور اُس کے ساتھیوں نے میرے لیے

خصوصی اہتمام کیا تھا۔ میٹرک کے امتحان کی طرح اس مرتبہ بھی سپرنٹنڈنٹ نے میری طرف سے آنکھیں بند رکھیں اور مَیں اطمینان سے اپنے پرچے حل کرتا رہا۔ امتحان ختم ہوئے تو پولیس نے ہوسٹل خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ ہنگامہ آرائی پھر شروع ہو گئی تھی۔ جس روز پولیس نے رات کو چھاپا مارا۔ میری خوش قسمتی کہ طاہر والا ریوالور ملک عارف کے پاس تھا جو اُس نے اپنی موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں چھپا رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ہم بچ گئے۔

ہمیں پولیس کی طرف سے اگلے روز ہوسٹل خالی کر دینے کو کہا گیا تھا میں امتحانات سے فارغ ہو چکا تھا۔ لیکن میرا دل گاؤں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ شہر کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ میں نے والدین کو یکسر فراموش کر دیا جو بے چارے نجانے دل میں کتنی آرزوئیں جگائے میرے منتظر تھے۔

میرے پاس اس دوران جوئے کے جمع ہونے والے پانچ چھ سو روپے موجود تھے۔ ملک عارف نے مجھے کہا کہ پانچ چھ روز اپنے گھر گزار لو۔ پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ مَیں نے عالیہ سے ملنے کی ضد کی، تو اُس نے کہا۔

"جیدے بیوقوف مت بنو۔ اگر تم وہاں خالی ہاتھ گئے تو مچھلی تمہارے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔"

"لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے۔" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"اُس کی تم فکر نہ کرو۔ ذرا صبر کرو۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

بادلِ نخواستہ میں گھر چلا آیا۔ جہاں والد کی نصیحتیں میرے استقبال کو موجود تھیں۔ وہ اس بات پر ناراض تھے کہ مَیں نے کبھی بہن کے گھر جانے کا تکلف نہیں کیا حالانکہ میرا بہنوئی ہسپتال میں داخل رہا۔ اُس بے چارے کو اچانک گردوں کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ یہاں آکر مجھے علم ہوا کہ میری بڑی بہن نے گھر پر ٹیوشن سنٹر کھول لیا تھا کیونکہ اُس کے خاوند کی بیماری طویل ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ نوکری سے بھی اس

نامراد بیماری کے ہاتھوں ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ بہن کے ساتھ بوڑھی ساس تھی یا پھر ایک دیور اور دیورانی۔ بے چاری کو ان تینوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا۔ اُس کا دیور بھی میری ہی قبیل کا تھا جو کماتا اڑا دیتا۔ خدا جانے میرے ضمیر کو ملک عارف نے کون سی گولی کھلا کر اتنی گہری نیند سلا دیا کہ وہ اب بیدار ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن کا ذرا خیال نہ آیا۔ بس میرے دل و دماغ پر تو صرف عالیہ کا قبضہ تھا۔

پانچ سات روز میں نے گاؤں میں جیسے تیسے گزارے پھر لاہور میں اپنے بہنوئی کی تیمارداری کا بہانہ کر کے لاہور آ گیا۔ پہلے میں بہن کے گھر گیا۔ بے چاری میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اُس کے دو چھوٹے بچے حیرت سے اپنے ماموں کی شکل دیکھ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہنوئی کی تیمارداری کر کے مَیں نے اپنی دانست میں گویا والدین کا قرض اتار دیا۔

اگلے ہی روز بہن کے اصرار کے باوجود میں ملک عارف کے گاؤں کی طرف عازم سفر تھا۔ اُس کا گاؤں لاہور سے ساٹھ ستر میل دُور تھا۔ ملک عارف نے مجھے دیکھا تو اُس کی باچھیں کھل گئیں۔

"واہ بھئی واہ یار ہوں تو ایسے۔" اُس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

وہ اس علاقے کے بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ مَیں تو یہاں اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ ملک عارف مجھے اپنی زمینوں پر حویلی میں لے آیا۔ یہ حویلی بالکل الگ تھلگ تھی اور مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ اُس نے صرف عیاشی کے لیے ہی بنائی ہوئی تھی۔ حویلی کے ایک بڑے کمرے کو جدید شہری سہولتوں سے مزین کیا گیا تھا۔ اُس کا ایک خاص مزارع ہمارے لیے جانے کہاں سے موج میلے کا سامان لے آیا تھا۔ یہ کوئی پیشہ ور لڑکی تھی جو رات کی تاریکی میں شراب کی بوتل سمیت اس حویلی میں پہنچائی گئی۔ ملک عارف نے مجھ پر احسان جتلاتے ہوئے کہا کہ یہ خصوصی اہتمام اُس نے میرے لیے کیا ہے کیونکہ مَیں پہلی مرتبہ اُس کے گھر مہمان آیا ہوں۔ یہاں پھر اُس نے

اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر کہا۔

"جیدے خان! ہم یاروں کے یار ہیں۔ تم مرد بندے ہو۔ ہم مردوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"

ساری رات ہم دونوں اس لڑکی کی بوٹیاں کتوں کی طرح نوچتے رہے۔ علی الصباح ملک عارف کا خصوصی مزارع اُس کی جیپ پر لڑکی کو اُس کے ٹھکانے پر چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ہم لاہور آ گئے۔

لاہور ہم سیدھے طاہر کے گھر آئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے ایک خطرناک پروگرام بنایا۔ کیونکہ بیگ اُن دنوں ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور مجھے عالیہ کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مَیں نے اس پر صاد کر دیا۔ اس پروگرام میں طاہر اور اُس کا ایک اور ساتھی بھی ہمارے ساتھ شامل تھے۔ ہم چاروں دو موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر شہر کے ماڈرن علاقے کے ایک پٹرول پمپ پر گئے۔ طاہر ہمیں موقعہ دکھانے لایا تھا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔ اور یہاں بیٹھ کر پٹرول پمپ کو لوٹنے کا پروگرام بنانے لگے۔ سارا پلان طاہر نے تیار کیا تھا۔ لیکن اس میں قربانی کا بکرا مجھے بنایا گیا۔ طے یہ پایا کہ وہ دونوں موٹر سائیکلوں پر بیٹھے رہیں گے۔ میں اور طاہر کا ساتھی پستول کی زور پر رقم چھین کر لائیں گے۔ وہ ہمیں بھگا لے جائیں گے۔ ہنگامی حالت میں ہم چاروں کے پاس بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے۔ واردات کے لیے رات دس بجے کا وقت طے پایا۔ طاہر کی اطلاع کے مطابق رات دس بجے کے بعد اُس پٹرول پمپ کا مالک کیش گھر لے جا کر صبح بینک میں جمع کروایا کرتا تھا۔

پلان کے مطابق ہم پٹرول پمپ پر پہنچے۔ دونوں نے موٹر سائیکل قدرے اندھیرے میں کھڑے کر لیے۔ دُور دُور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم دونوں قربانی کے بکروں نے اپنی جیبوں میں موجود نقاب منہ پر اوڑھے اور پٹرول پمپ کے کمرے میں جا گھسے۔ جہاں ایک محنتی سا شخص بیٹھا کیش گن رہا تھا۔

اُس نے اپنے طرف دو ریوالوروں کو لہراتے دیکھا تو اُس کی گھگی بندھ گئی۔ بغیر کسی مزاحمت کے ہم نے سارے کرنسی نوٹ اپنے پاس موجود تھیلے میں منتقل کر لیے اور اُسے دھمکی دی کہ اگر اُس نے ہمارے جانے کے بعد شور مچایا تو ہم اُسے پٹرول پمپ سمیت دھماکے سے اُڑا دیں گے۔ اُس کے دو ملازم اندر موجود صورتِ حال سے بالکل بے خبر باہر سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔

جانے سے پہلے میں نے طاہر کے سمجھانے کے مطابق ٹیلیفون کے تار جھٹکے سے توڑ دیے۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ ہمیں باہر آتے دیکھ کر دونوں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر لیے۔ نوٹوں والا تھیلے میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ملک عارف کے پیچھے جا بیٹھا۔ ہمیں اس طرح بھاگتے دیکھ کر ملازموں کو شک گزرا اور انہوں نے شور مچا دیا۔ لیکن اب ہم ان کی دسترس سے باہر تھے۔ طاہر کے تعاقب میں ہم نے اس ماڈرن آبادی کی مختلف گلیوں میں اس طرح موٹر سائیکلیں گھمائیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی پندرہ بیس منٹ بعد ہم دوبارہ طاہر کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"ویل ڈن" طاہر نے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے شاباش دی۔

انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لیے سروں پر ہیلمٹ ڈال رکھے تھے۔ سب کے سامنے ملک عارف نے پیسے گنے۔ ہماری توقعات سے بڑھ کر یہ ساڑھے ہزار سے زیادہ کی رقم تھی۔ رقم ہم نے آپس میں تقسیم کر لی۔ مجھے انہوں نے پانچ ہزار زیادہ دیے تھے۔

میں اُڑ کر عالیہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے صبر کی تلقین کی۔

وہ رات ہم نے اسی کمرے میں گزار دی اور اگلی صبح وہاں سے نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم ملک عارف کے ایک دوست کے گھر پہنچے۔ جہاں ہم نے کپڑے وغیرہ تبدیل کیے اور ناشتہ کر کے عالیہ کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔

عالیہ نے مجھے اور ملک عارف کو دیکھا تو خدا جانے ملک نے اُسے کیا اشارہ کیا کہ وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ روہانسے لہجے میں

بولی: "آپ نے اتنے دن کہاں لگائے؟"

میں نے سمجھ لیا کہ بس اب اس پر میری محبت کا جادو چل گیا ہے۔ ملک عارف ہمیں کسی بہانے اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ عالیہ نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پان کھلایا۔ پھر میری جدائی کا رونا رونے لگی۔ ملک عارف کی واپسی چند منٹ بعد عالیہ کی نائکہ ماں کے ساتھ ہوئی۔ عالیہ چائے لانے کے بہانے اُٹھ کر چلی گئی۔ ملک عارف نے اس نائکہ سے میرا تعارف ایک امیر زادے کی حیثیت سے کروایا۔ نائکہ اپنی تربیت کے مطابق مجھ پر صدقے واری ہونے لگی۔ ملک عارف نے اُسے ایک ہزار روپے میری طرف سے "سلام" کا دیا۔ وہ مجھے ساری سکیم سمجھا کر لایا تھا کہ ہمیں یہاں کیا کرنا ہے۔ معاملہ اُس نے نائکہ سے طے کر لیا تھا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے عالیہ کی گود میں دس ہزار روپے ڈال دیے۔ دونوں ماں بیٹی کی باچھیں کھل گئیں۔ نائکہ نے صدقے واری کرتے روپے سنبھالے اور باہر چلی گئی

"تم آج اپنی عالیہ کے ناز نخرے اُٹھاؤ میں کل آؤں گا۔" کہہ کر ملک عارف بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ شام ڈھلے تک نائکہ نے کبھی سگریٹ، کبھی پان، کبھی کھانا، اور کبھی چائے کے بہانے مجھ سے ہزار بارہ سو روپے اور ہتھیا لیے۔ پھر ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

اُس رات عالیہ نے مجرہ نہیں کیا۔ ساری رات وہ میری ناز برداری کرتی رہی اُس نے مجھے جسمانی لذت کے اُن اُن جہانوں کی سیر کروائی۔ جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ جسم فروشی کا پیشہ نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ پہلے ہی دن اُس نے مجھے اپنے خاوند کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ اس لیے وہ اس کام کو تیار ہوئی۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

"جاوید صاحب! خدا کے لیے جتنی جلدی ممکن ہو مجھے اس دنیا سے نکال کر لے جائیے۔"

"اس کی کیا صورت ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے جاوید صاحب کہ میری ماں کا منہ سونے کے نوالوں سے بھر دیجیے۔ وہ جب تک میری مکمل قیمت وصول نہیں کرے گی۔ مجھے اس گناہ کی دلدل سے نکلنے نہیں دے گی۔" اُس نے روہانسی آواز میں کہا۔

میں نے کہا، "عالیہ تم مطمئن رہو۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔"

عالیہ مطمئن ہو گئی۔ اُس مکّار طوائف نے اندازہ کر لیا تھا کہ اُس نے مجھے اچھی طرح شیشے میں اتار لیا ہے اور اب میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

صبح میں رکشے میں بیٹھ کر ملک عارف کے ٹھکانے پر آ گیا۔ اب میرا خوف اتر چکا تھا۔ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بس مجھے دولت چاہیے تھی۔ ملک عارف نے مجھے کہا کہ انہوں نے ایک اور پروگرام بنایا ہے۔ اس مرتبہ ذرا لمبا ہاتھ مارنے کا ارادہ ہے۔

"کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس مرتبہ خزانہ لوٹنا ہے۔ ایک آدمی پندرہ بیس لاکھ روپے لے کر بنک سے باہر نکلے گا۔ ہم نے اُس سے پیسے چھیننے ہیں۔" ملک عارف نے بتایا۔

"دن میں؟"

"ہاں۔" اُس نے کہا۔ "کیونکہ رات کو بنک بند ہو جاتے ہیں۔"

ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ اس بات کا انداز مجھے ہو چلا تھا کہ عارف اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ یہ لوگ اپنے گروہ میں تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔

اس مرتبہ ہمارا کام ذرا زیادہ ہی سخت تھا۔ اس میں میرے علاوہ طاہر اور دو اور لڑکے شامل تھے گویا ایک طرح سے ہم پانچ آدمی مل کر یہ کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل استعمال کرنی تھی۔ منصوبہ کچھ اسی طرح تھا کہ کار میں موجود تین لڑکوں میں سے دو پستول لے کر ہماری مدد کے لیے باہر کھڑے رہیں گے۔ ڈرائیور گاڑی سٹارٹ رکھے گا۔ موٹر سائیکل پر ملک عارف اور

میں بیٹھیں گے۔ مجھے آگے بڑھ کر رقم والا بیگ چھیننا تھا۔ مداخلت کی صورت میں پستول میرے پاس بھی موجود تھا اور ممکنہ مقابلے کی صورت میں دونوں مسلح لڑکے میرے مددگار ہوتے۔ تھیلا ہم نے کار میں پھینک دینا تھا۔ وہ لوگ الگ راستے سے فرار ہوتے اور میں ملک عارف کے ساتھ دوسرے راستے سے۔ ہم نے فرار ہو کر کہاں جانا تھا۔ اس کا علم طاہر یا ملک عارف کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔

ہم نے اسی اثنا میں خاصی مشق بھی کر لی تھی۔ واردات والے دن منصوبے کے مطابق ہم نے کام شروع کیا۔ خاصا پُر رونق علاقہ تھا۔ لیکن ان لوگوں نے منصوبہ تیار کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھا ہو گا۔ وہ شخص کیش لے کر بنک سے اپنی کار کی طرف چلا جو بنک کے دروازے کے سامنے ہی پارک کی گئی تھی جیسے ہی وہ بنک سے برآمد ہوا ملک عارف نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کام شروع کرنے کو کہا۔ میں نے منہ پر نقاب لگایا اور اُس کی طرف پستول تان کر اسے بیگ دینے کو کہا۔

آدمی کوئی اتنا بہادر نہیں تھا۔ لیکن مضبوط قوتِ ارادی کا مالک نظر آتا تھا اس نے اپنی گرفت بیگ پر مضبوط کر لی اور بنک کی طرف واپس بھاگنا چاہا اُس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ چوکیدار کی مدد حاصل کر سکے گا۔

"جیدے جانے نہ دینا۔" ملک عارف نے مجھے للکارا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے گولی داغ دی جو خوش قسمتی سے اس کی کمر میں لگی اور وہ گر پڑا۔ اس اثنا میں میرے ہمرائیوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں نے بیگ اٹھایا اور کار میں پھینک دیا۔ خود پھرتی سے ملک عارف کے پیچھے جا بیٹھا۔ اس دوران ملک عارف نے بھی دو فائر کر دیے تھے۔ لوگ خوفزدہ چوہوں کی طرح ادھر اُدھر چھپتے پھر رہے تھے۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ بنک کا چوکیدار بھی سہم کر اندر ہی بیٹھا رہا۔ حالانکہ اگر کوئی ہمت کرتا تو ہم شاید کامیاب نہ ہوتے۔

ملک عارف کے سفر کا اختتام بیگ صاحب کی کوٹھی پر ہوا۔ کار والے ساتھی وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ میں نے حیرانگی سے ملک عارف کی طرف دیکھا۔

"جیدے خاں" ہم اس آدمی کے بغیر زیرو ہیں۔ اس کو ہر کام میں حصّہ دینا پڑتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھوں دوسرے آدمی کو گولی لگی ہے اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھنا۔" اس نے مجھے باتوں باتوں میں سب کچھ سمجھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگ کے سامنے موجود تھے۔ اُس نے ہمیں فی کس ۲۵ ہزار روپیہ دیا اور ہم چپ چاپ وہاں سے چلے آئے۔ کسی نے معمولی سا احتجاج بھی نہیں کیا۔ بیگ میرے ساتھ اسی طرح پیش آ رہا تھا۔ جیسے مجھے پہلی مرتبہ ملا ہو۔ میں نے بھی اس بات پر توجہ نہ دی۔ میں ملک عارف کے ساتھ اُس کے گاؤں چلا آیا۔ لیکن اس بات پر کڑھتا رہا کہ ساری رقم وہ کمبخت خود ہضم کر گیا اور ہم جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ ہمیں اُس نے گھاس تک نہیں ڈالی۔ جب میں نے عالیہ کی طرف جانے کو کہا تو ملک عارف نے فی الوقت جانے سے منع کر دیا۔

"جیدے خاں ذرا دماغ کو بھی استعمال کرنا سیکھ لو۔ شہر میں اتنی بڑی واردات ہوئی ہے پولیس شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتی پھر رہی ہے۔ اس بازار پر پولیس کی خاص نظر ہوتی ہے۔ کیونکہ پولیس والے جانتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ ادھر کا ہی رُخ کریں گے۔ ہر ڈیرے پر پولیس کے مخبر موجود ہوتے ہیں اور تم..... یار تم کہیں ہم سب کو مروانا دینا۔" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب جیسا آپ بہتر سمجھیں۔" میں خاموش رہا۔

ملک عارف کے ہاں میں نے پانچ چھ روز خوب عیاشی کی پھر اپنے گاؤں چلا آیا۔ جہاں دس پندرہ دن تک میں نے کسی کو رقم کی کانوں کان ہوا نہ لگنے دی۔ اُس روز میرے ایف اے کے نتیجے کا اعلان ہوا تھا۔ میری اس مرتبہ بھی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔ بہرحال میری ماں خوش تھی کہ میں نے ایف اے

کر لیا۔ والد بضد تھے کہ میں سی ٹی وغیرہ کر لوں۔ لیکن میں نے "اعلیٰ تعلیم" کی ضد شروع کر دی۔

اگلے روز یہ منحوس خبر ملی کہ میرا بہنوئی فوت ہو گیا ہے۔ ہم سب لاہور چلے آئے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن میرے جیسے بے غیرت اور بے ضمیر انسان نے اسے محسوس نہ کیا۔ والدین سات آٹھ روز بعد واپس چلے گئے اور میں سیدھا عالیہ کے ڈیرے پر۔

جب میں نے اُس کے سامنے ۲۰ ہزار کی رقم رکھی تو اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں اُس کی نائکہ ماں نے میرا ماتھا اور سر درجنوں مرتبہ چُوما۔ رقم اپنے قبضہ میں کی اور بیٹی مجھے سونپ دی۔ یہاں چار پانچ روز میں موج میلہ کرتا رہا۔ اس دوران عالیہ نے مجھے سرور و لذت کے بہت سے جہانوں سے آشنائی بہم پہنچا دی تھی۔ جب جیب خالی ہونے لگی تو واپس چلا آیا۔

میں نے بی۔ اے میں بھی اسی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ملک عارف ایم اے کا طالب علم بن چکا تھا۔ ہمارا حوصلہ اب کچھ زیادہ ہی کھل گیا۔ ہم نے مل کر دو تین پٹرول پمپ لوٹے۔ عالیہ نے مجھے جو چسکا لگا دیا تھا۔ اُس کے لیے میں کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ اس دوران میں نے بیگ کے کہنے پر دو تین سیاسی جلسوں میں بھی "خدمات" انجام دیں۔ میں ملک عارف کو اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ کمبخت ہم سے حصہ کیوں لیتا ہے؟ ایک روز ہم نے الگ سے پروگرام بنا لیا۔ اس منصوبے میں ملک عارف اور اس کا ایک بدمعاش ساتھی ہمارے ساتھ شامل تھا۔ ہم نے اس مرتبہ ایک کوچ کو لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق ہم کوچ کے مسافروں میں شامل ہو گئے اور لاہور سے باہر نکلنے پر ایک ویران جگہ اُتر کر میں نے ڈرائیور کی کنپٹی سے پستول لگا دیا۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے رائفلیں تان کر مسافروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہم نے مسافروں کو وہیں اتار دیا اور کوچ میں فرار ہونے لگے۔ بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ پولیس

کی ایک گشتی جیپ اچانک ادھر آنکلی۔ مسافروں نے دھائی مچائی تو وہ لوگ ہمارے تعاقب مین آگئے۔ انہوں نے وائرلیس پر آگے بھی اطلاع کردی تھی۔

میں ابھی اتنا سورما نہیں بنا تھا کہ پولیس سے مقابلہ شروع کردیتا۔ نہ ہی میرے ساتھیوں میں کوئی اس قابل تھا۔ ہم نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ پولیس نے الگ الگ ہماری تفتیش شروع کی۔ میرے کبھی ہڑوں نے تھانہ نہیں دیکھا تھا۔ مَیں تو دو چار جوتے کھا کر ہی "چالو" ہوگیا۔

تھانے میں پہلے ہی روز جب صبح ہماری تصویریں اخبارات میں چھپیں تو ایک شخص ہماری ملاقات کو آگیا۔ وہ سیدھا مجھے آکر ملا اور کہا کہ مجھے عالیہ نے بھیجا ہے۔ میرا دل بلیّوں اُچھلنے لگا۔ عالیہ نے پیغام بھیجا تھا کہ میں بے فکر رہوں۔ وہ میری ہر طرح مدد کرے گی۔ اُس شخص نے مجھے کہا اگر مرد کے بچے ہو تو اپنی محبوبہ کو تھانے نہ بُلانا۔ میری سوئی غیرت عالیہ نے جگادی۔ حالانکہ یہ بھی اُن لوگوں کی چال تھی۔

اس دوران پولیس نے تاڑ لیا تھا کہ مَیں کمزور آدمی ہوں۔ انہوں نے مجھے سلطانی گواہ بننے کا لالچ دیا اور میں لالچ میں آگیا۔ مَیں نے بلا کم و کاست سارے واقعات بیان کردیے۔ بس عالیہ اور بیگ کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ بیگ کی طاقت کا مجھے اندازہ تھا۔

ہمیں جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ والدین کو علم ہوا تو گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ مجھے گرفتاری کے بعد احساس ہوا کہ مَیں نے کس جہنم کی آگ کا خود کو ایندھن بنا لیا تھا۔ مقدمہ چلا اور تین ماہ بعد ہی ایک خصوصی عدالت نے مجھے دس سال قید کا حکم سُنا دیا۔ میرے ساتھیوں کو بھی سزائیں دی گئیں۔

مجھے جیل میں دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس دوران سوائے بوڑھے والدین اور بیوہ بہن کے اور کوئی مجھے ملنے نہیں آیا۔ ایک خاص آدمی کے ذریعے

اُس نے عالیہ کو پیغام بھیجا تھا۔ جس نے مجھے پہچاننے سے انکار کردیا اور اُس کے ڈیرے والوں نے میرے قاصد کی اتنی بے عزتی کی کہ اب جیل کا کوئی ملازم میری کوئی بات ہی سننے کو تیار نہیں۔ زندگی کا یہ جہنم میں اب تیسرے درجے کے ایک قیدی کی حیثیت سے بھگت رہا ہوں۔